قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2023 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

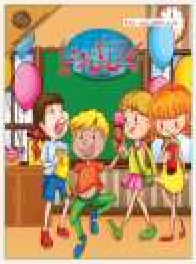
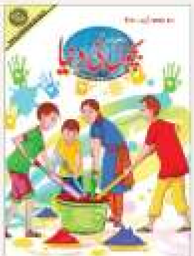

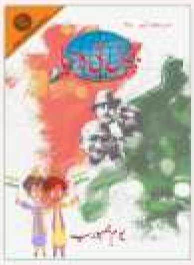

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:5، مئی 2023

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، حکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
اردو ناول میں ثقافتی نوحہ گری خالد اشرف 7
تقابلی مطالعہ: تعریف، آغاز و ارتقا اور طریقۂ کار محمد ثاقب 10

انشا: فنی اور فکری زاویے
انشاء اللہ خاں انشا کے غیر منقوط ادبی کارنامے محمد نہال افروز 13

کلام انشا میں ہندو تہذیب اور کردار تکمینہ حبیب 16

زبان اور زمینی صورت حال
یہ کیسے ممکن ہے کہ رسم الخط کے بغیر اردو زندہ رہ جائے گی حبیب کیفی 21

لعل و گہر
ناطق گلاؤٹھی: کلام غالب کے شارح ابراہیم افسر 24
اسلوب احمد انصاری بحیثیت ناقد نذرانہ شفیع 27

شفیق جونپوری کی شعری جہات محمد ارشد 31

زبان و تعلیم
مادری زبان اردو- کل آج اور کل سید امتیاز حسن 34

کتاب دریچہ
جن کتابوں نے متاثر کیا شہناز رحمٰن 36

خراج عقیدت
منظر اعجاز: توانا تخلیقی اور تنقیدی ذہن محمد حامد علی خان 39

سلسلۂ صحافت
اردو صحافت کی تین بھولی بسری خاتون اور قومی تحریک آزادی اسعد فیصل فاروقی 43
ہندوستان کا سو سالہ قدیم اردو اخبار روزنامہ 'رہنمائے دکن' عبدالرحمٰن پاشا 49

یاد شمیم
شمیم حنفی کی کالم نگاری اویس سنبھلی 52
شمیم حنفی کی غالب شناسی صالحہ عاصم 54

شمیم حنفی اور جدیدیت کی فلسفیانہ اساس طاہر حسین 57

خصوصی گفتگو
حافظ کرناٹکی سے انٹرویو ریشا قمر 60

فلم
ستیہ جیت رے اور ان کی فلمیں منتظر قائمی 62

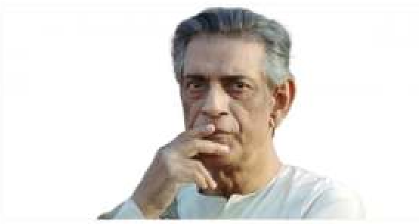

نیا آسماں نئے ستارے
قاضی عبدالستار شخصیت اور فن محمد فیصل خان 65

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ ادارہ 68

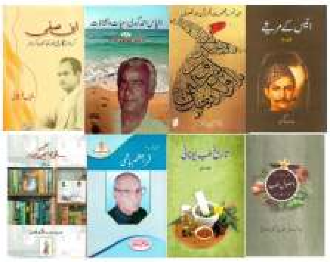

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں ادارہ 79

ہماری بات

اردو ایک زندہ تابندہ اور توانا زبان ہے۔ اس زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ یہ اور بات کہ اس زبان کے پرانے مراکز اور گہوارے میں پہلے جیسی صورت حال نہیں ہے لیکن نئی بستیوں میں اردو زبان اپنا جلوہ اور جادو بکھیرنے میں کامیاب ہے۔ اس زبان سے اگر اشرافیہ طبقے کا رشتہ ٹوٹا ہے تو دوسرے طبقات نے اردو زبان کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان میں اتنی داخلی قوت اور توانائی ہے کہ یہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور زندہ رہے گی، اس لیے اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے جس نوع کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے وہ بے معنی ہے۔ اردو زبان صرف ادبیات عالیہ کی وجہ سے نہیں بلکہ ترجمہ شدہ ادب کی وجہ سے بھی زندہ ہے۔ اگر اردو زبان میں فکری قوت نہ ہوتی تو شاید اردو زبان کے شہ پاروں کے تراجم دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں نہ ہوتے۔ اردو کی ہر صنف میں ایسے شاہکار ہیں جن کے ترجمے کے ذریعے اردو نے اپنی مقبولیت کا دائرہ وسیع کیا ہے، آج انگریزی، عربی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانوں میں نہ صرف اردو زبان کی تخلیقات کے ترجمے بکثرت شائع ہو رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی احساس ہو رہا ہے کہ اردو سے دوسری زبانوں کے تخلیق کاروں اور قارئین کی دلچسپی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اردو کے بہت سے ناولوں کے ترجمے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں۔ افسانوں اور شعری تخلیقات کے تراجم بھی بکثرت ہیں اور انگریزی داں حلقے میں پڑھے بھی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے جو تراجم ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ہو رہے ہیں اس سے بھی اردو زبان کی فکری اور لسانی ثروت مندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو کے بہت سے ایسے افسانوی اور شعری مجموعے ہیں جو اردو داں حلقے سے زیادہ دوسرے حلقوں میں پڑھے جارہے ہیں۔ خاص طور پر اردو کے ایسے کلاسیکی اور معاصر شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جو دوسری زبانوں کے قارئین میں بہت مقبول ہیں۔ یہ اس بات کا واضح اشاریہ ہے کہ اردو واقعی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے اندر بے پناہ قوت اور کشش رکھتی ہے۔ ادھر دوسری زبانوں کے مجلات میں بھی اردو تخلیقات کے حوالے سے جو مضامین اور تبصرے شائع ہو رہے ہیں وہ یقیناً ہمارے لیے باعث فخر ومسرت ہیں۔ اردو زبان کی اس مقبولیت میں اس کے مزاج کا بھی عمل دخل ہے کہ بنیادی طور پر یہ زبان کسی خاص مذہب یا تہذیب میں محصور نہیں ہے بلکہ اس زبان میں بہت سی تہذیبوں اور ثقافتوں کا خوبصورت امتزاج ہے، اسے کسی خاص مذہب یا تہذیب میں قید کرنا اس کے جمہوری اور امتزاجی کردار کی نفی قرار پائے گی۔ اس زبان نے نہ صرف دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنا حصہ بنایا ہے بلکہ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کے افکار کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔

اردو زبان کا مزاج منفرد اور مختلف ہے۔ اس زبان میں کسی طرح کی تہذیبی یا مذہبی ادعاعیت یا نرگسیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کے نہ صرف تراجم موجود ہیں بلکہ ان کی مثبت تشریحات بھی ہیں۔ یہ اردو زبان کا ایک وسیع تر امتزاجی کردار ہے جس کی وجہ سے اس زبان کو کسی خاص دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا اور خاص طور پر اس زبان کے وابستگان میں تمام طبقات کے افراد شامل ہیں جو اس زبان کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے روشناس کراتے ہیں۔ اس زبان میں جو غیر مسلموں کی خدمات ہیں وہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ انھیں اردو ادب کی تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتی اور نہ ہی انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ ان کی خدمات کو قدر وتحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ دلکش سرورق اور بلند پایہ مضامین کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ جناب غضنفر نے اپنے مضمون 'علامت اور چند علامتی کہانیاں' میں چار کہانیوں کے توسط سے علامت سازی کے متعدد خصائص کی بخوبی خط کشی کی ہے۔ زبان و املا کے اغلاط نہ کے برابر ہی ہیں۔ صفحہ 7 پر فارسی زبان کے اسم مونث لفظ 'پروا' کے صحیح ہونے کے باوصف غلط املا 'پرواہ' کا تصرف بے طرح کھٹکتا ہے۔ اسی مقالے کے تحت غیاث احمد گدی کی کہانی 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' میں گاڑی میں قید کیے گئے مختلف معصوم پرندوں، تتلی وغیرہ کو ذبح کرنے کرانے والے لوگوں کی بھی حد درجے کی بے حسی اور بے رحمی کی مخالفت کرنا قابل مدح ہے۔ اس مقالے کا اہم نکتہ ہمیں اپنے انسانی فرائض کو ہمیشہ انجام دینے کا مفید سبق فراہم کرنا ہی مقصود ہے۔ اسی طرح انور خاں کی کہانی 'کوؤں سے ڈھکا آسمان' میں بھی بھجنگ کوؤں سے ڈھکے ہوئے آسمان کے تلے بلا کی سردی میں آگ سینکنے والے مزدوروں کا اپنے تمام کپڑے اُتار کر اسے بجھنے سے بچانا ہمیں غور و خوض کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ اسی طرح شوکت حیات کی کہانی 'بانگ' میں اگر ابتدا میں مرغوں کی بانگ ان کی غلامی کی دردناک داستان کہتی ہے، تب آگے جا کر ظلم کی انتہا ہو جانے پر اسی بانگ کا پس منظر میں انقلابِ آزادی میں تبدیل ہو جانا ہمارے ملک کے داغدار 'کینوس' کی یاد دلا دیتا ہے۔

جناب شریف احمد نے اپنے مضمون بعنوان 'کلاسیکی متون کی فرہنگ: ضرورت واہمیت' میں فرہنگ نویسی کی طویل تاریخ، الفاظ کے متعدد معانی، ان کی تشریحات، پُرانے و نئے سماجی پس منظر کو جاندار طریقے سے نشان زد کیا ہے۔ صفحہ 13 پر 'لوازمات' لفظ کا تصرف غلط ہے، کیونکہ محمد مصطفیٰ خاں مداح نے اپنے 'اردو ہندی شبد کوش' میں یہ واضح طور پر درج کیا ہے، کہ ''لوازم' لفظ غلط ہے، لیکن اردو میں بولتے ہیں، بلکہ اس کا جمع لفظ 'لوازمات' بھی بنا لیتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔'' (اُتر پردیش ہندی سنستھان، لکھنؤ، ص 593)

جناب اسرار اللہ انصاری نے اپنے مضمون میں اردو شاعری میں 'ریل' کے رول کے ضمن میں اپنے محبوب اشخاص کے وصل و فرقت وغیرہ مختلف احساسات کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ صفحہ 21 پر درج 'شعر میں 'بچھی' فعل کی جگہ 'بُجھی' لفظ چاہیے تھا۔

جناب ابن کنول (اصل نام ناصر محمود کمال) کی شخصیت اور افسانوں پر مبنی تمام مضامین میں فسادات، وغیرہ واقعات سے متعلق ان کے متعدد تجربات، نیک فطرت، احساسات، سادہ گوئی، تنقیدی بصیرت، مضمون و خاکہ نگاری کی مفصل واقفیت درج کرائی گئی ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک: کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

مارچ 23 کا شمارہ ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ وانمباڑی کتاب میلے کی تفصیلی رپورٹ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ جان کر از حد خوشی کا احساس ہوا کہ اس میلے میں پینتالیس لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی عوام میں اردو پڑھنے اور لکھنے کا ذوق باقی ہے۔ اس لیے اردو داں طبقے کو موجودہ صورت حال پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ درخشاں تاجور نے بھی اردو کے روشن مستقبل پر اچھا مضمون لکھا ہے۔ اس شمارے میں یگانہ چنگیزی پر دو مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں نئی معلومات کا پہلو کمزور ہے۔ عبدالحق صاحب نے جون پور کی تین معاصر شخصیات کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔ مضمون جامع ہے اور سراپا نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ خستہ حال ادبستان پر شعیب نظام کی تحریر ہمیں اپنی توانا وراثت پر آنسو بہانے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ تقریباً یہی صورت حال سیوان میں احمد جمال پاشا کی روح افزا منزل کی ہے۔ ان کی نادر و نایاب کتابیں دیمک کی خوراک بنی ہوئی ہیں۔ ہمایوں اشرف نے کیف عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ میں نے مشاعروں میں انھیں متعدد بار دیکھا اور سنا ہے۔ دیگر تحریریں بھی پسند آئیں۔

ارشاد احمد: ڈاکٹر آمنہ منزل، اسلامیہ نگر، ضلع سیوان، بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' مارچ 2023 موصول ہوا۔ سب سے پہلے میں آپ کو وانمباڑی میں منعقدہ پچیسواں نو روزہ قومی اردو کتاب میلے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کا کہنا بالکل درست ہے کہ اب الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی نہ صرف اہمیت افادیت سامنے آئی ہے بلکہ اس ضرورت کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کیونکہ اب اسی ٹیکنالوجی پر ترقی کا دار و مدار ہے۔ اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہمارا دائرہ اب وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اردو زبان ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے۔ سیکولرازم اس زبان کے خمیر میں ہے۔ یہی بولتی زبان انسانی شعور کی علامت ہے۔

بشن چودھری: منڈی گوبند گڑھ، پنجاب

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورتِ حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل و صورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

اردو ناول میں ثقافتی نوحہ گری

ناول کو اس کی وسعت، وضاحت اور جزئیات کی بنا پر ام الاصناف کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے ڈی ایچ لارنس (1885-1930) نے کہا تھا کہ ''چونکہ میں ایک ناول نگار ہوں، اس لیے میں اپنے آپ کو کسی سنت، کسی فلسفی، کسی سائنس داں اور کسی بھی شاعر سے برتر سمجھتا ہوں، جو انسان کے مختلف حصوں کے ماہر ہیں، مگر پورے انسان تک نہیں پہنچتے۔ ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے زندہ انسان کے اندر لرزش پیدا کرسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی تخلیق ہے جو شاعری، فلسفے، سائنس یا کسی اور کتاب کے بس کی بات نہیں ہے۔''

ناول کی وسعت کی بنا پر عموماً اس کو نفسیات سے زیادہ سماجیات کا آئینہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ملکوں، خطوں، طبقوں اور قوموں کی زندگی کی آئینہ داری میں انسانی ذات کے گہرے داخلی، مسائل اس کی جنسی محرومی، اس کی تنہائی اور اس کے ارادوں کی شکستگی جیسے داخلی مسائل کہیں دنیاوی مسائل کے بالمقابل دب جاتے ہیں۔ تاہم ایسے کامیاب ناول کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو صرف افراد کے بجائے اقوام اور طبقات پر مرکوز رہے اور فرد کی داخلی اتھل پتھل اور جنسی تبدیلیوں کو نظر انداز کردے۔ یعنی ایک اچھے ناول کی اچھائی یہ ہے کہ علامت اور تجرید کے جنجال میں زیادہ ملوث ہوئے بغیر انسانی زندگی کے اطراف اور داخل دونوں پر بھرپور روشنی ڈالے۔

یہاں ہم نسبتاً قریب کے زمانے کی اردو ناول نگاری کے چند شاہکاروں کا جائزہ لے کر کچھ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان قریبی زمانوں کا سب سے بڑا نام قرۃ العین حیدر کا ہے جنھوں نے تقسیم کے زمانے میں فکشن لکھنا شروع کیا تھا اور تقریباً پچاس برس تک لکھتی رہیں۔ ان کے تھیم زیادہ متنوع نہیں تھے اور وہ زیادہ تر مشترکہ ثقافت کے زوال، ہجرت سے پیدا شدہ جذباتی مسائل اور تاریخ کی بے رحم قوتوں کے آگے انسانی ارادوں کی بیچارگی وغیرہ کو موضوع بناتی رہیں۔ یہاں ان کے آخری دور کے ایک نمائندہ ناول 'گردش رنگ چمن' (1987) کا اجمالی جائزہ لیا جائے گا۔ یہاں پرانی اور مٹ چکی جاگیردارانہ تہذیب اور نودولتیوں کی چمک دار اور باآواز بلند تہذیب کے فرق کو سامنے رکھ کر کہانی تشکیل دی گئی ہے۔ کہانی کیا ہے، ماضی کی بازیافت بلکہ ماضی پرستی کی رام کتھا ہے جس کو شعری و شیریں زبان کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف عندلیب بیگ، عنبریں بیگ، منصور کا شعری اور وکی میاں ہیں تو اسپیکٹرم کے دوسرے سرے پر صاحبزادی شہوار خانم، نگار خانم اور ان کے تاجر پیشہ بھائی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی ہمدردیاں مٹتے ہوئے مشترکہ کلچر کے نمائندوں کے ساتھ ہیں لیکن گھریلو ملازموں اور کھیت مزدوروں پر ڈھائے جانے والے ان کے مظالم کو وہ زیر بحث نہیں لاتی ہیں۔ یہاں تک کہ واجد علی شاہ جیسے نااہل حکمراں کا دفاع تک کرتی ہیں:

''آخری مغل بادشاہ اور اودھ کے فرمانروا اگر عیش پرست، ظالم اور لغو تھے، محمد شاہ محض رنگیلے اور واجد علی شاہ صرف ناچا گایا کرتے تھے تو سارے ہندوستان میں دولت اور تجارت کی یہ فراوانی کیسے رہی؟ سلطانِ عالم جب مٹیابرج لے جائے گئے تو اودھ کا بچہ بچہ اشکبار تھا۔ بھلا کوئی جابر اور نکمے بادشاہوں کے لیے روتا ہے؟''

(گردش رنگ چمن، دہلی 1987، ص 52)

کچھ انھی نوعیت کی ثقافتی ناول نگاری انتظار حسین کیا کرتے تھے، ان کا ناول 'بستی' (1980) کافی حد تک ایک سیاسی قصہ تھا، لیکن قدیم ہند اسلامی ثقافت کی عکاسی کے ضمن میں ان کا تیسرا ناول نما قصہ 'تذکرہ' (1986) قدیم جاگیرداری ثقافت کی نوحہ گری میں قرۃ العین حیدر کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ 'تذکرہ' کی کہانی اس قدر ہے کہ اخلاق (یا انتظار حسین) مع اپنی والدہ بوجان یوپی کے ایک قصبے سے ہجرت کرکے لاہور آبستا ہے۔ ایک دن پرانے کاغذات میں اخلاق کو ایک تذکرہ ملتا ہے جس میں آبا و اجداد کے حالات درج ہیں۔ چراغ حویلی کے یہ مکین اپنے رویوں میں قدیم جاگیرداری اقدار کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے تمام معمول معین اور سخت ہیں۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ جو معاشرتی اتھل پتھل ہوئی، اس میں یہ بزرگ اپنی جامد زندگی کے طے شدہ اصولوں کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، لیکن وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا:

''دنیا ناپائیدار ہے، یہاں کس چیز کو قرار ہے۔ ابھی تخت پر بیٹھے ہیں، ابھی تابوت میں لیٹے ہیں—— یہ ہیچ پوچ چراغ علی اپنی مثال لاتا ہے۔ ان دو آنکھوں نے اس عمر میں کیا کیا کچھ دیکھ لیا۔ تیموری بساط کو لپٹتے دیکھا، جہان آباد کو اجڑتے دیکھا۔ تایا حضور کو دار پر بلند ہوتے دیکھا اور اہلِ جہان آباد نے زیر آسمان کیا کیا دیکھا۔ جس بادشاہ کو تخت شاہی پر لباس شاہانہ میں رونق افروز دیکھا تھا، اسی کی ننگی لاش جمنا کی ریتی پر پڑی دیکھی۔ تایا حضور نے ایک روز یہ احوال بیان کیا اور اتنا روئے کہ ریش مبارک ان کی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ ایسا ان پر اثر ہوا کہ جینے سے جی سرد ہوا، رنگ چہرے کا زرد ہوا۔''

(تذکرہ، لاہور، 1987، ص 187)

تقریباً یہی کیفیت بوجان کی بھی تھی، وہ اخلاق کے ساتھ مجبوراً پاکستان آگئی تھیں، لیکن یہاں آکر وہ اس

بادشاہ کی طرح بے بس ہو جاتی ہیں، جس کی مملکت چھن گئی ہو کیونکہ چراغ حویلی والا تحکم اور دبدبہ لاہور میں ممکن نہ تھا۔ ان سبھی عزیزوں کا المیہ یہ تھا کہ وہ لاہور کے لیے کلچر کو اپنانے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے اور یوپی کے جاگیردارانہ کلچر کی نام نہاد برتری کے احساس کا شکار تھے۔

یہی ثقافتی احساس برتری خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' (1962) کے کچھ کرداروں کے اطوار میں نظر آتا ہے، لیکن خود مصنفہ اس قسم کی ذہنیت کے خلاف ہیں۔ بڑے چچا کا متوسط مسلم گھرانہ قدیم جاگیرداری نظام کے زوال کا آئینہ دار ہونے کی بنا پر داخلی و خارجی سطح پر شدید انتشار کا شکار ہے۔ اسی آنگن میں تہمینہ کو ان تخت گیر اور انسان دشمن قدروں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، جب نجابت اور اعلیٰ نسبی کے نام پر اس کو صفدر جیسے ذہین انسان سے شادی کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اسی جاگیرداری درجہ بندی کے شکار اسرار چچا ہیں جو ایک داشتہ کی اولاد ہونے کی بنا پر مردود ہیں۔ اسرار میاں زندگی بھر سارے کنبے کی خدمت کرتے رہے، لیکن اس کے صلے میں انھیں باسی روٹیاں اور جھوٹا سالن ملتا تھا۔ کچھ اسی نوعیت کی ظالمانہ صورت حال قاضی عبدالستار، کرشن چندر اور جیلانی بانو کے ناولوں میں بھی نظر آتی ہے، تاہم خدیجہ مستور، کرشن چندر اور جیلانی بانو کا پرانی تہذیبی اقدار کے بارے میں رویہ تنقیدی ہے، تحسین آمیز نہیں۔

لیکن جاگیرداری اقدار کی پیدا کردہ ثقافت کے تئیں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور قاضی عبدالستار والا تحسینی رویہ نسبتاً دو نئے ناول نگاروں: شمس الرحمٰن فاروقی اور سید محمد اشرف کے یہاں بھی نظر آتا ہے جنھوں نے اکیسویں صدی میں ناول تصنیف کیے، لیکن قدیم جاگیردارانہ کلچر کو فراموش نہ کر سکے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں بالخصوص 'گردش رنگ چمن' اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ضخیم ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں' (2006) میں ثقافتی بوجھ (Cultural Load) اس قدر زیادہ ہے کہ ناول کی روانی مجروح ہوتی ہے۔ دراصل ہر ناول کسی نہ کسی حد تک اطلاعات (Informations) پر مبنی ہوتا ہے، مثال کے طور پر چارلس ڈکنس کے ناولوں کو پڑھ کر ہم وکٹورین عہد کے انگلینڈ کی عوامی زندگی کے بارے میں نہایت باریک تفصیلات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح عزیز احمد کا ناول 'آگ' پڑھ کر تقسیم سے قبل کے کشمیر کے افلاس اور عوامی زندگی کی ذلتوں کی جیتی جاگتی تصویریں فراہم ہوتی ہیں، لیکن ناول، کسی بھی قسم کی اطلاعات کا بار ایک حد تک ہی برداشت کر سکتا ہے، ورنہ وہ معلومات کی خشک اور بھاری بھرکم کھتونی بن جاتا ہے۔ یہی گردش رنگ چمن کے ساتھ ہوا اور یہی انجام 'کئی چاند تھے سرآسماں' کا ہوا، لیکن چونکہ قدیم جاگیرداری کلچر کا ایک خوشنما پہلو اردو ثقافت بھی تھی، اس لیے ان دونوں ناولوں کی کمزوریوں کو عموماً زیر بحث نہیں لایا گیا۔ آیئے 'کئی چاند تھے سرآسماں' کے ثقافتی بوجھ کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ کی جائیں۔

ناول کے ابتدائی چہارم میں فاروقی صاحب قاری کو بتاتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے کالونیل ہندوستان میں قومِ انگریز کے لیے سب سے اعلیٰ نوکریاں تھیں:

''ریزیڈنٹی/ پولیٹیکل ایجنٹی، پھر افواجِ مسلح میں افسری، پھر محاصل جن میں مالگذاریاں، کروڑ گیری پرمٹ Custom اور Excise وغیرہ۔ ریزیڈنٹی اور پولیٹکل ایجنٹی میں عموماً دس میں سے نو عہدے بہت چنیدہ فوجی افسروں سے اور باقی غیر فوجی محاصلات کے محکموں سے پر کیے جاتے تھے۔ اپنے اپنے ضلعوں میں افسرِ محاصل و دیوانی وفوجداری یعنی کلکٹر/ ڈپٹی کمشنر کی شان سب سے اعلیٰ تھی۔ محنت کرنے اور ذمہ داری اٹھانے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنا اختیارات کا روزانہ استعمال، مشکل معاملات سے ہر وقت نپٹنا اور کمپنی کی شان اور دبدبہ قائم رکھنا۔''

(کئی چاند تھے سرآسماں، دہلی، 2006، ص 177)

فاروقی صاحب نے یقیناً یہ تمام تفصیلات ریسرچ کے ذریعے حاصل کی ہوں گی، جن کو قاری تک پہنچانا انھوں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ قاری اٹھارہویں صدی کے سیاسی وسماجی پس منظر سے واقف ہو سکے۔

1829 کے کرسمس کا ذکر کرتے ہوئے فاروقی صاحب 'ڈالی' کے تحفے کی اصل بیان کرتے ہیں کہ ڈالی کا تعلق پھولوں یا پھلوں سے نہ تھا بلکہ ڈالی ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں یا ٹوکریوں کو کہتے تھے جن میں پھل رکھ کر لائے جاتے تھے۔ عموماً دو کشتیوں یا ٹوکریوں کو ایک ساتھ باندھتے تھے اور ایک ڈالی میں ایک ہی طرح کا پھل ڈالتے تھے۔ انگریزوں کے یہاں تحفے میں پھل بھیجنے کا اتنا رواج تھا کہ آہستہ آہستہ 'ڈالی' کے معنی ہی 'پھلوں کا تحفہ' اور پھر 'تیوہاروں پر حکام کے یہاں بھیجنے کا تحفہ' ہو گئے۔''

(کئی چاند تھے سرآسماں، ص 196)

مزید معلومات کے ضمن میں فاروقی صاحب سواریوں کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بناوٹ کے لحاظ سے رتھ اور پالکی بہت مشابہ تھے، لیکن رتھ میں جگہ زیادہ ہوتی تھی اور وہ چار پہیوں کی سواری تھی جسے دو یا چار بیل کھینچتے تھے۔ اس کے برخلاف پالکی میں پہیے نہ تھے، پالکی کی طرح اسے بھی کہار اٹھاتے تھے جو عام طور پر آٹھ ہوتے تھے۔ پالکی کے ساتھ سونٹا سردار اور کبھی کبھی چوبدار بھی ہوتے۔ پالکی ایک رتھ کی طرح چھوٹا سا حجرہ ہوتی تھی اور اس کا دروازہ لکڑی کا ہوتا تھا۔'' (کئی چاند تھے سرآسماں، ص 234)

شمس الرحمٰن فاروقی اردو فارسی شعریات کے آخری بڑے اسکالر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور علم وقیع تھا۔ وہ بنیادی طور پر اردو-فارسی کلچر کے پروردہ اور نقیب تھے۔ 'کئی چاند تھے سرآسماں' جیسا ضخیم اور Intense ناول ان کی تمام زندگی کی فارسی-اردو اور انگریزی علمیت کا نچوڑ تھا اور بلاشبہ وہ اپنی تمام تر علمیت کو کاغذ پر منتقل کر کے مستقبل کے لیے محفوظ کر دینے کی گہری خواہش رکھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ معلومات کو محفوظ کرنے کا یہی جذبہ ناول میں بھی اکثر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا صہبائی کی عروض پر مہارت، میر شمس فقیر کی کتاب 'حدائق البلاغت' کا ترجمہ، فن معما پر ان کا ادق رسالہ 'گنجینۂ رموز' وغیرہ کا ذکر فاروقی صاحب نے مفصل کیا ہے۔

ایک مقام پر رفاعی سلسلے کے بارے میں فاروقی صاحب پھر معلومات کا دریا بہاتے ہیں:

''مولوی محمد نظیر رفاعی مجددی اصلاً دلی والے نہ تھے۔ وہ قوم کے شیخ فاروقی اور مولداً بڑودہ، گجرات کے تھے۔ ان کے والد شیخ دین محمد نے بڑودہ میں حضرت سید نورالدین سیف اللہ الرفاعی (وفات 1225ھ مطابق 1810) کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ایک مدت انھی کے آستانے پر مراقب ومعتکف رہے۔ رفاعی سلسلے کے بانی شیخ احمد الرفاعی (1106-1182) عربی النسل تھے، لیکن انھوں نے عمر کا بہت بڑا حصہ جنوبی عراق کے دلدلی علاقے کی ایک چھوٹی سی بستی بطائح میں گذارا۔ وہ خود قادری سلسلے میں بیعت تھے، لیکن ان کے ماموں شیخ منصور البطائحی نے انھیں سلسلۂ رفاعیہ یا بطائحیہ کا سجادہ اور شیخ مقرر کر دیا۔ ابن خلدون نے حضرت شیخ احمد الرفاعی کا مفصل ذکر کیا ہے۔ رفاعی سلسلے کی مقبولیت مالدیپ اور سراندیپ ہوتی ہوئی ملک دکن و ہند اور جزائر لکھن دیپ تک پہنچی۔ ابن بطوطہ نے مالدیپ کی رفاعی خانقاہوں اور اس سلسلے کے فقرا کا ذکر کیا ہے۔''

(کئی چاند تھے سرآسماں، ص 742)

یہ اور اسی قسم کی بہت سی تاریخی اور ثقافتی معلومات سے ناول بھرا پڑا ہے۔ فاروقی صاحب نے فکشن نگاری کا آغاز افسانوی مجموعہ 'سوار' (2001) سے کیا تھا اور انجام ضخیم ریسرچ ناول 'کئی چاند تھے سرآسماں' (2006) پر کیا اور اپنی زندگی کا تمام مطالعہ 'زوال زدہ مغلیہ عہد کی تاریخ

اور اردو- فارسی شاعری کے تغیرات کے انضمام سے کیا تھا لیکن یہاں فکشن کی روانی اور زبان کی توانائی مجروح ہوئی، کیونکہ فاروقی صاحب کی زبان تخلیقی کم، تنقیدی اور محققانہ زیادہ ثابت ہوئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ 'کئی چاند تھے سرآسماں' میں 'شب خون' کی مروجہ علامت نگاری اور تجرید یکسر غیر موجود ہے اور قصے کا سارا اسٹرکچر سادہ بیانیہ پر ٹکا ہوا ہے، جس کو وہ 'پریم چندی بیانیہ' کہہ کر مذمت کیا کرتے تھے، افسوس کہ 'کئی چاند تھے سرآسماں' میں وہی کمزوری حاوی رہی، جس کو فاروقی صاحب خود ناقابل تحسین قرار دے چکے تھے۔ الہ آباد کے ایک ادبی اجتماع میں خود انھوں نے شکایتاً کہا تھا کہ:

''آج اردو ناولوں کی دنیا سمٹ گئی ہے۔ اطلاعات پر زیادہ لکھا جارہا ہے، لیکن اس سے بڑا سچ نہیں بنتا۔''

(بحوالہ پروفیسر علی احمد فاطمی، دہلی، 2016، ص 50)

انتظار حسین، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار اور شمس الرحمٰن سبھی یوپی کے پرانے جاگیردارانہ اردو کلچر کے پروردہ تھے اور اسی لیے انھوں نے اہم کلچرل ناول تخلیق کیے۔ اسی کلچرل تخلیقیت کو اگلی نسل کے فکشن نگار سید محمد اشرف (پ: 1957) نے اپنے ناول 'آخری سواریاں' (2016) کے ذریعے آگے بڑھایا۔

کہانی کا راوی اپنی بیوی سے اپنے پردادا کا روزنامچہ اور بیوہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس روزنامچے میں عہد وسطیٰ کی جنگی فتوحات اور بالخصوص مغل خاندان کے عروج کا عقیدت مندانہ تذکرہ کیا گیا ہے اور اس عہد کی گنگا جمنی ثقافت کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''ہمارے ملک میں خوشبو کا شوق ہمیشہ سے ہے۔ ...... جائفل، دارچینی، لونگ، بڑی الائچی، چھوٹی الائچی، یہ سب اشیائے خوردنی اپنے دیگر خواص کے ساتھ ساتھ خوشبو کا وصف بیش از بیش رکھتی ہیں۔ لگانے کی خوشبو یعنی عطر مختلف علاقوں کے ہوتے ہیں، مشک کشمیر اور دیگر پہاڑی علاقوں کے ہرن کے نافے سے حاصل ہوتا ہے۔ عود عربوں کو بہت پسند ہے۔ عنبر مچھلی سے حاصل ہوتا ہے اور ساحلی علاقوں سے ہمارے پاس آتا ہے۔ خس کی جھاڑی ہوتی ہے۔ کیوڑے کی بال ہوتی ہے۔ یہ سہوان میں بہت ہوتا ہے۔ گلاب اصلاً ایران کا عطر ہے۔ عطر گل مٹی کے برتنوں کو ابال کر کشید کرتے ہیں۔ حنا لکھنؤ میں بہت اچھا بنتا ہے لیکن اس کے مصالحے ملک کے مختلف حصوں سے منگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح شمامہ بھی مختلف مصالحوں سے مل کر بنتا ہے۔''

(آخری سواریاں، دہلی، 2016، ص 157)

'آخری سواریاں' میں یوپی کے گاؤں کے بیرونی ہندو- مسلم کلچر کے انسانی مظاہر کے زیر سایہ ایک معصوم سی عشقیہ واردات بھی پہلو بہ پہلو چلتی ہے لیکن پرانی ثقافت کے جمالیاتی و انسانی پہلوؤں کے خاتمے اور اس معدوم ہوتی ہوئی ثقافت کے تحفظ کا جذبہ سید محمد اشرف کے یہاں بھی قرۃ العین حیدر اور شمس الرحمٰن فاروقی کے فن پاروں کی طرح ہی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزوں کے رحم و کرم پر روز و شب بسر کرنے والے بے کس بادشاہ ظفر کی ہزیمت و ذلت کی وجوہات کا تجزیہ کرنے کے بجائے سید محمد اشرف بادشاہ کے دسترخوان کا منظر بیان کرتے ہیں:

کہاریاں، کشمیر میں دوڑیں، نعمت خانہ کھڑا کیا، خاصے والیوں نے پہلے سات گز لمبا، تین گز چوڑا، چمکیلا چمڑا بچھایا، اس پر سفید دسترخوان، خاصے کے خانے چوکی پہ لگائے گئے کھانا چنا گیا۔

چپاتیاں، پھلکے، روغنی، برئی، بیسنی، خمیری نان، شیرمال، گاؤدیدہ، کلچہ، باقرخانی، بادام، پستے، چاول، گاجر اور مصری کی روٹی، نان پنبہ، نانِ گلزار، نانِ قماش، نانِ تنکی، نان خطائی۔ یخنی پلاؤ، موتی پلاؤ، نورمحلی پلاؤ، نرگس پلاؤ، سبزی پلاؤ، اناناس پلاؤ، نکتی پلاؤ، فالسی پلاؤ، آبی پلاؤ، زمردی پلاؤ، زعفرانی پلاؤ، مُزعفر، طاہری، زردہ، سوئیاں، من و سلوا، یاقوتی، فرنی، بادام کی کھیر، کدو اور کنگنی کی کھیر، نمش، شاخیں، کھجلے، قتلے، دودھ کا دُلمہ، بینگن کا دُلمہ، بادشاہ پسند کریلے، بادشاہ پسند دال، کباب سیخ، شامی کباب، گولی کباب، تیتر، بٹیر، لوزات خطائی، حلوے، مربے، بادام، پستے، خشخاش اور سونف کی نقل، موتی پاک، دُر بہشت۔''

(آخری سواریاں، دہلی، ص 193)

یہ اور اس قسم کی مزید کلچرل معلومات ہیں جنھوں نے کئی مقامات پر قصے کو بوجھل بنا دیا ہے اور واقعات کی روانی کو گزند پہنچائی ہے۔ اس قسم کی تفصیلات 'گزشتہ لکھنؤ' جیسی تاریخ کے لیے موزوں ہو سکتی ہیں، فکشن کے لیے نہیں۔

انیس اشفاق تنقید سے فکشن کی راہ پر آئے ہیں۔ ان کا کلچرل ناول 'خواب سراب' 2017 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں 'امراؤ جان ادا' (1899) کو بنیاد بنا کر پرانی لکھنوی ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کے معروف حاجی مراد علی عرف ٹنڈے کبابی، اپنے کبابوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ قصے میں محرم کی رسومات کا ذکر بھی بڑی وسعت کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن ہولی اور دیوالی یکسر ندارد ہیں۔

ایک مقام پر انیس اشفاق رقم طراز ہیں:

''میرے پاؤں اٹھتے رہے اور میں گومتی کے کنارے چلتا رہا۔ چلتے چلتے میں نے سوچا اسی طرف سے نجم النسا عرف امراؤ جان کے بابا کا بجرا دلکشا کی طرف جاتا ہوگا۔ جہاں میں تھا اسی کے آگے بیگم کوٹھی تھی، جس کے احاطے میں غدر سے کچھ پہلے شرف النسا نے ایک امام باڑہ اور مسجد بنوائی تھی۔ شرف النسا، نصیرالدین حیدر کی انگریز بلکہ ولایتی بیگم کی بڑی بہن تھیں۔ بیگم کوٹھی کے آگے دریا کے بالکل قریب سعادت علی خاں کی بنوائی ہوئی کوٹھی فرح بخش تھی۔ اسی نواح میں ان انگریز افسروں کی قیام گاہیں بھی تھیں جنھوں نے اودھ کی حکومت کو ٹھیک سے چلنے نہیں دیا تھا۔ ریزیڈنٹ نے جب ریڈنسی میں رہنا شروع کیا تو یہ تین منزلہ عمارت ریزیڈنسی کہلائی۔ یہاں طعام خانے، چوکیاں، توپ خانے اور ہسپتال، ڈاک خانہ، گرجا گھر، جیل خانہ اور مطبخ، جانور خانہ، باغات، فوارے اور بہت کچھ تھا۔ میں اس زمانے کے اس فرنگی شہر میں گھوم گھوم کر کھنڈر بن جانے والے حصوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، غدر میں کیسا گھمسان کا رن پڑا ہوگا یہاں!''

(خواب سراب، لکھنؤ، 2017، ص 202)

متذکرہ بالا پانچ ناولوں کی زمرہ بندی یہاں 'کلچرل ناول' کے طور پر کی گئی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہر اچھا ناول ایک گھنے جنگل کی طرح ہوتا ہے جس کی اندرونی ساخت کو سمجھنا، اس کے بنیادی تھیم تک پہنچنا اور کرداروں کی داخلی نفسیات کو پہچان پانا ایک دقت طلب اور تفصیل طلب مرحلہ ہے۔ ایک مختصر مقالے میں کسی اہم ناول کے ایک سے زیادہ پہلو کا احاطہ کرنا خاصا دشوار ہے۔ یہاں متذکرہ پانچ ناولوں میں پرانی جاگیردارانہ ثقافت کی نشاندہی کرنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان کے مصنفین پرانے کلچر کے تئیں ایک قسم کی ناسٹلجیا کے دباؤ میں تھے، جس کی بنا پر بار بار وہ معذرت آمیز لہجے میں سنہرے ماضی Glorious Past کا سہارا لیتے ہیں۔ گویا:

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

تاہم ان ناولوں کو صرف کلچرل ناول قرار دے کر مباحثے کو ختم کر دینا، ان مصنفین کے ساتھ ناانصافی ہوگی کیونکہ یہ سبھی اردو کی نئی تخلیقیت کے نمائندہ شاہکار بھی ہیں اور پرانی ثقافت کے علاوہ پرانی اور نئی زندگی کے سیکڑوں گوشوں کو منور بھی کرتے ہیں اور ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بےکراں کے لیے

■

Prof. Khalid Ashraf
4414/7, Darya Ganj, New Delhi- 110002
Mob.:8800489012

محمد ثاقب

تقابلی مطالعہ

تعریف، آغاز وارتقا اور طریقۂ کار

تقابل انسان کے وجود میں پنہاں ہے۔ انسان ہر شے کو تقابل کی نظر سے دیکھنے اور موازنہ کرنے کی جبلت رکھتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ آج ہم ترقی کی جس منزل پر کھڑے ہیں اس کے پیچھے تقابلی جبلت کا اہم رول ہے۔ اسی طرح ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی تقابلی نقطۂ نظر نے ہمیشہ سے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

ادب میں تقابلی مطالعے پر مبنی ابتدائی نقوش پہلی صدی قبل مسیح کے مشہور رومی شاعر ہوریس (Horace) کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ وہ اپنی تصانیف میں لاطینی زبان کے نو آموز شاعروں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ انھیں شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے قدیم یونانی شہ پاروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح کی تلقین پہلی صدی عیسوی کے رومی معلم کوئین ٹلین (Quintilian) نے بھی اپنی کتاب خطابت کی تعلیم (Institutio Oratoria) میں کی ہے۔ یہ کتاب بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ویسے تو یہ کتاب کوئین ٹلین نے لاطینی زبان میں بہترین خطیب پیدا کرنے کے لیے لکھی تھی، لیکن اس کتاب کی دسویں جلد تقابلی مطالعے کے تعلق سے بہت اہم ہے۔ اس جلد میں کوئین ٹلین یونانی اور لاطینی زبان کے مشہور ادیبوں کا موازنہ کرتے ہوئے اہل روم کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ وہ یونانی ادیبوں کے فکروفن اور ان کی تخلیقات سے غفلت نہ برتیں بلکہ اس سے مستفیض ہوتے رہیں۔ اسی طرح ہمارے اردو ادب کے معروف نقاد کلیم الدین احمد بھی ابتدا ہی سے اردو ادب کا انگریزی ادب سے تقابل کرتے رہے ہیں۔ غرضیکہ تقابلی مطالعے پر مبنی اس طرح کی بے شمار مثالیں دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں موجود ہیں۔ یہاں چند مثالوں کو پیش کرنے کا اصل مقصد ادب میں تقابلی مطالعے کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

تقابلی مطالعہ انگریزی زبان کے Comparative Study کا اردو ترجمہ ہے۔ لفظ تقابل کے لغوی معانی موازنہ، مقابلہ، آمنے سامنے کھڑے ہونے کے ہیں، جب کہ لفظ مطالعہ کے معانی کسی چیز کو واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھنا، کسی چیز سے آگاہ ہونا، کسی چیز پر غور کرنے کے ہیں۔ اس طرح تقابلی مطالعے کا مشترکہ لغوی معنی کسی دو شے کو آمنے سامنے رکھ کر واقفیت حاصل کرنا یا دیکھنا ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے تقابلی مطالعہ ایک طریقۂ کار ہے جس کا استعمال مختلف علوم مثلاً فنون لطیفہ، فلسفہ، تاریخ، مذہب، لسانیات، نفسیات، سیاسیات، سماجیات وغیرہ میں دو پہلوؤں کے غائر مطالعے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ادب میں تقابلی مطالعے کو تقابلی ادب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

تقابلی مطالعہ مختلف زبان و ادب اور ان کے قلم کاروں کو جاننے اور ان کے تعین قدر و مقام کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ عام مطالعے میں جہاں ایک ہی زبان و ادب سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہیں تقابلی مطالعے میں ایک یا ایک سے زائد زبان و ادب سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔ تقابلی مطالعے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے ذریعے مختلف ممالک کی ادبیات کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ تقابلی ادب کی تعریف ماہرین نے اپنے اپنے طور پر بیان کی ہے۔ رینے ویلک (Rene Wellek) کے مطابق:

''تقابلی ادب، ادب کی تمام صورتوں کا مطالعہ بین الاقوامی تناظر میں پیش کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ ادبی تخلیق اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت قومی، سیاسی، جغرافیائی حدود سے آزاد ہے۔''[1]

ہنری ایچ۔ ایچ ریماک (Henry Hemann Herman Remak) کے مطابق:

''تقابلی ادب دو ملکوں کے درمیان تخلیق کیے گئے ادبیات کا تقابلی مطالعہ ہے، یہ مطالعہ آرٹ، تاریخ، مذہب، سماجیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علم کے مختلف شعبوں کے آپسی تعلقات کا بھی مطالعہ ہے۔''[2]

پروفیسر محمد حسن تقابلی ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''... تقابلی ادب سے وہ ادب مراد ہے جو مختلف ادبی اور فکری اور تہذیبی اثرات کو قبول کرتا ہو اور جس کے ذریعے مختلف ادبیات کے درمیان لین دین، تطابق اور تخالف، تحریکات و تمثال، افکار و اقدار کے تبادلے کا سلسلہ قائم ہو۔''[3]

درج بالا تعریفوں سے تقابلی ادب کی نوعیت و ماہیت اور حدود اربعہ کا پتہ چلتا ہے۔ ایک طرف اس کا رشتہ مختلف زبانوں، ان کے ادیبوں اور ان کے ادبی شہ پاروں کے باہم تقابل سے ہے تو دوسری طرف اس کا سلسلہ دو مختلف ادبیات کی روایات، ان کے مآخذ اور ان کے تہذیبی سیاق و سباق سے جا ملتا ہے۔ تیسری طرف یہ ایک ملک میں دوسرے ملک کے تصور اور ایک ادبیات میں دوسری ادبیات کے اثرات سے بھی بحث کرتا ہے۔ اس طرح تقابلی ادب مختلف ادوار، تحریکات و رجحانات کا مطالعہ کرتے ہوئے عالمی ادب تک جا پہنچتا ہے۔

انگریزی ادب میں تقابلی مطالعے کے آغاز کا سہرا مشہور ناقد فرانسس میرس (Francis Meres) کو جاتا ہے۔ انھوں نے 1598 میں :Palladis Tamia Wits Treasury نام کی ایک تنقیدی کتاب تحریر کی، جس میں ایک باب A Comparative Discourse Of Our English Poets, With The Greeke, Latine, And Italian Poets کے نام سے لکھا۔ اس باب میں فرانسس میرس نے یورپ کی ان چار زبانوں کے مشہور شاعروں کا تقابلی نقطۂ نظر سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ فرانسس میرس کی اس تصنیف کے بعد ولیم شیکسپیئر (William Shakespeare) نے 1609 میں اپنی مشہور نظم Shall I Compare Thee To A Summer's Day میں اپنے محبوب کا مقابلہ موسم بہار کے مختلف ایام سے کیا ہے۔ ان دونوں ادیبوں کی تقابلی مطالعے پر مبنی یہ کوششیں آگے چل کر انگریزی ادب میں تقابلی مطالعے کے باقاعدہ آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

مغربی ادب میں تقابلی مطالعہ اس وقت تیزی سے فروغ پانا شروع ہوا، جب انیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں جرمن زبان کا مشہور ادیب گوئٹے (Johann Wolfgang Von Goethe) نے یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھی گئی ادبیات کے لیے عالمی ادب (World Literature) کی اصطلاح کو پیش کیا۔ اس کا ماننا تھا کہ یورپ کی تمام زبانوں میں لکھا گیا ادب ایک اکائی ہے جس کو عالمی ادب کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیے۔ رفتہ رفتہ گوئٹے کے اس نظریے نے دنیا کی مختلف زبانوں میں تخلیق کیے گئے ادبی شاہکاروں تک رسائی حاصل کر لی اور ان کو ترجمے کے ذریعے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ پروفیسر محمد حسن عالمی ادب کی اصطلاح کے متعلق لکھتے ہیں:

''یورپ میں صنعتی انقلاب نے دنیا کی طنابیں کھینچ دیں اور سائنس پر نیا اعتماد پیدا کیا، یورپی دنیا کے ممالک ایک برادری میں منسلک ہوگئے۔ مختلف زبانوں کی ادبیات سے واقفیت عام ہونے لگی اور عالمی تصور ابھرنے لگا۔ اسی بیداری کا ایک نتیجہ عالمی ادب کا تصور بھی تھا جو مبہم ہونے کے باوجود زیادہ جامع اور وسیع اصطلاح کے طور پر سامنے آیا۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے پہلی بار عالمی ادب کی اصطلاح کو برتا جس سے مراد وہ ادب تھا جو عالمی معیاروں پر پورا اترتا ہو اور جو عالم گیر آگہی اور تہذیبی وحدت کا اظہار کرتا ہو۔''[4]

عالمی ادب کی اصطلاح نے دنیا کی تمام ادبیات کو قریب تر کردیا۔ ترجمے کے ذریعے مختلف زبانوں کی ادبیات سے واقفیت عام ہونے لگی، جس سے تقابلی مطالعے کے لیے نئی راہیں ہموار ہوئیں۔

انیسویں صدی کے وسط تک انگریزی ادب میں تقابلی مطالعے کو Comparative Study کے نام ہی سے جانا جاتا تھا۔ 1848 میں انگریزی کے مشہور ادیب میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے اپنے ایک خط میں تقابلی مطالعے پر مبنی تمام کتابوں کے لیے تقابلی ادب (Comparative Literature) کا استعمال کیا۔ تقابلی مطالعے کے ماہرین کو میتھیو آرنلڈ کا دیا ہوا یہ نیا نام بہت پسند آیا۔ آرنلڈ کے دیے گئے اس نام کو بطور اصطلاح سب سے پہلے ایچ۔ ایم پاسنٹ (H.M.Posnett) نے اپنی کتاب Comparative Literature (1886) لکھ کر مستحکم کیا۔ پاسنٹ کی اس تصنیف کے بعد دنیائے ادب میں تقابلی مطالعے کو تقابلی ادب کے نام سے شہرت ملی۔

عالمی ادب کی اصطلاح کے بعد مغربی ادب میں تقابلی مطالعے کا باقاعدہ سلسلہ چل پڑا۔ تقابلی ادب کے اصول اور طریقۂ کار پر مختلف مقالے شائع ہونے لگے۔ 1910 میں امریکہ کی سنسناٹی یونیورسٹی میں تقابلی ادب کا الگ شعبہ قائم کیا گیا اور اس کا صدر پروفیسر ایف۔ ڈبلیو شانڈلر (F.W.Chandler) کو مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک جامع اور بصیرت افروز مقالہ پیش کیا جو آگے چل کر ادب میں تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ شانڈلر اپنے اس مقالے کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں ''ادب میں تقابلی عمل اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان کی قوت متخیلہ ہے۔'' انھوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں یونانی و لاطینی ادب سے تقابلی مطالعے کے ابتدائی نمونوں کو پیش کیا ہے۔

تقابلی ادب کا فروغ یورپ میں خاص طور پر فرانس و جرمنی میں اور یورپ کے باہر امریکہ میں ہوا۔ وہاں کی یونیورسٹیوں میں اس مضمون کے الگ شعبے قائم کیے گئے اور باقاعدہ درس و تدریس اور تحقیق کے فرائض انجام دیے جانے لگے۔ 1954 میں انگلینڈ کے شہر آکسفورڈ میں ایک بین الاقوامی تنظیم International Comparative Literature Association کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ تنظیم تقابلی ادب کے اہتمام و فروغ کے لیے آج بھی مسلسل کوشاں ہے اور یہ ہر تین سال میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرتی ہے۔ جس میں دنیا بھر کی تمام نئی تقابلی مطالعے پر مبنی کتابوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جو کتاب بہترین ہوتی ہے اس کے قلم کار کو پروفیسر انا بالاکیان (Anna Balakian) کی یاد میں انا بالاکیان پرائز سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

تقابلی ادب کی تاریخ میں فرانس و جرمنی اور امریکہ دو دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں دبستانوں کے نظریات الگ الگ ہیں۔ ایک طرف جہاں فرانسیسی اسکول تقابلی مطالعے میں ادبیات کی ظاہری خصوصیات مثلاً ایک ادب پر دوسرے ادب کے اثرات، لین دین، مماثلت و تضاد جیسے موضوعات پر زور دیتا ہے تو وہیں دوسری طرف امریکی اسکول مختلف ادبیات کے اندرونی ڈھانچے مثلاً تکنیک، ہیئت و اسلوب، زبان و بیان وغیرہ کو تقابلی مطالعے کا موضوع بناتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن ان دونوں دبستانوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''فرانس اور جرمنی میں تقابلی ادب نے وسیع تر سماجی سیاق و سباق کو اہمیت دی۔ فرینک فرٹ اسکول نے بطور خاص ان عمرانی عناصر پر زور دیا جو مختلف ادبیات میں مماثلتیں اور اختلافات پیدا کرتے ہیں، جب کہ امریکہ کے تقابلی ادب نے مختلف ادبیات کے اندرونی ڈھانچے اور اس کی جمالیاتی اور اسلوبیاتی خصوصیات کے تقابل کو پیش نظر رکھا۔ یہ دونوں نقطۂ نظر ان دبستانوں کے علمبرداروں کے بیانات سے ظاہر ہوتے ہیں۔''[5]

پال وین ٹگھیم (Paul Van Tieghem)، جین ماری کار (Jean Marie Carre) اور ماریوس فرانکوئس گویَارد (Marius Francois Guyard) وغیرہ کا شمار فرانسیسی اسکول کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے فرانسیسی دبستان کے لیے ادب میں ربط کی نوعیت، کسی ادب کی مقبولیت، کامیابی، اثرات، اس کے ماخذ اور ایک ملک کے ادب کی دوسرے ممالک میں امیج جیسے موضوعات کو تقابلی ادب کا موضوع بنایا۔ وہیں امریکی اسکول کے علمبرداروں میں رینے ویلک (Rene Wellek)، ہنری لیوین (Henry Levin)، ڈیوڈ میلون (David Mellon) وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔ جنھوں نے تقابلی ادب میں ادب کی فنی خصوصیات مثلاً تکنیک، اسالیب، اصناف، تحریکات، ادبی روایات، تصورات اور جمالیات وغیرہ موضوعات کو اہمیت دی۔ اس طرح ان دونوں دبستانوں کی بدولت تقابلی ادب کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔

تقابلی مطالعے کی تعریف اور آغاز و ارتقا پر نظر ڈالنے کے بعد یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ اس کے طریقۂ کار پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ ظاہر ہے ہر تنقیدی دبستان کے اپنے اصول اور طریقۂ کار ہوتے ہیں، جن کے مطابق ادبیات کو جانچا پرکھا جاتا ہے، لیکن تقابلی ادب کے اصول اور

ضابطے کیا ہیں؟۔ اس سلسلے میں ماہرین تقابلی ادب نے الگ الگ خیالات پیش کیے ہیں۔ بعض ماہرین کے نزدیک تقابلی ادب کا اپنا کوئی ایجاد کردہ طریقۂ کار نہیں ہے۔ رینے ویلک کہتا ہے کہ ''حتمی طور پر نہ تو تقابلی ادب کے دائرہ کار کی نشان دہی کی جا سکی ہے اور نہ ہی اس کا الگ سے کوئی طریقۂ کار ایجاد کیا جا سکا ہے۔ دراصل تقابلی ادب، ادب ہی کا ایک اہم حصہ ہے۔ جس کا اصل مقصد بہترین ادبیات کی تلاش ہے''۔ فرانکوئس جوسٹ (Francois Jost) کہتا ہے کہ ''دنیا کے تمام کتب خانوں میں تقابلی ادب کے طریقۂ کار پر کوئی کتاب یا مضمون موجود نہیں ہے کہ جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ تقابلی ادب کا طریقۂ کار عام مطالعے سے الگ ہے''۔ الفریڈ اوین آلڈریج (Alfred Owen Aldridge) لکھتا ہے:

''طریقۂ کار کے لحاظ سے ایک عام مطالعے اور تقابلی مطالعے میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ تقابلی مطالعے کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں دو یا دو سے زائد ادبیات کا ایک ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے۔''6

الفریڈ اوین آلڈریج کی اس بات سے تقابلی مطالعے کے بیشتر ماہرین متفق ہیں۔ ان کے قریب تقابلی مطالعے میں اصل طریقۂ کار تقابل ہی ہے اور وہ اپنے اس خیال کی تائید میں ٹی۔ ایس ایلیٹ (Thomas Stearns Eliot) کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ ''موازنہ اور تجزیہ ہی ایک نقاد کے اہم آلات ہیں''۔ راقم الحروف کے نزدیک بھی تقابلی مطالعے میں تقابل کرنا ہی اصل طریقۂ کار ہے۔ اس کے علاوہ تقابلی مطالعے میں کسی اور طریقۂ کار کی گنجائش نہیں ہے۔

تقابلی مطالعے کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقابلی مطالعے کے لیے موضوع کا انتخاب کن جہتوں اور سطحوں پر کیا جائے۔ اس سوال کا جواب بھی ماہرین تقابلی ادب نے دبستان فرانس و جرمنی اور دبستان امریکہ کے نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد دیا ہے۔ جان فلیچر (John Fletcher) جس کا شمار تقابلی ادب کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقالے The Criticism Of Comparison میں تقابلی مطالعے کے لیے موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں پانچ اصول قائم کرتا ہے جو درج ذیل ہیں:

(i) مختلف ادبیات میں مماثلت اور اختلاف کی سطح پر تقابلی مطالعہ
(ii) ایک ہی عہد کے مختلف تخلیق کاروں پر ایک دوسرے کے اثرات کا تقابلی مطالعہ
(iii) ایک ہی تخلیق کے مختلف تراجم کا تقابلی مطالعہ
(iv) ادب پر دوسرے علوم کے اثرات کا تقابلی مطالعہ
(v) تحریکات و رجحانات کا تقابلی مطالعہ،7

جان فلیچر کے مطابق درج بالا اصولوں کے پیش نظر ہی جس موضوع کا انتخاب ہوگا اسی کا بہتر ڈھنگ سے تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جان فلیچر کے قائم کردہ اصولوں کے طرز پر ہندی کے مشہور اسکالر ڈاکٹر اندر ناتھ چودھری نے بھی اپنی کتاب تلناتمک ساہتیہ: بھارتیہ پری پیکش میں تقابلی مطالعے کے سات اصول بیان کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(i) موضوعات کی سطح پر تقابلی مطالعہ
(ii) تکنیک کی سطح پر تقابلی مطالعہ
(iii) تحریکات و رجحانات کی سطح پر تقابلی مطالعہ
(iv) زبان کی سطح پر تقابلی مطالعہ
(v) ایک ہی تخلیق کے مختلف تراجم کا تقابلی مطالعہ
(vi) ایک ملک کی ادبیات کا تقابلی مطالعہ
(vii) مخصوص قلم کاروں کا تقابلی مطالعہ،8

اسی طرح اردو کے قلم کار ڈاکٹر نہال افروز نے بھی اپنے ایک مضمون تقابلی مطالعہ: معنی، مفہوم اور سطوح میں تقابلی مطالعے کے سات اصول بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''.... کسی بھی فن پارے میں سیاسی، سماجی، مذہبی، نفسیاتی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشی عناصر ضرور پائے جاتے ہیں اور فن پارے کو تخلیق کرنے کے لیے زبان و بیان، ہئیت و اسلوب، زماں و مکاں وغیرہ کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی فن پارے کا تقابلی مطالعہ کرنے کے لیے انہی مختلف سطوح پر مطالعہ کرنا ہوگا:

(i) سوانحی سطح
(ii) سماجی و سیاسی سطح
(iii) تہذیبی و ثقافتی سطح
(iv) جنسی و نفسیاتی سطح
(v) تکنیک کی سطح
(vi) زبان و بیان کی سطح
(vii) تحریکات و رجحانات کی سطح''9

درج بالا ماہرین کے قائم کردہ اصولوں سے تقابلی مطالعے کے موضوعات کے دائرہ کار کا کافی حد تک احاطہ ہو جاتا ہے۔ مکمل طور پر تقابلی مطالعے کے موضوعات کے دائرہ کار کا تعین ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ دراصل تقابلی مطالعہ وہ طریقۂ کار ہے جس کو کسی بھی دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں اتنی وسعت ہے کہ یہ ہر تخلیق کو کسی نہ کسی زاویے سے اپنی گرفت میں لے ہی لیتا ہے۔ ان ماہرین کے بیان کردہ اصولوں کے علاوہ زبان و ادب کے وسیع تر میدان میں اب بھی کئی ایسے گوشے پوشیدہ ہیں جن کو تقابلی مطالعے کے موضوعات کے دائرہ کار میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسلوبیات کی سطح پر تقابلی مطالعہ، نفسیات کی سطح پر تقابلی مطالعہ، شخصیت اور فن کی سطح پر تقابلی مطالعہ، فن پارے میں پیش کردہ ماحولیات اور جغرافیائی نقوش کا تقابلی مطالعہ وغیرہ۔ ان اصولوں کے تحت بھی دو یا دو سے زائد تخلیقات کا باہم تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

تقابلی مطالعے کے لیے موضوع کا انتخاب کرتے ہوئے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جائے کہ جن دو زبان و ادب یا ایک ہی زبان کی دو تخلیقات کو تقابلی مطالعے کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے ان میں ایک یا ایک سے زائد خصوصیات مماثل ہوں، مثلاً زبان ایک ہو، صنف ایک ہو، موضوع ایک ہو، عہد ایک ہو، تکنیک ایک ہو، دونوں تخلیقات کسی تحریک یا رجحان کے زیر اثر لکھی گئی ہوں وغیرہ۔ ان اصولوں کے پیش نظر ہی جس موضوع کا انتخاب ہوگا اسی کا بہتر طور پر تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حواشی

1 پروفیسر عبدالستار دلوی، ادبی و لسانی تحقیق اور تقابلی ادب (اصول و طریق کار)، انجمن اسلام اردو، ممبئی، 2016، ص 115
2 ہنری ایچ۔ ایچ ریماک، مضمون Comparative Literature, Its Definition and Function مشمولہ کتاب Comparative Literature: Method and Perspective، مرتب نیوٹن پی اسٹال نخت اور ہورسٹ فرینز، Southern Illinois University Press, Carbondale, USA، 1961، ص 3
3 پروفیسر محمد حسن، مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، 2016، ص 359
4 ایضاً، ص 359
5 ایضاً، ص 360
6 اندر ناتھ چودھری، تلناتمک ساہتیہ: بھارتیہ پری پیکش، وانی پرکاشن، دہلی، 2018، ص 52
7 ایضاً، ص 41، 42
8 ایضاً، ص 41
9 ڈاکٹر نہال افروز، تقابلی مطالعہ: معنی، مفہوم اور سطوح، رسالہ نیا دور، لکھنؤ، جون 2019، ص 20

■

Mohammad Saqib
Research Scholar, Dept. of Urdu
Manuu, Gachibowli,
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.: 9628527791
Email id. mohdsaqib7262@gmail.com

محمد نہال افروز

انشاء اللہ خاں انشا

کے غیر منقوط ادبی کارنامے

انشانے نظم اور نثر دونوں اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور بیشتر اصناف میں اپنی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ شاعری میں غزل، قصیدہ، مثنوی، ریختی، رباعی جیسی اصناف میں ان کی شاہکار تخلیقات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ نثر کی مختلف اصناف مثلاً داستان، قواعد، روزنامچہ، لطائف وغیرہ میں بھی ان کی قابل قدر تصانیف موجود ہیں۔ ان تصانیف میں سے ان کی کئی کتابوں کو کسی نہ کسی لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اردو ادب میں انشاء اللہ خاں انشا (1752-1817) کا شمار ایک تجرباتی تخلیق کار کے طور پر ہوتا ہے۔ انھوں نے جتنے بھی ادبی کارنامے انجام دیے ہیں ان میں سے بیشتر اصناف میں ایک نیا تجربہ کیا ہے بلکہ وہ کئی ایک تجربے کے موجد اور خاتم بھی ہیں۔ انشا نے نظم اور نثر دونوں اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور بیشتر اصناف میں اپنی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ شاعری میں غزل، قصیدہ، مثنوی، ریختی، رباعی جیسی اصناف میں ان کی شاہکار تخلیقات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ نثر کی مختلف اصناف مثلاً داستان، قواعد، روزنامچہ، لطائف وغیرہ میں بھی ان کی قابل قدر تصانیف موجود ہیں۔ ان تصانیف میں سے ان کی کئی کتابوں کو کسی نہ کسی لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انشا نے قتیل کے اشتراک سے فارسی زبان میں اردو کی قواعد 'دریائے لطافت' کے عنوان سے لکھی، جسے اردو لسانیات اور قواعد کی پہلی اور بنیادی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح انشا نے داستان 'رانی کیتکی کی کہانی' لکھی۔ اس داستان کو لکھنے کے لیے انشا نے خالص ہندوستانی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور عربی، فارسی، ترکی کے الفاظ کے استعمال سے مکمل طور پر احتراز کیا ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک نیا اور انوکھا تجربہ ہے۔ اس طرح کا تجربہ اردو میں پہلی بار دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انشا نے ایک بے نقط داستان بھی لکھی ہے، جس کا عنوان 'سلک گوہر' ہے۔ اردو میں اس داستان سے نہ تو پہلے اور نہ ہی اس کے بعد، غیر منقوط داستان لکھنے کا رواج ملتا ہے۔ اس طرح غیر منقوط داستان لکھنے میں بھی انشا کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

مولوی عبدالحق کے مطابق اردو کے حروف تہجی میں جملہ 53 حروف ہیں، جن میں سے 18 حروف غیر منقوط ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشا نے ٹ، ڈ، ڑ کو بھی منقوطہ حروف میں شمار کیا ہے، کیوں کہ ان کے زمانے میں ان حروف کو 'ط' کے بجائے چار نقطوں سے لکھا جاتا تھا۔ اس طرح اردو کے حروف تہجی میں جملہ اٹھارہ حروف ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ اردو کے حروف تہجی کا ایک بڑا حصہ خارج کر کے کسی بھی تخلیق کو وجود میں لانا انتہائی مشکل کام ہے، لیکن انشا نے یہ کمال کر دکھایا ہے۔ انہوں نے غیر منقوط غزلیں کہیں، قصیدہ لکھا، مثنوی لکھی، رباعیاں اور مخمس کہے۔ یہاں تک کہ ایک غیر منقوط داستان بھی تخلیق کی ہے۔ ذیل میں ان تمام غیر منقوط ادبی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دیوان بے نقط :

انشا کے کلیات میں دیوان اردو، دیوان فارسی اور دیوان ریختی کے علاوہ ایک دیوان 'دیوانِ بے نقط' بھی ہے۔ اس دیوان میں پچیس غزلیں (جس میں ایک نعتیہ غزل بھی ہے)، تین رباعیات اور سات مخمس شامل ہیں۔

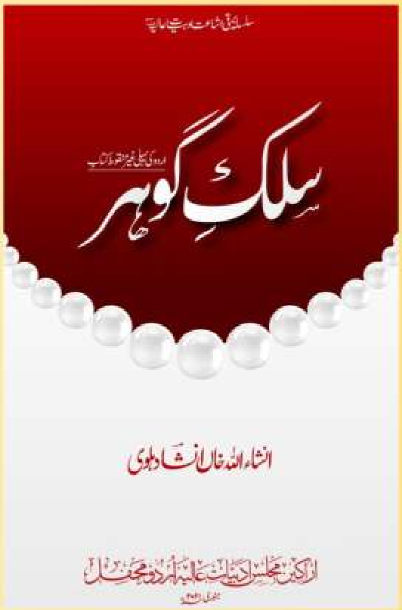

اس میں انشا نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جو بے نقط ہوں۔ اس کو صنعت غیر منقوط کہتے ہیں۔ جب یہ پابندی شاعر خود پر لگالے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ محدود لفظوں کی مدد سے ایسے شعر کہے جس میں جذبے، احساس یا فکر کا اظہار ہو سکے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ انشا کا کلام ویسے بھی جذبہ و احساس سے عاری ہے اور غیر منقوطہ کلام میں یہ عیب اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ انشا نے اس صنعت کو نعت، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ میں استعمال کر کے اپنی قادر الکلامی کا اظہار تو یقیناً کیا ہے، لیکن اس میں وہ مزہ نہیں ہے، جو انشا کی روایتی غزلوں میں ملتا ہے۔ یہ ایک بے مزہ اور بے ذائقہ کلام ہے۔ مثال کے طور پر انشا کی ایک بے نقط غزل ملاحظہ ہو۔

اور کس کا آسرا ہو سر گر وہ اس راہ کا
آسرا اللہ اور آل رسولؐ اللہ کا
اہل عالم کا سہارا آسرا کس کام رکھ
ہر سحر گہ آسرا و اللہ اوس درگاہ کا
لو دکھاؤ لمعۂ اسرار کوہ طور حمد
گرد کر دو معرکہ سو لاکھ مہر و ماہ کا
ہو الٰہا ہر طرح کا ہم کو آرام و سرور
دور کر دو سو ہلا آلام اور اکراہ کا
اللہ اللہ کس طرح ہو ورک اوہام و حواس
کوہ کا عالم اودھر کو طور اِدھر سو کاہ کا
دم کو ہوگا مدرکہ ساہمرہِ اہل عدم
آہ اگر معلوم ہو معدوم سر ہو واہ کا
واہ ہر دم کا وہ طور وعدۂ امداد اور
روکھا عالم اور وہ سوکھا دلاسا آہ کا
ہو اگر درکار انشا روح اور حوار ارم
ماسو اللہ مالکؑ کر وِرد الا اللہ کا

اسی طرح یہاں پر ایک رباعی بھی ملاحظہ ہو۔

کس کام وہ وعدہ دم دلاسا اور دھوم
گہرا گہرا سہاگ کل رسم و رسوم
لو دل کو ادا دکھا کر کہ ہوا
ہم کو سرکار کا ارادہ معلوم ہوا

ساتھ ہی اس مخمس کو بھی دیکھیے۔

ماہر حالِ ہم رہو اہل سلوک ہو اگر
حاکم طور دم رہو اہل سلوک ہو اگر
گرو سر حرم رہو اہل سلوک ہو اگر
در صد دہم رہو اہل سلوک ہو اگر
کو عدمِ ورود ہو سر کو اودھر رکھا کرو

صنعت غیر منقوط میں شاعری کرنا بہت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعت میں انشا سے پہلے اور انشا کے بعد اردو کے کسی اور شاعر کی اس صنعت میں قابل قدر تخلیق سامنے نہ آسکی۔ البتہ اس صنعت میں مرزا دبیر کا ایک پورا مرثیہ ضرور ملتا ہے۔ یہ مرثیہ انشا کی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ واضح اور پر لطف ہے۔ اس مرثیے میں دبیر نے اپنے تخلص کو غیر منقوطہ بنانے کے لیے عطارد تخلص استعمال کیا ہے، جو معنی کے لحاظ سے دبیر کے بہت حد تک قریب ہے۔ اس مرثیے کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

حر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا
وہ حملہ ور اِدھر اُدھر اسلام ور ہوا
سر گرم معرکہ سرِ اعدا اگر ہوا
وہ گل کھلا کہ لالہ کہسار سر ہوا
اہل حسد کو درس اِدھر آہ آہ کا
حور و ملک کو ورد اُدھر واہ واہ کا

قصیدہ طورالکلام:

'طورالکلام' انشاء اللہ خاں انشا کا بے نقط قصیدہ ہے، جو ان کی کلیات کے 'دیوان اردو' میں شامل ہے۔ یہ قصیدہ حضرت علیؓ کی منقبت میں لکھا ہے۔ اس قصیدے میں جملہ 148 اشعار ہیں۔ قصیدے میں جو اشعار کہے گئے ہیں وہ اردو، ترکی عربی اور فارسی سبھی زبانوں میں ہیں۔ چونکہ قصیدہ بے نقط ہے اس لیے اس کی شعری خصوصیات اور حضرت علیؓ کی شان و شوکت اس خوبی سے قارئین تک نہیں پہنچ پائی ہے، جس خوبی سے انشا پہنچانا چاہتے تھے۔ اس قصیدے کے تمہیدی حصے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہلاؤ مروحۂ آہ سرو کو مرگام
کہ دل کو آگ لگا کر ہوا ہوا آرام
در وصالِ دل آرام دور و رہ مسدود
مراد مرحلہ گرد وساوس و اوہام
الم مولدِ سودا و درد گردا گرد
سوادِ دورۂ صحرا مصور دو دوام
وہ گرد سودہ الماس کل ہلاہل وار
ہوا کا لطمہ محل ہلاک و ورطۂ سام
ہوا مسودۂ سرد آہ برسر مو
محل صد الم دودِ دل اصول مسام

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انشا نے اس قصیدے کو بے نقط بنانے کے لیے مخلوط زبان (اردو، ترکی، عربی، فارسی) کا استعمال کیا ہے جس سے قصیدے کی شعری خصوصیات اور حضرت علیؓ کی شان و شوکت واضح نہیں ہو پائی ہے۔ اسی کے پیش نظر انشاء اللہ خاں انشا نے 'مطرالمرام' کے عنوان سے اس قصیدے کی شرح فارسی زبان میں لکھی۔ 'مطرالمرام' کا ایک مخطوطہ ریلینڈ لائبریری، مانچسٹر میں محفوظ ہے، جو 1233ھ کا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی 'مطرالمرام' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انشا کو اس قصیدے پر بڑا ناز تھا۔ 'مطرالمرام' میں انشا نے اس قصیدے کی نہ صرف شرح لکھی ہے بلکہ ضمنی طور پر بہت سے واقعات اور نئے نئے علمی پہلو بھی بیان میں آگئے ہیں۔ ڈاکٹر مختار احمد نے لکھا ہے کہ 'کتاب اگر کبھی شائع ہوئی تو اس سے اس عہد کی ادبی اور معاشرتی زندگی کی جھلکیاں، علمی نکتے، ادبی لطائف سامنے آئیں گے۔' یہ شرح بھی فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2000، ص 158)

مثنوی لوحہ موزون:

کلیات انشا میں اس مثنوی کا پورا نام 'مثنوی بی نقط ولوحہ سرخی نیز بی نقط وہم لوحہ موزون' لکھا ہے۔ یہ مثنوی جملہ 101 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں اس عہد کی مثنوی کی روایت کے مطابق پہلے حمد کے چند اشعار ہیں، اس کے بعد نعت رسولؐ ہے، پھر منقبت کے اشعار ہیں۔ اس کے بعد حاکم وقت نواب سعادت علی خاں کی مدح بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی کے نعتیہ اشعار ملاحظہ ہو۔

ممدوح امم رسولِ اکرم   درعلم الٰہ اصلِ آدم
او مالک اصلِ سر سرمد   سردار ہمہ رسل محمدؐ
گرد رہ او لوا مع طور   ہم سرمۂ مردمک دہ حور
واماء علوم سرور کل   در گلکدۂ سرور اوگل
ہم ماہِ سماۂ علم و ادراک   ہم مطلع مہر سر لولاک

اس مثنوی کے علاوہ انشا نے اردو میں متعدد

مثنویاں لکھی ہیں، جن میں درہجو زنبور، درہجو کھٹمل، درہجو پشہ، درہجو مگس، مثنوی فیل، مرغ نامہ، شکایت زمانۂ نافرجام، مثنوی سحر حلال، مثنوی درلہجۂ اردو، ہجو گیان چند، حکایت وغیرہ شامل ہیں۔ان مثنویوں کو اردو ادب میں کوئی خاص اہمیت نہیں ملی، لیکن مثنوی لوحہ موزون کو قابل قدر اہمیت حاصل ہے۔اس کی وجہ اس کا غیر منقوط ہونا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انشا کے تمام غیر منقوط ادبی کارناموں کی طرح اس مثنوی کا مطالعہ قدرے دشوار ہے، لیکن ان کے تمام غیر منقوط کارنامے کی طرح اس کی بھی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

داستان سلک گہر:

انشاء اللہ خاں انشا نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی غیر منقوط کارنامہ انجام دیا ہے۔'سلک گوہر' انشاء اللہ خاں انشا کی دوسری کہانی ہے، جس میں انھوں نے ایک نیا تجربہ کیا ہے اور اس تجربے میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس کہانی کو لکھنے میں اردو کے ایسے حروف کا استعمال کیا ہے، جو غیر منقوط ہیں۔انشا کہانی کو مکمل کرنے میں کامیاب ضرور ہوئے ہیں، لیکن اس کہانی میں وہ روانی اور وہ لطف نہیں ہے، جو ایک اچھی کہانی میں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی 'سلک گوہر' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بہرحال 'سلک گوہر' کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا غیر منقوط قصہ ہے۔ اس میں ملک روس کی ملکۂ گوہر آرا کی داستان بیان کی گئی ہے۔اس پابندی کی وجہ سے انشا کا ذخیرۂ الفاظ اتنا محدود ہو گیا کہ وہ بار بار ایک سے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ الفاظ ہیں جو نہ تو بول چال کی زبان کا حصہ ہیں اور نہ معروف ہیں بلکہ غیر منقوط ہونے کی وجہ سے عربی، فارسی، ترکی زبانوں سے لیے گئے ہیں اور اسی لیے ساری عبارت میں اظہارِ بیان کا سانس قدم قدم پر پھولنے لگتا ہے۔انشا کی جدت پسند طبیعت نے غیر منقوط نثر لکھنے کا تجربہ تو کیا مگر یہ بامعنی تجربہ نہ بن سکا۔اس میں نہ کہانی کا لطف ہے اور نہ اسلوبِ بیان کا بلکہ لفظوں کا ایک ایسا جال سا بن گیا ہے، جسے لفظوں کے گورکھ دھندے کا نام دیا جاسکتا ہے۔''

(ایضاً،ص 166)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔'سلک گوہر' کا مطالعہ بہت مشکل ہے۔اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے، طبیعت ایک دم سے الجھ جاتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جملے میں بالکل ربط نہیں ہے۔ اکثر مقامات پر معنی سمجھ میں ہی نہیں آتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نثری تصنیف کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ کوئی پہیلی بوجھ رہے ہیں۔انشاء اللہ خاں انشا نے الفاظ کو غیر منقوط بنانے کے لیے اکثر لفظ کو بدل دیا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے اپنے نام کو غیر منقوط بنانے کے لیے 'انشاء اللہ' کی جگہ 'ارادِ اللہ' لکھا ہے اسی طرح اپنے والد کے نام 'ماشاء اللہ' کو 'لمع اللہ' لکھا ہے۔ اس طرح نام کو بدل دینے سے نام کے معنی نہیں بدلتے۔نمونے کے طور پر سلک گہر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ملکۂ گوہر آرا کا دل اس حال کا مطلع ہوا۔اُس دم محرمِ اسرار، مہر کردار، ہم عمر، ماہ رو کو کہا کہ'' ادھر آؤ، اور اس کو لاؤ''۔ ہر گاہ مارمہرہ عطارِ دالماس آسا کالا گا، اور محلِ لمع مارِ مدّ سما کالا ہوا، اور مدادِ مردمکِ حورِ ملاءِ اعلا کا مسودہ کھلا، اور وسواس کا کلسرا اُس کا اُگلا ہوا سم کھا کر سورہا، اور گہوارہ کودکِ ماہِ مراد کا ہلا، ملکِ روس کلاہِ مکلل گوہر و الماس و لعل رکھ کر، اُس صدورِ امر کا مامور ہو، سہا ہوا مع ماہ رو وارِدِ معطر محل کر کراہا۔''

(انشاء اللہ خاں انشا (مصنف)، امتیاز علی عرشی (مرتب) سلگ گوہر (طبع دوم)، رام پور رضا لائبریری، رام پور، 2001، ص 12)

'سلک گوہر' کا مخطوطہ کمیاب ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے اور دوسرا مخطوطہ جموں یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے۔ عابد پیشاوری نے اپنے ایک مضمون میں قیاساً 'سلک گوہر' کو 1215ھ کے آس پاس کی تصنیف قرار دی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق عابد پیشاوری نے محض قیاس کیا ہے اس کی بنیاد کسی ٹھوس دلیل پر نہیں ہے۔امتیاز علی عرشی نے رام پور میں محفوظ 'سلک گوہر' کے مخطوطے کو مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ 1948 میں شائع کیا۔

انشا نے اپنی طبیعت کی اپج دکھانے کے لیے یہ بے نقط داستان لکھنے کی کوشش کی اور وہ لکھنے میں کامیاب بھی ہو گئے، لیکن اس کہانی کو وہ موثر نہیں بنا پائے۔سلک گوہر کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے اسے لگتا ہے کہ اس عبارت کے مطالعے سے اسے گھٹن ہو رہی ہے۔امتیاز علی عرشی سلک گوہر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''دراصل اس بے لطفی کی وجہ یہ ہے کہ عام اردو بول چال کا سرمایۂ الفاظ انشا کے عہد میں یونہی کم تھا، اُس پر طرہ یہ ہوا کہ ہندی کے وہ لفظ، جن میں ٹ، ڈ یا ڑ پائی جاتی ہے، اس بنا پر چھوڑنا پڑے کہ اس زمانے میں ان پر چھوٹی 'ط' لکھنے کی جگہ چار چار نقطے لگائے جاتے تھے۔اگر موجودہ چلن انشا کے دور میں بھی پایا جاتا تو عبارت کی سانس اتنی نہ گھٹ جاتی۔'' (ایضاً،ص 5-6)

گیان چند جین سلگ گوہر کے متعلق 'اردو کی نثری داستانیں' میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی اہمیت محض کوہ کندن وکاہ برآوردن میں ہے۔ بے نقط کی قید کی وجہ سے اس قدر بے لطفی پیدا ہو گئی ہے کہ پوری داستان کا پڑھنا تقریباً محال ہو گیا ہے۔''

(گیان چند جین، اردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1987، ص 365)

سلگ گہر کے بے لطف ہونے اور بے جا ترکیبوں کے استعمال کے باوجود اس داستان کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ یہ اردو کا پہلا غیر منقوط قصہ ہے۔ اس سے پہلے عربی زبان میں اس طرح کے کارنامے ملتے ہیں۔عربی زبان کے ادیب فیضی کی دو کتابیں 'سواطع الالہام' اور 'مواردالکلم' نثر میں اور 'دیوان مادح نظم'' فارسی میں ملتے ہیں، جو غیر منقوط ہیں۔انشا کے کلیات میں پورے اردو دیوان بے نقط کے علاوہ ایک فارسی مثنوی، ایک قصیدہ 'طور الکلام' اور کچھ رباعیات اس صنعت میں ملتے ہیں، لیکن اردو میں سلگ گہر بے نقط نثر کا پہلا نمونہ ہے۔

■

''سلک گوہر' کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا غیر منقوطہ قصہ ہے، اس میں ملک روس کی ملکۂ گوہر آرا کی داستان بیان کی گئی ہے۔اس پابندی کی وجہ سے انشا کا ذخیرۂ الفاظ اتنا محدود ہو گیا کہ وہ بار بار ایک سے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ الفاظ ہیں جو نہ تو بول چال کی زبان کا حصہ ہیں اور نہ معروف ہیں بلکہ غیر منقوطہ ہونے کی وجہ سے عربی، فارسی، ترکی زبانوں سے لیے گئے ہیں اور اسی لیے ساری عبارت میں اظہارِ بیان کا سانس قدم قدم پر پھولنے لگتا ہے، انشا کی جدت پسند طبیعت نے غیر منقوطہ نثر لکھنے کا تجربہ تو کیا مگر یہ بامعنی تجربہ نہ بن سکا،اس میں نہ کہانی کا لطف ہے اور نہ اسلوبِ بیان کا بلکہ لفظوں کا ایک ایسا جال سا بن گیا ہے، جسے لفظوں کے گورکھ دھندے کا نام دیا جاسکتا ہے۔

Dr. Md Nehal Afroz
Assistant Professor (Urdu)
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob :9032815440
Email:nehalmd6788@gmail.com

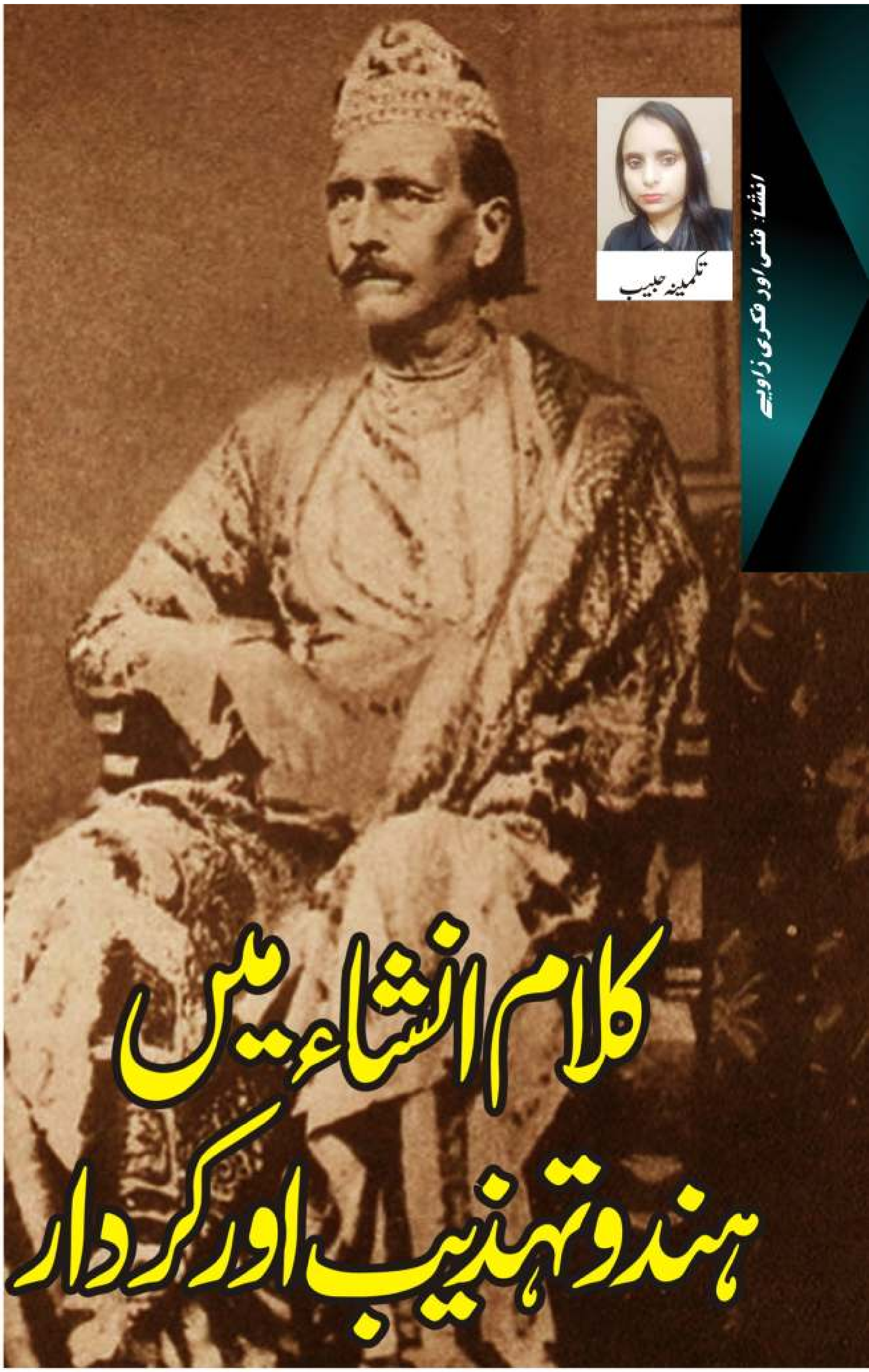

تکمینہ حبیب

کلام انشاء میں ہندو تہذیب اور کردار

اردو شاعری مشرقی شعری روایت کی مضبوط پاسدار رہی ہے، اس زبان نے عربی اور فارسی زبان کی شعری اصطلاحات کو بخوبی قبول کیا ہے جسے انشاء اللہ خاں انشا نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کر کے اپنی شاعری میں ایک جہان معانی کو پیش کر دیا ہے۔ ان کے کلیات میں اجنبی اور نامانوس الفاظ کی کثرت بھی ہے اور اردو میں مستعمل عربی کے مانوس و غیر مانوس الفاظ و محاورات، مرکبات اور فقرے بھی موجود ہیں۔

شعر و ادب میں انشاء اللہ خاں انشا کی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ انشا کا نام آتے ہی قاری کے ذہن میں ان کی معرکتہ الآرا تصانیف دریائے لطافت، سلک گوہر اور 'رانی کیتکی کی کہانی' گردش کرنے لگتی ہیں۔ ان کا شمار اردو کے نامور کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ مرشد آباد (بنگال) میں دسمبر 1752 میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنی زندگی کے تقریباً بارہ سال گزارے۔ تعلیم و تربیت اور شعر گوئی کا آغاز بھی وہیں سے کیا۔ انھیں علم طب اور علم منطق ورثے میں ملا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے سپہ گری، زبان دانی اور شعر گوئی کے فن میں بھی کم عمری میں ہی مہارت حاصل کر لی تھی جس میں ان کے خاندانی ماحول کا دخل بھی تھا۔ انھوں نے صرف و نحو اور منطق و حکمت پر بھی پوری دسترس حاصل کی۔ بچپن سے ہی انشا کا رجحان شاعری کی جانب رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 16 برس کی عمر میں ہی انھوں نے اپنا دیوان مکمل کر لیا اور وہ صاحب دیوان شاعر بن گئے۔ انھیں نظم و نثر دونوں میں عبور حاصل تھا۔ مروجہ دستور کے مطابق شاعری میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ جیسی مختلف اصناف سخن میں اپنے علم و فن کے جوہر دکھائے۔ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ترکی، پشتو، پوربی اور مارواڑی زبانوں کا بھی علم رکھتے تھے اور نہ صرف ان زبانوں میں بولتے اور لکھتے تھے بلکہ ان میں انھوں نے شعر بھی کہے اور اپنی زبان دانی کا سکہ بھی جمایا۔

انشا اپنی ہمہ جہت شخصیت کی بنا پر اپنے ہم عصروں اور بعد کے آنے والوں کے لیے توجہ کا مرکز رہے۔ وہ بے شمار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک خاص عنصر ظرافت و بذلہ سنجی تھا جس کی بدولت وہ ہر محفل و دربار میں اپنی رنگا رنگ طبیعت کی بنا پر گلفشانی کر کے نئے نئے شگوفے کھلاتے رہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں مختلف قسم کی خصوصیات کی آمیزش پائی جاتی ہے جو ان کی مختلف خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے۔ ان کے علم و فن کے حوالے سے میر حسن، سعادت خاں ناصر، محمد حسین آزاد، قدرت اللہ شوق، بھگوان داس ہندی، شیخ محمد وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی اور سید محمد یکتا جیسے تذکرہ نگاروں نے انھیں شاعر زبردست، شیریں زباں، ہمہ گو اور ہمہ داں جیسے ناموں سے یاد کیا ہے۔

کلام انشا کی بات کی جائے تو اس میں کئی طرح کے رنگ موجود ہیں مثلاً کہیں دہلوی رنگ کی غزلیں ہیں تو کہیں لکھنوی رنگ کے اشعار اور کہیں کہیں ریختی کا رنگ بھی ہے۔ انشا نے مختلف فرقوں، قوموں اور مذاہب کے لوگوں کی زبان و اصطلاحات کو اپنے کلام میں نہایت حسین و دلکش انداز میں پیش کیا ہے، جن میں آزاد فقیروں کی زبان، سادھوؤں اور سنتوں کی زبان، گنواروں کی بولیاں، مارواڑی لہجہ، یوروپین لہجہ، عورتوں کی بولیاں، آغاؤں کا

بلند لہجہ، چرند و پرند کے نام، ملبوسات، جنگی اور فوجی ساز و سامان، پھل پھول، کیڑے مکوڑے، شخصیات، زیورات، مقامات وغیرہ سبھی کچھ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ حمد و نعت اور منقبت ایسی اصناف ہیں جن میں شوخی وظرافت کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن انشا چونکہ ایک شوخ طبع شخصیت کے مالک تھے تو انھوں نے اِن اصناف میں بھی شوخی و تمسخر کی گنجائش پیدا کر لی۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ انبساطی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس کو پڑھ کر دل کو فرحت و خوشی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے بعض جگہ دو لفظی اور سہ لفظی تراکیب کا استعمال اپنے عہد کے مروجہ اصولوں کے مطابق کیا ہے اور کلام میں نئی نئی تراکیب وضع کرنے کے باعث وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد نظر آتے ہیں۔

اردو شاعری مشرقی شعری روایت کی مضبوط پاسدار رہی ہے، اس زبان نے عربی اور فارسی زبان کی شعری اصطلاحات کو بخوبی قبول کیا ہے جسے انشاء اللہ خاں انشا نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال کر کے اپنی شاعری میں ایک جہان معانی کو پیش کردیا ہے۔ ان کے کلیات میں اجنبی اور نامانوس الفاظ کی کثرت بھی ہے اور اردو میں مستعمل عربی کے مانوس و غیر مانوس الفاظ و محاورات، مرکبات اور فقرے بھی موجود ہیں۔ ان کے یہاں ہندو دیو مالائی، ہندو دھرم، علم الاصنام اور ہندوستانی قصے و کہانیوں کی اصطلاحات، تلمیحات اور الفاظ بھی بکثرت نظر آتے ہیں جن سے ان کے کلیات میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ہندوازم کو انشا اپنے کلیات میں اس دلکش و خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ کلیات کے حسن و دلکشی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ سناتن تہذیب و کرداروں کو پیش کرنے کا ان کا ایک خاص انداز ہے، چند دیوی دیوتاؤں کا کردار ملاحظہ ہو۔

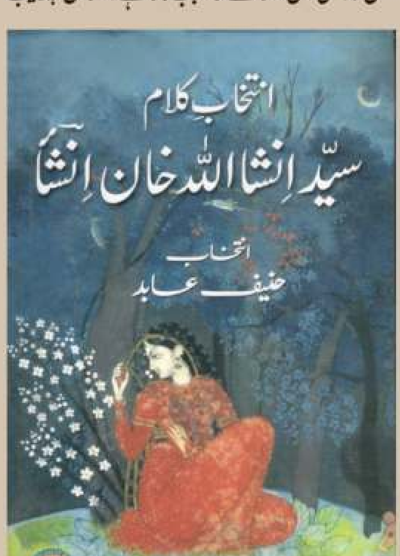

شِیو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں
کیا ہی بہار آج ہے برمہا کے رُنڈ پر

اس شعر میں انشا نے نہایت حسین و دلکش انداز میں پاربتی کے شیو سے گلے ملنے کو پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھیں دیکھ کر برہما کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ہے۔ پاربتی، پربت کی بیٹی کو کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق پاربتی ہمالیہ پہاڑ کی بیٹی کا نام ہے جس کی شادی شیو جی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس دیوی کو مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ برمہا (برہما) کے تعلق سے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ خالق کائنات ہیں۔ منواسمرتی کے مطابق خدا نے جانداروں کو پیدا کرنے سے پہلے پانی کو پیدا کیا اور اس میں ایک بیج پھینکا۔ بیج کے پانی میں پڑتے ہی سورج کی مانند ایک روشن گولا نمودار ہوا جس کے اندر سے برہما پیدا ہوئے۔ برہما کا رنگ سُرخ ہے۔ ان کی سواری ہنس ہے اور ان کی عورت سرسوتی ہیں جو کہ علم کی دیوی ہیں۔

مہادیو اوترے جو کیلاس سے اپنی جٹا کھولے
تو شاید بن سکے اس جوگ کے بیراگ کا جوڑا
شیر کی کھال بچھا اور ملی تن پہ بھبوت
گاہ جوگی کی طرح رہتے ہیں آسن مارے

ان اشعار میں انشا نے مہادیو کی وضع قطع کو نہایت بیباک انداز میں بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ مہادیو دراصل شیو جی کا لقب ہے جو ہندوؤں کے مشہور دیوتا ہیں۔ سناتن دھرم کے ماننے والے شیو جی کو کائنات کی تخلیق کرنے والا سب سے بڑا و عظیم دیوتا تسلیم کرتے ہیں، اس لیے انھیں مہادیو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ویدک دور میں ان کی پرستش رُدر کے نام سے کی جاتی تھی اور پُرانوں کے دور میں وہ شنکر اور شیو کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا مسکن کیلاش پہاڑ ہے۔ پُرانوں کے مطابق ان کی ہیئت اور شکل و صورت کچھ اس طرح ہے۔ سر پر گنگا، ماتھے پر چاند اور تیسری آنکھ، گلے میں سانپ اور آدمیوں کے سروں کی مالا، پورے جسم پر راکھ ملی ہوئی، شیر کی کھال اوڑھے ہوئے اور بائیں پہلو میں اپنی بیوی پاروتی کو لیے ہوئے آسن مار کر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے بیٹوں کے نام گنیش اور کارتکیہ ہیں۔ ان کا ہتھیار ترشول اور سواری نندی نامی بیل ہے۔ ان کے کمان کا نام پناک ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس پشُ پت نام کا ایک مشہور ہتھیار تھا جو انھوں نے ارجن کی عقیدت سے خوش ہوکر انھیں عطا کردیا تھا۔ ان کے متعلق پرانوں میں متعدد قصے ہیں مثلاً انھوں نے کام دیو یعنی موکل عشق و وصل کو جلا کر خاک کردیا تھا اور دکچھ کے یگیہ کو پامال کردیا تھا۔ ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ سمندر کو متھنے پر جو زہر نکلا تھا، اُس زہر کو شیو جی نے پی لیا تھا اور وہ زہر انھوں نے اپنے پیٹ میں نہیں اُترنے دیا بلکہ گلے میں ہی رکھا جس کی وجہ سے ان کا گلا نیلا ہوگیا تھا، اسی کی مناسبت سے انھیں نیل کنٹھ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ انھیں فنِ موسیقی اور رقص کے اعلیٰ درجے کا یوگی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نام سے ایک پُران بھی ہے جو شیو پُران کے نام سے مشہور ہے۔ انھیں متعدد القاب سے یاد کیا جاتا ہے جن میں شیو، شنکر، شمبھو، ایشور، ایش، وِشوناتھ، تری لوچن، جٹادھر، بھوت ناتھ، رُدر، مہاکال اور شری کنٹھ وغیرہ اہم ہیں۔

کبھے ہے انھیں دیکھ کر راجہ اندر
یہ لجیات ہیں تمتیں دامن کے دُت
کہیں تو سادھے ہوئے جوگ وہ پری زادیں
کہ راجہ اندر کے سہرہ کو جو کریں چوپٹ

اندر ہندوؤں کے ایک مشہور دیوتا کا نام ہے جس کا مقام سورج اور زمین کے درمیان ہے۔ اندر آسمان، بہشت، ہوا، بادل اور بہشت کی حوروں، پریوں اور اپسراؤں کے مالک ہیں۔ ان کا رنگ کُندن کی طرح سرخ، بازو لمبے اور شکل و صورت اختیاری ہے یعنی جس وقت بھی جو صورت چاہے اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے خاص کام ہیں موسموں کا انتظام، بارش کا اہتمام، برق و رعد کی ماموری اور زمینوں کو سرسبز و شاداب رکھنا۔ انھیں دیوتاؤں کا راجا تسلیم کیا جاتا ہے۔ رِگ وید میں اندر کی بہادری، شجاعت، دلیری، جواں مردی، مردانگی وغیرہ کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اندر کو سمت مشرق کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہزاروں دیویوں کو یہاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے
نہیں یہ لکھنؤ ایک راجہ اندر کا اکھاڑا ہے

راجہ اندر کا اکھاڑا سے مراد ایسی محفل یا صحبت کے ہیں جہاں حسینوں کے ہجوم، پریوں کے جمگھٹ اور حُسن و شباب کی نمائش ہو۔ اس شعر میں انشا نے راجہ اندر کے اکھاڑے کی تشبیہ کو پیش کرتے ہوئے لکھنؤ کے ماحول و معاشرے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عہدِ انشا میں چونکہ لکھنؤ میں عیش و عشرت کی فراوانی تھی، لوگ خوش و خرم رہتے تھے۔ میلے ٹھیلے ہوا کرتے تھے۔ بزمیں سجا کرتی تھیں۔ غرض کہ لکھنؤ کا ماحول راجہ اندر کے اکھاڑے سے کم نہیں تھا اس لیے لکھنؤ کے اس ماحول کو انشا نے راجہ اندر کے اکھاڑے سے تشبیہ دی ہے۔

دبدبہ اُن کو خدا نے وہ دیا جن کے حضور
چیز کیا ہے وہ بھبیچن وہ کہاں کا راون

بھبیچن دراصل وبھیشن ہے۔ یہ راون کا چھوٹا بھائی تھا۔ راون لنکا کا مشہور راجا اور راچھسوں کا سردار تھا جسے رام چندر جی نے جنگ میں مارا تھا۔ وبھیشن، وِشروامُنی کے نطفے اور کیکسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے نانا کا نام سُمالی تھا۔ ایک دن سُمالی نے کُبیر کو پُشپک جہاز پر جاتے ہوئے دیکھا تو سوچا کہ کاش اس کا ہونے والا ناتی بھی ایسا ہی بلند اقبال ہو۔ اُس کی بیٹی کیکسی جو نہایت حسین وجمیل تھی، اُس کو اولاد پیدا کرانے کے لیے وِشروامُنی کے پاس بھیجا۔ جب کیکسی مُنی کے پاس پہنچی تو اس وقت مُنی عبادت میں مشغول تھے۔ کیکسی کی دل فریب اداؤں کو بھانپ کر مُنی نے اس سے کہا کہ آج تو نے میری عبادت میں خلل ڈال کر میرا دھیان بھنگ کیا ہے، اس لیے تیرے بطن سے نہایت بدصورت اولاد پیدا ہوگی۔ کیکسی نے جب بہت منت سماجت کی تب مُنی نے اس سے کہا: جا! تیرا آخری بیٹا میری ہی نسل سے ہوگا جو نہایت طاقت ور اور راہِ حق پر چلنے والا ہوگا۔ یہی کیکسی کا وہ آخری بیٹا تھا جس کا نام وبھیشن رکھا گیا۔ وبھیشن نے اپنے بڑے بھائیوں راون اور کنبھ کرن کے ساتھ خوب عبادت و ریاضت کی۔ برہما نے خوش ہو کر وبھیشن کو دعا دی کہ وہ ہمیشہ نیک نام رہے اور راہِ حق سے کبھی منہ نہ موڑے۔ اس کے بعد وبھیشن اپنے بھائی راون کے ساتھ لنکا میں رہنے لگا۔ جب راون نے سیتا کو اغوا کر لیا تھا تو تب وبھیشن نے راون کا ساتھ نہیں دیا اور رام چندر جی کی طرف ہو گیا تھا۔

بھینسا سُر اپنے حکم میں اک ایسے بیر ہیں
جو چٹ سے توڑ ڈالتے ہیں کرگدن کی شاخ

بھینسا سُر ایک ظالم راچھس کا نام ہے جسے کنس نے شری کرشن کو مارنے کے لیے بھیجا تھا لیکن وہ خود شری کرشن کے ہاتھوں مارا گیا۔ انشا نے بھینسا سُر کی طاقت کو اپنے شعر میں پیش کیا ہے کہ وہ ذرا سی دیر میں ہی کرگدن یعنی گینڈا جیسے جانور کی گردن تک توڑ دیتا ہے۔

جیت کر آوے لڑائی جو مہابھارت کی
تو جُدھشٹر بھی کرے نذر سرِ جرجودھن

جُدھشٹر دراصل یدھشٹر ہے۔ پانچ پانڈو میں سب سے بڑے بھائی کا نام جُدھشٹر تھا۔ باقی کے نام بھیم سین، ارجن، نکل اور سہدیو ہیں۔ ان کے باپ کا نام دھرم اور ماں کا نام کُنتی تھا۔ یہ پانچوں بھائی راہِ حق پر چلنے اور سچ بولنے کے لیے مشہور تھے۔ ان میں صرف ایک بری عادت تھی جوا کھیلنے کی۔ قمار بازی میں یہ اپنی سلطنت، دروپدی اور اپنے تمام بھائیوں کو ہار گئے تھے۔ مہابھارت کی جنگ کے بعد ہستناپور ان کے قبضے میں آ گیا اور یہ وہاں کے راجا بن گئے۔

راجا دھرت راشٹر کے ایک سو ایک بیٹے تھے جو کورو کہلاتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا جرجودھن یعنی دُریودھن ہے جو کہ مہابھارت کی جنگ میں کوروؤں کا قائد تھا۔ اس کے چچیرے بھائی پانڈو بہت عقلمند، ذہین اور محنتی تھے، اس لیے وہ ان سے بہت عداوت رکھتا تھا۔ بھیم چونکہ گدا چلانے میں ماہر تھا اور دُریودھن بھیم کی برابری نہیں کر سکتا تھا اس لیے بھیم سے وہ کچھ زیادہ ہی عداوت رکھتا تھا۔

دیوکی نندن تمھارے ہم سا داس
کس نہیں آت ہو ہمارے پاس

دیوکی نندن، شری کرشن چندر وِشنو کے دس اہم اور خاص مظاہر میں سے آٹھویں مظہر یعنی اوتار ہیں۔ اوتار سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جو بلندی سے اُتری ہو یعنی ذات باری کا انسانی شکل میں جنم لینا اوتار کہلاتا ہے۔ شری کرشن کے والد کا نام وسدیو تھا جو یُد خاندان سے تھے اور والدہ کا نام دیوکی تھا جو بھوج خاندان کے دیوک کی بیٹی تھیں۔ دیوک کے بھائی اُگرسین کے لڑکے کنس کو دیوکی کے بیاہ کے وقت یہ بات معلوم ہو گئی کہ دیوکی کے آٹھویں حمل سے جو بچہ پیدا ہوگا، وہ اُسے مار ڈالے گا۔ اس خوف کی وجہ سے کنس نے دیوکی اور وسدیو کو قید کر دیا اور دیوکی کے سبھی بچوں کو پیدا ہوتے ہی مروا دیا۔ لیکن آٹھواں بچہ جو بھادوں بدی اشٹمی کو آدھی رات کے وقت پیدا ہوا اُسے وسدیو رات میں ہی جسودا کو دے آئے اور اُسی رات جسودا کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی تھی، اس لڑکی کو لا کر دیوکی کے پاس سلا دیا۔ جب کنس کو پتا چلا کہ دیوکی کے بطن سے بچہ پیدا ہوا ہے تو اس نے اسے پتھر پر دے پٹکا۔ وہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ یوگ مایا تھی اور فوراً ہی وہ کنس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُڑ کر وندھیاچل پہاڑ پر چلی گئی اور دوسری طرف شری کرشن جسودا کے یہاں پرورش پانے لگے۔ بڑے ہو کر شری کرشن نے متعدد کرامات دکھائیں۔ کنس نے انھیں مروانے کے لیے مختلف تدابیر آزمائیں لیکن کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ بالآخر بڑے ہو کر شری کرشن نے کنس کو مار ڈالا۔

انشا نے ان ہندو کرداروں سے جڑے ہتھیار و جنگی اوزاروں کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی ہے مثال کے طور پر ارجن کے بان اور مہابھارت سے متعلق شعر ملاحظہ ہو۔

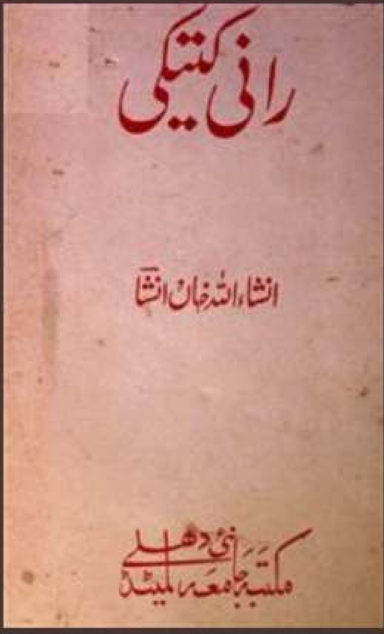

انشا نے ہندو معاشرے اور ان سے جڑے عقائد کی عکاسی نہایت دلکش پیرائے میں کی ہے جس سے ان کے عمیق مشاہدے کا پتا چلتا ہے۔ ہندوؤں میں مختلف قسم کے اعتقادات پائے جاتے ہیں مثلاً وہ ماتھے پر تلک لگاتے ہیں، جنیئو ایک قسم کا سوت کا ڈورا ہوتا ہے جسے عموماً ہندو گلے اور بغل میں ڈالتے ہیں، گنگا نہانے جاتے ہیں، چار بتّی کا چراغ جلا کر پوجا پاٹ کرتے ہیں، گنگا میں پھولوں کو بہاتے ہیں وغیرہ۔

بان ارجن کے بن گئے سب بان
اور ادوانیوں نے کھائے پان
مہابھارت کے قصوں کے سوا یاں اور تو کچھ بھی
نہیں ہم پاس صاحب کے گزاف ولاف کا جوڑا

ارجن کا بان سنسکرت رزمیہ مہابھارت سے لی گئی ایک بہت ہی مشہور تلمیح ہے۔ مہابھارت کو مشہور رشی وید ویاس نے لکھا تھا۔ یہ لڑائی قدیم دور میں ہندوستان کے چندر بنسی راجا کے دو لڑکوں دھرت راشٹر (جس کے بیٹے 'کورو' کہلاتے تھے) اور پنڈو (جس کے لڑکے 'پانڈو' کہلاتے تھے) کے لڑکوں کے درمیان ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے تقریباً سبھی راجہ مہاراجہ شامل تھے۔ یہ لڑائی دہلی کے شمال میں واقع کروکشیتر کے میدان میں لڑی گئی۔ اٹھارہ دنوں کی گھمسان کی جنگ کے بعد پانڈوؤں کی جیت

ہوئی۔ ان پانچ پانڈوؤں میں ارجن سب سے بہادر اورجاں باز تھے۔جس طرح ان کی جاں بازی اور بہادری ایک مثال بن چکی تھی اسی طرح تیراندازی کے لیے بھی وہ مشہور تھے۔ان کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا تھا۔انھوں نے اپنی تیراندازی کے بل پر سوئمبر میں دروپدی کو جیتا تھا۔

دروپدی پنچال دیس کے راجا دروپد کی بیٹی تھی۔ راجانے اپنی بیٹی کے سوئمبر میں ایک بھاری فولادی کمان بنوائی اور بلندی پر ایک نشانہ لٹکا دیا جس کے نیچے ایک درمیان میں سوراخ ہوئی تھالی تھی جو لگاتار ہلتی رہتی۔راجا نے یہ شرط رکھی کہ جو شخص اس کمان کو اٹھا کر، اُس پر تانت چڑھا کر پانچ تیر اس طرح سے مارے کہ وہ تھالی کے سوراخ سے ہوتے ہوئے نشانے پر جا کر لگیں تو وہ اُسی سے اپنی بیٹی کی شادی کرے گا۔یہ تمام شرائط ارجن نے پوری کیں اور دروپدی کو جیت لیا۔

ارجن کے بان کی اہم خصوصیات یہ تھیں کہ وہ اپنے تیروں سے ہوا اور بارش کو روک دیتا تھا اور آگ اور پانی بھی برسا دیتا تھا۔ارجن چونکہ بہادری اور تیراندازی میں بے مثال تھے اس لیے ارجن کے بان کی تلمیح رائج ہوگئی ہے۔

بره وہی وہی اُودھو سے گل کی یہ بنتی
یہ آنسوا چھار ہے ہرنین مانجھ جیسے رہٹ

اودھوشری کرشن کے چچیرے بھائی تھے۔جوان کے ہی ہم عمر اور شکل وصورت میں ان سے کافی حد تک مشابہ تھے۔وہ شری کرشن کے عزیز دوست تھے۔وہ نہایت ہی عقل مند تھے اور فوری طور پر فیصلہ لینے میں ماہر تھے۔ جب شری کرشن متھرا میں تھے تب اودھو دوارکا سے ان سے ملنے متھرا گئے۔برندابن کے تمام باشندے چونکہ شری کرشن کی جدائی میں بے چین و بے قرار تھے،اس لیے ان سب کو تسلی دینے کے لیے شری کرشن نے اودھو کو متھرا سے برندابن بھیجا۔اودھو کا ذکر کرشن کی لیلاؤں، بھجنوں اور کرشنات میں آتا ہے۔

رہا کل رہس کا معاملہ وہ ہَر اور رادھا رس کورس
وہ اوداس لوگ وہ سارا وہ سُر سُر اور راگ ادا ہوا

اس شعر میں ہر اور ہری، وشنو کے اوتار شری کرشن ہیں اور رادھا،شری کرشن جی کی ایک بہت ہی پیاری گوپی کا نام ہے۔رادھا اور کرشن سے جڑی اٹکھیلیاں اور مختلف اشعار کلیاتِ انشا میں مختلف انداز میں جا بہ جا نمایاں ہیں۔مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

لپٹ کر کشن جی سے رادھکا یونہیں لگی کہنے
ملا ہے چاند سے اے لو اندھیرے پاکھ کا جوڑا

انشا نے ہندو معاشرے اور ان سے جڑے عقائد کی عکاسی نہایت دلکش پیرائے میں کی ہے جس سے ان کے عمیق مشاہدے کا پتا چلتا ہے،ہندوؤں میں مختلف قسم کے اعتقادات پائے جاتے ہیں مثلاً وہ ماتھے پر تلک لگاتے ہیں،جنینو ایک قسم کاسوت کا ڈورا ہوتا ہے جسے عموماً ہندو گلے اور بغل میں ڈالتے ہیں، گنگا نہانے جاتے ہیں،چار بتّی کا چراغ جلاکر پوجا پاٹ کرتے ہیں، گنگا میں پھولوں کو بہاتے ہیں وغیرہ۔

ان اشعار میں کشن جی اور کنھیا جی سے مراد شری کرشن ہیں اور رادھکا سے مراد رادھا کے ہیں۔کرشن کے لفظی معنی ''سیاہ فام'' کے ہیں۔چونکہ رنگ روپ میں کرشن کالے تھے اور رادھا ان کی نسبت گوری تھیں۔لہٰذا شعر میں رادھا نے خود کو چاند سے اور کرشن کو اندھیری رات کے زمانہ سے تشبیہ دی ہے۔جیسا کہ رادھا، کرشن جی سے لپٹ کر کہتی ہیں کہ چاند سے اس وقت اندھیرے پاکھ کا جوڑا مل گیا ہے۔اسی طرح رادھا اور کرشن سے جڑے مختلف اشعار جگہ جگہ اپنی جلوہ نمائیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔اشعار دیکھیے۔

رادھکا کو چین کیا آوے کنھیا جی بغیر
واقعی کافور اُڑ جائے اگر فلفل نہ ہو
کیڑے کے پر انگیا میں لگا رادھکا بولی
ہے کشن! یہ کاٹے گا مرے انگ میں کیڑا

گنیش ہندوؤں کے پانچ ممتاز دیوتاؤں میں سے ایک ہیں جن کا سر ہاتھی کا اور پورا جسم انسان کا ہے۔ان کے متعلق ایسا مشہور ہے کہ پہلے ان کا سر انسان کی طرح ہی تھا لیکن سنیچر کی نظر بد کی وجہ سے ان کا سرتن سے جدا ہو گیا اور بھگوان وشنو نے ایک ہاتھی کا سر کاٹ کر ان کے جسم سے جوڑ دیا۔اسی وقت سے ان کا سر ہاتھی کا اور جسم انسان کا ہے۔اس کے بعد جب گنیش پرشُرام سے آمادۂ فساد ہوئے تو انھوں نے غصے میں آکر ان کا ایک دانت توڑ دیا۔گنیش جی کے سر میں تین آنکھیں ہیں۔ان کا پیٹ آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور پیشانی پر آدھا چاند ہے۔ ان کی سواری چوہا ہے۔پُرانوں کے مطابق کوئی بھی نیک کام کرنے سے پہلے جو بھی ان کی پوجا نہیں کرتا وہ اس کے کام کو بگاڑ دیتے ہیں۔اس لیے ہندو جب بھی کوئی نیک کام کرتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی پوجا کرتے ہیں۔گنیش جی کو انشا اپنے اشعار میں نہایت دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو۔

تھا کو ہِ شکوہ و خوب صورت
بے شبہہ و شک گنیش مورت

ہنومان جس نے رام چندر جی کی بیوی سیتا کے اغوا ہوجانے کے بعد رام چندر جی کی خدمت اور مدد کی تھی۔وہ لنکا میں جا کر سیتا کی خبرگیری کر کے ان کے حالات سے رام چندر جی کو باخبر کرتے تھے۔انھوں نے سیتا کو راون کی قید سے آزاد کرانے کے لیے ان کی فوج سے جنگ بھی کی تھی۔غالباً یہی وجہ ہے کہ پورے ہندوستان میں ہنومان جی کی پرستش کی جاتی ہے۔نہ صرف وشنومت کے لوگ ہی ہنومان جی کی تکریم کرتے ہیں بلکہ دوسرے مت کے ہندو لوگ بھی ان کی بہت عزت وتعظیم کرتے ہیں۔بندروں کو کھلانا ان کے نزدیک نہایت ہی نیک کام تصور کیا جاتا ہے۔ہنومان کے کردار کی عکاسی کرتا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کنور جی بھی ٹھاکر کے ایسے ہی ہیں
ہنومان جیسے مہیشر کے سُت

شعر میں انشا نے کنور جی کو ٹھاکر کے بیٹے سے تشبیہ دیتے ہوئے ہنومان کی مثال بیان کی ہے کہ کنور جی بھی ٹھاکر کے ایسے ہی ہیں جیسے کہ ہنومان مہیشر یعنی شیو کے بیٹے ہیں۔

انشا نے ہندو معاشرے اوران سے جڑے عقائد کی عکاسی نہایت دلکش پیرائے میں کی ہے جس سے ان کے عمیق مشاہدے کا پتا چلتا ہے۔ہندوؤں میں مختلف قسم کے اعتقادات پائے جاتے ہیں مثلاً وہ ماتھے پر تلک لگاتے ہیں،جنیئو ایک قسم کا سوت کا ڈورا ہوتا ہے جسے عموماً ہندو گلے اور بغل میں ڈالتے ہیں، گنگا نہانے جاتے ہیں،چار بتی کا چراغ جلا کر پوجا پاٹ کرتے ہیں، گنگا میں پھولوں کو بہاتے ہیں وغیرہ۔شعر دیکھیے۔

دریا سے نہا دھوکر جوں آخر شب کافر
ہاتھوں میں لیے چوکھ پوجا کو دمن نکلے

اور اشعار ملاحظہ ہو۔

گلے میں ڈال کر زنار قشقہ کھینچ ماتھے پر
برہمن بنیے اور طوف در بیت الصنم کیجے
نہانے والوں نے دریا متھایاں تک کہ یہ دیکھو
نمش کی طرح اُبھر آئی سراسر جھاگ پانی پر

اس شعر میں انشا کہتے ہیں کہ دریا نہانے والوں نے دریا کو اتنا زیادہ متھا کہ اس میں چاروں طرف گندگی پھیل گئی اور ساری گندگی وغلاظت جھاگ کی شکل میں پانی کے اوپر

تیرنے لگی۔

ہندوؤں میں ستی کی رسم انگریزوں کے دور تک رائج تھی۔ ہندوؤں میں یہ رواج تھا کہ کسی شخص کے مرنے پر اس کی بیوی بھی اس کی چتا کے ساتھ جل جاتی تھی یا اسے زبردستی چتا کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا یعنی ''چتا میں آگ کی نذر کرنے کی رسم'' ستی کہلاتی تھی۔ یہ رسم کب سے شروع ہوئی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ صدہا سال سے ہندوؤں میں یہ رسم چلی آرہی تھی جس کے خاتمے کے لیے راجا رام موہن رائے نے اپنی پوری کوشش کی اور 4 دسمبر 1829 کو لارڈ ولیم بینٹنک نے ہندوستان میں جاری ستی کی روایت کو قابل تعزیر جرم قرار دیا۔ انشا نے ستی جیسی رسم کے اثرات کو اپنے شعر میں کس انداز میں اُجاگر کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

ستی اک ہوگئی بیراگن آ کر گھاٹ پر تب سے
اُداسا چھا رہا ہے اور سب بیراگ پانی پر

انشا ستی کی رسم کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب سے اس گھاٹ پر ایک بیراگن ستی ہوئی ہے تب سے یہاں اُداسی وافسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔

انشا نے تہواروں کو نہایت دلنشین انداز میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ ہولی دراصل ہندوؤں کے بڑے تہواروں میں سے ایک تہوار ہے جو موسمِ بہار میں جنوبی ایشیائی ممالک خاص طور پر ہندوستان اور نیپال میں قومی سطح پر منایا جاتا ہے۔ اسے رنگوں کا اور محبت کا تہوار کہا جاتا ہے۔ یہ برائی پر نیکی کی فتح کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ تہوار دو دن تک منایا جاتا ہے جس میں لوگ گھروں کے آنگن کو رنگوں سے سجاتے ہیں، ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے ہیں، ناچتے گاتے ہیں، بھگوان کرشن کی پوجا کرتے ہیں اور ان کی مورتی پر رنگ ڈالتے ہیں وغیرہ۔ ہولی کا ذکر بار بار کلیات میں نظر آتا ہے۔ ہولی کے تہوار سے متعلق چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

برج میں جا کر کھیلو ہولی بھک موئے تم ہو ناصح جیو
گیند کی جاگہ واں تو تڑاتڑ متھرا کے پیڑے پڑتے ہیں

اس شعر میں انشا بھک موؤں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اے بھک موؤں تمھیں یہاں کچھ نہیں ملے گا اس لیے تم برج (متھرا کا ضلع جس میں گوکل، بندرابن وغیرہ شامل ہیں اور ایک سواڑسٹھ میل کے گھیرے میں ہے۔ یہ جگہ کرشن جی کے وہاں پیدا ہونے اور لیلا کے سبب نیز زبان کی فصاحت وسلاست کے باعث نہایت مشہور ہے) میں جا کر ہولی کھیلو کیونکہ وہاں تمھیں متھرا کے پیڑے کھانے کو ملیں گے۔

موسم ہولی میں دیکھا ہم نے کیا ہی لطف واہ!
رنگ سے تیرا ہوا جب طرۂ شب رنگ سرخ
اے ہم نشیں یہ موسم ہولی ہے ان دنوں
منظور ہے جو سیر تو اُس خوش ادا کو چھیڑ
بناتے ہیں ہم تم کو کیا شیخ جیو
ذرا آنے دیجے تو ہولی کی رُت
مجلس میں جو ہولی کی کل شیخ جی آئے تھے
رندوں نے انھیں چھیڑا ایسا ہی کہ بن نکلے
کیوں نہ ہو ہر گل کے جوڑے آج افشاں باغ میں
مل کے ہولی کھیلتی ہیں آج پریاں باغ میں

شری کرشن کے متعلق اشعار کلیات میں کثرت سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

ہے خال یوں تمہارے چاہ ذقن کے اندر
جس روپ ہو کنھیا آب جمن کے اندر
جاوے وہ صنم برج کو تو آپ کنھیا
جھٹ سامنے ہو مرلی کی دھن نذر پکڑ کر
بھرا میں نے بندرابن میں ارے کشن ہوپ کا نعرہ تو
مہاراج ناچتے کودتے چلے آئے لٹ پٹی پاگ سے
دوارکا کشن کو گردی تھی عجب کیا انشا
گر محل ہم کو میسر کرے حق سونے کے

مندرجہ بالا جملہ اشعار تہذیب ومعاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے نظر آرہے ہیں۔ کہیں ہندو کردار اپنی بھرپور جلوہ نمائیاں دکھا رہے ہیں تو کہیں ہندو تہذیب ومعاشرت کی جھلکیاں کلام میں بکھری پڑی ہیں۔ کہیں دیوی دیوتا ہیں تو کہیں راچھس وغیرہ جیسے کردار کلام کو وسعت بخش رہے ہیں۔ کہیں رادھا اور کرشن کی انکھیلیاں دکھائی دے رہی ہیں تو کہیں ہولی جیسے تہوار کے رنگ کلام میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ غرض کہ کلامِ انشا مختلف قسم کی رنگا رنگ تہذیب ومعاشرت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اپنے عہد کے لسانی مزاج کے مطابق ہندی زبان کے وہ الفاظ جو اردو زبان میں داخل ہو کر اس کا جزو بنتے جا رہے ہیں، جابہ جا دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہندی ہی نہیں بلکہ فارسی زبان کی اصطلاحات وتراکیب بھی کلام میں بے شمار ہیں یعنی کہیں ہندی پن ہے تو کہیں فارسیت اور کہیں ان دونوں کی آمیزش۔ غرض کہ ان کے کلام میں اُن فارسی، عربی اور ہندی اصطلاحات وغیرہ کے اثرات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے جن کا اُس عہد کے لسانی، سماجی اور تہذیبی تقاضوں سے گہرا رشتہ تھا۔ غزلیں، قطعات، قصائد، مثنویات، ریختی، رباعیات غرض کہ ہر صنف میں اس عہد کے سماجی اور ہندو تہذیب و

انشا نے ہندو تہواروں کو نہایت دلنشین انداز میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ہولی دراصل ہندوؤں کے بڑے تہواروں میں سے ایک تہوار ہے جو موسم بہار میں جنوبی ایشیائی ممالک خاص طور پر ہندوستان اور نیپال میں قومی سطح پر منایا جاتا ہے۔اسے رنگوں کا اور محبت کا تہوار کہا جاتا ہے۔یہ برائی پر نیکی کی فتح کی نشاندہی کرتا ہے۔یہ تہوار دو دن تک منایا جاتا ہے جس میں لوگ گھروں کے آنگن کو رنگوں سے سجاتے ہیں، ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے ہیں، ناچتے گاتے ہیں،بھگوان کرشن کی پوجا کرتے ہیں اور ان کی مورتی پر رنگ ڈالتے ہیں وغیرہ۔ ہولی کا ذکر بار بار کلیات میں نظر آتا ہے۔

روایات کی عکاسی کرنے والے الفاظ ومحاورات یا اصطلاحات کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتے ہیں۔ کلام میں موجود مختلف قسم کے کردار اور ان کے رسم ورواج و اعتقادات وغیرہ کے ذریعے انشا نے ہندوازم کی بہترین نمائندگی کی ہے۔

مراجع ومصادر

1 کلیات انشاءاللہ خان: انشاءاللہ خاں انشا، منشی نول کشور، لکھنؤ 1876
2 کلامِ انشا: مرزا محمد عسکری ومحمد رفیع فاضل دیوبند، ہندوستانی اکیڈمی، اتر پردیش، الہ آباد 1952
3 انشاءاللہ خاں انشا اور ہندوستانی روایت، ترتیب وتہذیب، سید رضا حیدر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 2019
4 تلمیحاتِ انشا مع شخصیات: ساجدہ قریشی، اسلامک ونڈرس بیورو، دریا گنج، نئی دہلی 2017
5 بیر ارجن کی کہانی، مصنفہ یدھشٹر، پوری برادرس بک سیلر اینڈ پبلشرز کچہری روڈ، لاہور 1928
6 تاریخ ادب اردو (جلد سوم): ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2015
7 آبِ حیات: مولانا محمد حسین آزاد، فرید بکڈ پو (پرائیویٹ) لمیٹڈ 2014
8 ہندو مذہب کی جھلکیاں: ڈاکٹر محمد یٰسین، راعین پبلشنگ ہاؤس، امین آباد، لکھنؤ 1967

■

Takmeena Habeeb
H. No.: 1913, Air Force Road, Jawahar Colony
Faridabad- 121001 (Haryana)
Mob.:8368954195

حبیب کیفی

یہ کیسے ممکن ہے کہ رسم الخط کے بغیر اردو زندہ رہ جائے گی: حبیب کیفی

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: میرا یہ خیال ہے کہ بات کی شروعات منفی پہلو سے نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم سوال جب سامنے ہے تو اس کا معقول اور موزوں جواب بھی ہونا چاہیے۔ زبانوں کی اموات کی وجوہ اصل میں ان سے بے رخی کے علاوہ ہماری لاپرواہی کو بھی گردانا جا سکتا ہے۔ بے رخی ان معنوں میں کہ دانستہ ہم اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اس شیریں زبان کا جادو اسے نہ جاننے والوں کے سر چڑھ کر بھی بولتا ہے۔ نہ جاننے سے مراد رسم الخط سے ہے۔ رسم الخط سے ناواقفیت کے باوجود کثیر تعداد میں لوگ اردو بولنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم اردو دانوں کو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ زبان کو زندہ رکھنے کی خاطر اس قبیل کے لوگوں کا گرم جوشی اور خوش مزاجی کے ساتھ خیر مقدم کریں۔ ظاہر ہے کہ اس پہل سے وہ اردو سے اور زیادہ قریب ہوں گے۔ یہ اثباتی قدم اردو کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ سندِ قبولِ عام دلانے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ یہ تو جگ ظاہر ہے کہ کسی بھی زبان کی بقا اور زندگی کے لیے اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال بھی ہونا ضروری ہے۔

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: اس سوال کا جواب اوپر والے پہلے سوال سے ہی منسلک ہے۔ اسی کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر یہ دہرا دینے کی ضرورت ہے کہ اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اردو کے ضمن میں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ بڑی تعداد میں کم فہم لوگ شعر وشاعری یا زیادہ سے زیادہ داستانوں اور افسانوں تک ہی اسے محدود مانتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دیگر ترقی یافتہ زبانوں ہی کی طرح اردو میں بھی تمام اہم علوم کے ساتھ ہی اس میں آج جدید ترین ٹکنولوجی اور سائنس کے علاوہ دیگر ضروری مضامین کی تعلیم وتربیت کا بھی معقول انتظام ہے۔

مسئلہ یہاں اردو کے تعلق سے روزگار کا بھی ہے۔ یہ بڑا ہی اہم مسئلہ ہے جو انسانی زندگی اور اس کی بقا سے تعلق رکھتا ہے۔ زندگی تو ہے لیکن اس کی بقا کے لیے روزی روٹی کا انتظام ہی نہیں ہے تو ایسی زندگی تو بالعموم موت سے بھی بدتر بن کر رہ جایا کرتی ہے۔ حالات اور سوالات ہمارے سامنے ہیں۔ آج جب کہ اردو صرف شعر وشاعری اور داستانوں یا افسانوں ہی کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں تمام علوم کی درس تدریس کا معقول انتظام ہے تو محبانِ اردو کو روزگار سے جوڑنے والی تعلیم اور علوم سے بھی جوڑ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اردو کے حوالے سے روزی روٹی کے مسئلے مسائل اگر حل ہو جاتے ہیں تو پھر کسی خاص دیگر مہم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آدمی کی بنیادی ضرورتیں جب پوری ہونے لگیں گی تو اس کا رجحان ازخود ہی اس طرف بڑھے گا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید اضافہ بھی ہوتا چلا جائے گا۔ اس طرح اس طریقے سے بھی اس زبان کو زندہ رکھا جا سکتا ہے نیز اس کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔

سوال: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: چولی دامن کی بات یہاں ایک دم فٹ بیٹھتی ہے۔ تہذیب وتمدن کا تعلق زبان سے ہے۔ اس کی کئی ایک مثالیں بھی بے حد ہی قدیم تہذیبوں کے اُجاگر ہونے سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی زندہ مثالیں 'مایا' اور 'مون جوداڑو' کی تہذیبیں ہمارے سامنے ہیں۔ دیگر بے شمار برتنوں، آلات اور اوزاروں وغیرہ کے علاوہ پڑھی نہ جا سکنے والی زبانوں کا بھی یہاں پتہ چلا ہے۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ ان زبانوں کو پڑھ کر سمجھ لینے کے بعد راز افشا ہو جائیں۔ پھر بھی یہ ایک سامنے کی بات ہے کہ اس طرح بھی تہذیب وثقافت کے رشتے کو سمجھا جا سکتا ہے۔

دورِ حاضر میں بھی ہم جس تہذیب کی بات کرتے ہیں اس میں زبان کا نہ صرف اہم کردار ہے بلکہ زبان کو جزوِ لاینفک کی صورت میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں (اور مانتے بھی ہیں) کہ اردو خود اپنے آپ میں ایک ترقی یافتہ تہذیب کا نام ہے۔ کیا برا ہے اگر اسے ایک حقیقت تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے متعلق مفصل باتیں بھی کہی جا سکتی ہیں نیز یہ کہ اسی ایک موضوع پر مفصل بحث ومباحثے کی بھی ضرورت ہے۔

سوال: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: وراثت کی بات اصل میں ماضی وحال سے تعلق رکھتی ہے اور تحفظ کا جہاں تک تعلق ہے وہ مستقبل کی بات ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحفظ کس کا اور کس کے لیے؟ جواب ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ بیتے ہوئے (ماضی) اور ابھی (حال) کا۔ ماضی اور حال اگر محفوظ ہیں تو اس سے مستقبل ازخود ہی محفوظ ہوجائے۔ انسانی وراثت میں دیگر باتوں کے علاوہ زبان کا اہم اور اعلیٰ مقام ہے۔ ہم سب بخوبی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ یہ زبان ہی ہے جو ہمارے جذبات، احساسات اور تجربات وغیرہ کی ترسیل کا کام کیا کرتی ہے۔ زبان سے نابلد لوگ گونگے ہوا کرتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ اس قبیل کے لوگوں کی بھی اپنی زبان ہوا کرتی ہے۔ مختصراً اگر کہا جائے تو انسانی وراثت کی ہر شے کا تعلق زبان سے ہے۔ اس لیے کہ جن اشیا کو ہم بے زبان گردان لیتے ہیں وہ بھی اپنی ہی زبان میں اپنی بات کہتی ہوئی لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر مصوری کو لیں تو مصوری کی اپنی زبان ہوا کرتی ہے، جس کی ابجد رنگوں اور ریکھاؤں کو مانا جا سکتا ہے۔ یوں بھی کہاوت ہے کہ تصویریں ازخود ہی بولا کرتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ سنگ تراشی اور موسیقی کے ساتھ بھی ہے۔ البتہ نگاہ اور دانش کی بات ضرور ہے۔ لب لباب یہ کہ انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ زبانوں کی زندگی سے بہت گہرائی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی، زندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: زبان میں خواندگی، زندگی، سائنسی اور سماجی مواد کی کمی سے زبان پر یقینی طور پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صحت مند اور ترقی یافتہ زبانیں مختلف علوم کا انتظام اپنی زبانوں میں کیا کرتی ہیں۔ اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی یہاں تک کہ عربی اور فارسی میں بھی اب تو یہ رواج عام پا چکا ہے کہ کیسا ہی علم اور اس کی تعلیم ہو، وہ اپنی زبان ہی میں اسے پڑھائیں گے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ طالب علم کو اپنی مادری زبان میں علم حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اور نصاب کی باتیں جلدی سمجھ میں آتی ہیں، ذہن نشین ہوتی ہیں اور ہوتے ہوتے اس پر قدرت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جہاں کہیں بھی اس بنیادی بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو نتائج منفی برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے طالب علموں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور سرکاری سطح پر اخراجات میں بھی بیجا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

سوال: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں اردو والے ہی دانستہ یا نادانستہ طور پر زبان کے لیے خطرات پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ سب سے بڑی اور خطرناک بات یہی ہے کہ اس کے رسم الخط کو بھی بدل ڈالنے کی باتیں گاہے بگاہے اُٹھتی رہتی ہیں۔ میں تو کوئی چھ دہائیوں سے اردو کے مصنفین وشعرا کا یہ رویہ دیکھ رہا ہوں۔ اس میں میں نے عصمت آپا کو پیش پیش پایا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ رسم الخط کے بغیر اردو زندہ رہ جائے گی۔ خطرات ہندی زبان سے بھی بتائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچھی اور رواں دواں ہندی کے لیے اردو کی اشد ضرورت مانی جاتی ہے۔ یہ بات میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ ہندی داں طبقہ نیز لیکھک اور کوی اردو سے بہت پیار کرتے ہیں اور اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ توجہ یا زور نہ دینے کے سبب وہ طالب علم بھی اردو سیکھنے یا لکھنے پڑھنے سے محروم کردیے جاتے ہیں جو کم تعداد میں ہونے کے باوجود اس زبان سے شغف رکھتے ہیں۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے ؟

جواب: زندہ زبانوں کے مستقبل ہمیشہ ہی روشن ہوتے ہیں۔ نامساعد حالات میں بھی یہ زندہ رہتی ہیں تو اپنے محبان کے سبب ہی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ دھارے کے خلاف چل کر بھی زبانوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ ضرورت ہے تو پختہ عزم اور حوصلے کی۔ پھر تو راہیں ازخود ہی ہموار ہو جایا کرتی ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اردو زبان کی حفاظت اور بقا کی خاطر اس کے محبان ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ ویسے بھی جو لوگ مثبت سوچ (Positive Thinking) رکھتے ہیں ان کے لیے یہ راہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو جہاں کل تھی وہاں آج نہیں ہے اور جہاں آج ہے، اس سے آگے ہی بڑھنے والی ہے۔ ضرورت ہے تو بس اس بات کی کہ اس شیریں زبان کی بقا و ترویج کے لیے ہمیشہ ہی کوشاں رہا جائے۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں ؟

جواب: کہہ تو چکا ہوں کہ مضبوط ارادے حوصلے ہی اس سلسلے میں کام آسکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس بات کی نشاندہی کی ضرورت ہے کہ کتنا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تبھی تو اسے روکنے اور اس میں سدھار کی گنجائش دیکھی جائے گی۔ اسی مقام پر میں یہ بات دہرا دینا چاہتا ہوں کہ — اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ اردو رسم الخط کو تبدیل کر دینے کی کوششیں سالہا سال سے چل رہی ہیں اور بدقسمتی سے اردو کے سبب ہی پھلنے پھولنے اور نام ودام کما لینے والے ہی اس مہم میں پیش پیش دیکھے گئے ہیں۔ لہٰذا ایسے ادبا و شعرا کو ہموار نہ کیا جا سکے تو کم ازکم ان سے دوری ہی بنالی جائے۔ اسی طرح اردو جاننے، سمجھنے اور لکھنے پڑھنے کے معقول انتظامات کی طرف بھی توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

سوال: کیا اردو کے ادارے اور تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہی ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: یہ ایک بڑا ہی اہم اور قابلِ غور سوال ہے۔ ایسا اس لیے کہ خود میں نے اپنے آپ سے کئی کئی بار پوچھا ہے کہ ان ادبی تنظیموں کو یہ کیا ہو چلا ہے کہ بہت بڑی رقم خرچ کر کے مشاعرے اور سمینار منعقد کروائے جاتے ہیں۔ مشاعروں کے معیار کے متعلق کچھ بھی کہنا بے سود ہے۔ رہی بات سمینار وغیرہ کی تو اکثر و بیشتر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ انھیں ادبی شخصیات کو بار بار موضوع بحث و مباحث بنایا جاتا ہے جن کے متعلق بیسیوں بار نہ صرف مفصل کیا جا چکا ہے بلکہ جو آگے ہی لمبے چوڑے مضامین اور کتابوں کی زینت بن کر Eternal ہو چکے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسے ادبا و شعرا کا انتخاب کہیں اس لیے تو نہیں کیا جاتا کہ جب پہلے ہی اتنا مواد موجود ہے تو کچھ خاص محنت کی ضرورت ہی نہیں ہے! زیادہ تر اردو اکادمیوں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ میری نشاندہی کو کہیں میرے ہی گلے نہ ڈال دیا جائے، اس لیے واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشاعروں اور سمیناروں کی اہمیت سے کسی صورت انکار نہیں ہے۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ اردو زبان اس کے موجودہ رسم الخط ہی میں سکھانے اور لکھنے پڑھنے کے لیے بنیادی کتب کی بھی اشد ضرورت ہے۔ یہ کام برسہا برس سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کر رہی ہے۔ مشاعروں اور سمیناروں کے ساتھ ہی اردو کے اداروں اور تنظیموں کو اس بات کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

سوال: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟

جواب: یہ ایک بڑی اچھی بات ہے کہ سوالات کا سلسلہ ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ بہرکیف کلاسیکیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت یا ترقی پسندی وغیرہ کی بحثیں تحریکوں کے ذریعے بھی ہوتی رہی ہیں۔ ان مباحث کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس کی خاص اور بڑی وجہ یہ ہے کہ

ایسی تحریکیں لمبی مدت تک چلتی ہیں بلکہ چل رہی ہیں۔ ایک ترقی یافتہ زبان کے لیے ان کا وجود بھی لازمی ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میڈیم اسکول یہاں شاید ایک بھی نہیں ہے۔ دیگر اسکولوں اور کالجوں نیز یونیورسٹیوں کی بات کیا کی جائے۔ یہاں یہی عالم ہے۔ حتیٰ کہ مولانا آزاد یونیورسٹی میں بھی شاید اردو میڈیم سے کسی بھی مضمون کی پڑھائی نہیں ہوتی ہے۔ شہر میں بیسیوں مدرسے ہیں۔ وہاں بھی اردو میڈیم کا انتظام نہیں ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب: لائبریریوں کی تعداد ہمارے علاقے میں خاصی ہے، لیکن افسوس کہ ان میں شاید ہی کہیں اردو اخبار یا رسائل آتے ہوں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں ؟

جواب: اردو انجمنوں کی تعداد یہاں کل پانچ یا چھ ہے۔ یہ تمام انجمنیں اردو ادب کے فروغ اور مقبولیت کی غرض سے وقتاً فوقتاً مشاعروں، نشستوں اور سمیناروں وغیرہ کا انعقاد کرتی رہتی ہیں، لیکن زبان کے فروغ کے لیے زیادہ کچھ کر نہیں پا رہی ہیں۔ کافی برس پہلے راجستھان اردو اکادمی، جے پور کے تعاون سے شہر میں اردو کی درس و تدریس کی کوشش کی گئی تھی جو بدقسمتی سے زیادہ عرصے تک نہ چل سکی۔ یقینی طور پر وہ جذبہ اور بیداری پیدا نہ ہو سکی جس کی کہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ذاتی طور پر کوئی اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کے لیے اردو پڑھتا ہے تو یہ الگ بات ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں، جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے ؟

جواب: اردو زبان اور ادب ایک ہی زمرے میں مان لیے گئے ہیں۔ جب کہ یہ دو الگ الگ شعبے ہیں۔ زبان اور ادب۔ اردو درس و تدریس کے ساتھ ہی جب دیگر اہم اور جدید تعلیم یا مضامین کا معقول انتظام ہی نہیں ہے تو پھر ایسی شخصیات کی نشاندہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح انعام و اکرام یا پدم پرسکار وغیرہ کی بات بھی پیدا نہیں ہوتی۔ ادب کا جہاں تک تعلق ہے تو اتنا ضرور ہے کہ اپنی ہی کاوشوں سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لینے کے بعد قومی سطح پر شاعری اور تنقید کے میدان میں نام کما لینے والے شین کاف نظام کو صوبائی حکومت نے کچھ عرصہ پہلے 'راجستھان رتن' سے ضرور نوازا تھا۔

سوال: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: ملازمت اور خانگی مصروفیات کے سبب میں کچھ خاص نہیں کر سکا کہ اردو میں نے اپنے طور پر ہی لکھنا پڑھنا سیکھی، کسی اسکول میں نہیں۔ افسانے اور شاعری بھی اسی زبان میں کی۔ بعد میں ہندی کی طرف ضرور گیا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ کچھ شائقینِ اردو کو میں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی سے شائع شدہ 'ہندی سے اردو' ایسی کتابوں کی مدد سے لکھنا، پڑھنا اور بولنا ضرور سکھایا، ان میں صحافی، فوجی اور کچھ کالم اسٹوڈنٹ بھی رہے۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغِ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: مدرسوں اور مذہبی درسگاہوں کے علاوہ بھی اردو کو اسکولوں میں پڑھانے اور سکھانے کی اشد ضرورت ہے۔ جس بات کی کمی ہے، اس طرف بطورِ خاص توجہ دی جائے۔ یعنی دیگر مضامین کی طرح اردو کو بھی صرف اور صرف مضمون مان کر ہی نہ بیٹھا جائے بلکہ اردو کو تعلیم کا میڈیم بھی بنایا جانا چاہیے۔

سوال: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب: رسم الخط کا تعلق لکھنے (Writing) سے ہے۔ اس لیے اس کی بقا کے لیے لکھنے میں اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں ؟

جواب: اس کے لیے علاقائی زبانوں سے اردو کا اندرون رشتہ (Internal relation) ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ ایسے ضروری بلکہ بنیادی رشتے کے لیے اردو دانوں کو علاقائی زبانوں کے قریب جانے کی ضرورت ہی۔ غور کریں گے تو پائیں گے کہ کئی کئی علاقائی زبانوں میں اردو الفاظ مل جائیں گے۔

سوال: کیا آپ کے اہلِ خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: کم کم ہی جانتے ہیں۔

سوال: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: میری طرح سے ذوق وشوق نیز کاوشیں رہیں تو یقیناً یہ زبان گھر میں زندہ رہے گی۔

سوال: غیر اردو حلقے میں اردو کے فروغ کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے ؟

جواب: غیر اردو حلقے میں اردو کے فروغ کی بات تو بعد میں آتی ہے۔ سب سے پہلے تو اردو اور اس کے رسم الخط سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے بعد اس کا شوق پیدا کیا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زبان کی شیرینی سے متاثر ہو کر اس کا ذوق از خود ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی کوشش سے ان حلقوں میں معقول درس و تدریس کا انتظام ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر اردو حلقوں میں بھی اردو بولنے کے علاوہ لکھنا پڑھنا بھی عام ہو جائے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: میری دانست میں صرف ایک مہیلا پی جی کالج ہے جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد یونیورسٹی اور اس سے منسلک کالج میں بھی اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ البتہ مدرسے کئی ہیں جہاں اس کی پڑھائی کا بندوبست ہے۔

سوال: ملکی سطح پر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے ؟

جواب: ملکی سطح پر مجھے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی سے بہتر تو کیا اس سے اونے پونے بھی کوئی ایسی تنظیم یا ادارہ نظر نہیں آتا جو اردو کے درس کے علاوہ اس کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہو۔ کونسل اس کے لیے اردو سیکھنے والوں کے لیے بنیادی کتب تیار کرواتی ہے۔ اس کے علاوہ کونسل ہر ماہ 'اردو دنیا' کے علاوہ بچوں کے لیے 'بچوں کی دنیا' اور خواتین کے لیے بھی ایک ماہ نامے کے علاوہ سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کی بھی اشاعت کرتی ہے۔ اسی طرح سرکاری سطح پر 'آجکل' اور 'یوجنا' وغیرہ کی بھی ہر ماہ اشاعت ہوتی ہے۔ صوبائی سطح پر اردو اکادمیاں بھی اردو کاز کے لیے سہ ماہی پرچوں کے علاوہ کتب کی اشاعت بھی کرتی ہیں۔ یہ سب سرکاری سطح پر ہی ہو رہا ہے۔ منصوبہ بندی یا پروجیکٹ بنا کر ان سے اردو کے لیے تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سوال: سینٹرل اسکولوں اور نَو ودیہ وِدھیالیوں میں اردو تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے ؟

جواب: میری نالج میں یہ بات نہیں ہے۔

■

Habib Kaifi
172, Lala Lajpat Rai Colony,
5th Chopasni Road, Eidgah,
Jodhpur-342003
Mob. :8000245673
e-mail : habibkaifi@gmail.com

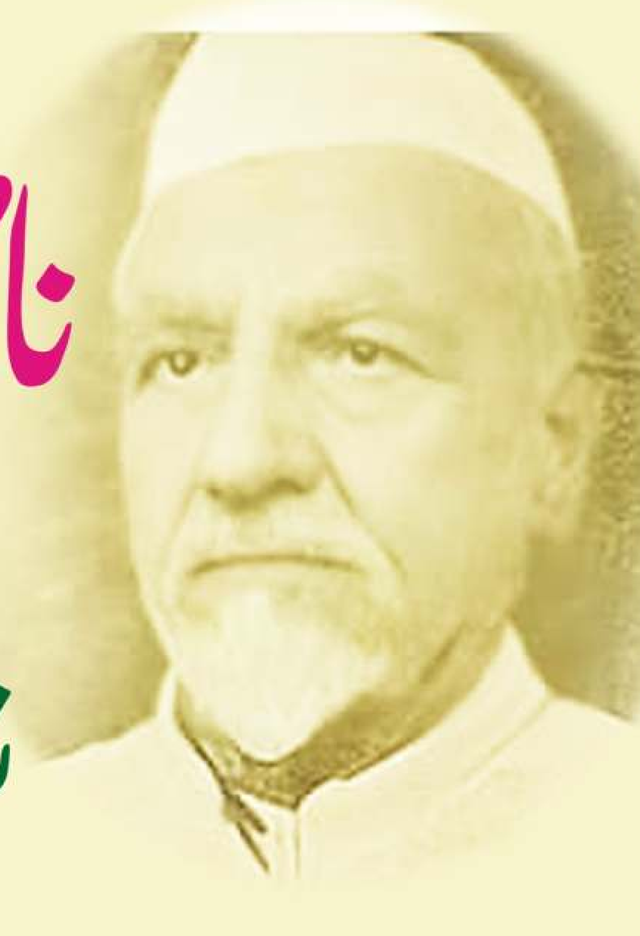

ابراہیم افسر

ناطق گلاوٹھی

کلامِ غالب کے شارح

شعر گوئی نئے انداز کی تجدید خیال
دیکھنا چاہے تو ناطق مرا دیوان اٹھا

مذکورہ بالا شعر کے خالق ناطق گلاوٹھی نے ہمیشہ فکری تجدید ،نئی جہت کے فروغ کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار گردانا۔ انھوں نے اپنے احباب اور اساتذہ سے خیالات و تفکرات میں تنوع اور رنگارنگی کا درس حاصل کرنے کے بعد اپنے لیے سنگلاخ راہوں کا انتخاب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تازگی اور شگفتگی کا احساس قارئین کو ہوتا ہے۔ ان کی غیرت و خودداری کے سبب انھیں رونقِ بزم سخن، شاعرِ پر فن، عمدۃ الشعرا، پیر مغانِ خم خانۂ سخن، فخر المتاخرین، استاذ الاساتذہ جیسے القاب سے نوازا گیا۔ سیاست، صحافت، شعروادب ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔

مولانا ابوالحسن المعروف بہ ناطق گلاوٹھی نے پہلے بیان یزدانی میرٹھی سے تلمذ حاصل کیا۔ بیان میرٹھی کے انتقال کے بعد داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی، لیکن جب داغ کا بھی انتقال ہوگیا تو ناطق نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا بلکہ کلامِ داغ کو سامنے رکھ کر مشقِ سخن کیا۔ ناطق گلاوٹھی کے آباو اجداد کا تعلق بلند شہر کے قصبہ گلاوٹھی سے تھا۔ ان کے والد ظہور الدین حسن میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ گلاوٹھی کے علاوہ ناگپور (مہاراشٹر) میں بھی سکونت پذیر تھے۔ ناطق گلاوٹھی کی پیدائش ناگپور میں 11 نومبر 1886 کو اور وفات 27 مئی 1969 کو ہوئی۔ ناطق گلاوٹھی کے شاگرد رشید، محمد عبدالحلیم کی اطلاع کے مطابق ان کی وفات کے بعد ناگپور میونسپل کارپوریشن نے ان کے گھر سے متصل سڑک اور خوش نما چوراہے کو 'مولانا ناطق روڈ' اور مولانا ناطق چوک' کے نام سے موسوم کیا۔[1]

ناگپور اور کامٹی کے علاوہ ان کی پرورش و پرداخت مغربی اتر پردیش کے مختلف شہروں میں ہوئی۔ موصوف نے دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد حکمت کا سبق حکیم احمد حسن سے پڑھا۔ ہاپوڑ میں اپنے خالہ زاد بھائی مولانا سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑوی کے ساتھ اپنے ابتدائی ایام میں مشقِ سخن کیا۔ انھوں نے نوچندی میرٹھ کے مشاعروں میں متعدد بار اپنا کلام سنایا۔ الغرض، میرٹھ سے ان کا تعلق ہمیشہ بنا رہا۔ یہاں تک کہ مولانا عبدالباری آسی الدنی نے بھی ناطق گلاوٹھی سے مشورۂ سخن کیا۔

ناطق گلاوٹھی کو شعروشاعری سے شغف طالب علمی کے زمانے سے رہا ہے۔ ان کا کلام رسالہ مخزن، پیسہ اخبار، عالم گیر، جلوۂ طور وغیرہ رسائل و جرائد میں شائع ہوا۔ ابتدا میں ناطق نیچرل شاعری کی جانب متوجہ ہوئے۔ اسی مناسبت سے ان کے پہلے شعری مجموعے 'نطق ناطق' میں نیچرل نظمیں شامل ہیں۔ 'نطق ناطق' کی چند نظموں کا ضمیمہ 'جلوۂ یار' میرٹھ میں مارچ 1913 میں شائع ہوا تھا۔[2] حالانکہ انھوں نے مولانا حالی کے درج ذیل شعر

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اتباعِ مصحفی و میر کر چکے

پر اپنی کتاب 'کلیل اور غلیل' میں خط کی شکل میں تنقید لکھ کر اعتراض کیا۔ اس کتاب میں موصوف نے جدید اور قدیم شاعری پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ 65 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پیش لفظ ان کے شاگرد ابوصالح محمد غضنفر حسین شاکر نائطی نے تحریر کیا۔ ان کی دیگر تصانیف میں سبع سیارہ، کنز المطالب اور 'دیوان ناطق' (مرتبہ محمد عبدالحلیم) شامل ہیں۔

ناطق گلاوٹھی کو جس کتاب نے عالمی شہرت عطا کی وہ کتاب 'کنز المطالب: شرح دیوان غالب' ہے۔ موصوف نے اس کتاب کو 1926 میں لکھا تھا۔ غور طلب رہے کہ ناطق گلاوٹھی نے اس شرح کو نظم طباطبائی کی شرح کے جواب میں لکھا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ شرح منظرِ عام پر نہ آسکی۔ لیکن والی آسی اور ساجد صدیقی کی کاوشوں سے اس شرح کو، مکتبہ دین و ادب، کچا احاطہ، لکھنؤ سے بعض ترمیم و اضافوں کے ساتھ، غالب صدی کے موقع پر 1968 میں شائع کیا گیا۔ 'کنز المطالب' کی اشاعت

اوراس کی اہمیت وافادیت کے بارے میں خیر بہوروی رقم طراز ہیں:

''شرح 'کنز المطالب شرح دیوان غالب' مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھی کی تصنیف ہے۔ مولانا ناطق، مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں بڑے صاحب فن استاد مانے جاتے ہیں، جن کی شہرت کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ مولانا عبدالباری آسی جیسے فاضل نے ان سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ انھیں مولانا عبدالباری آسی کے بیٹے والی آسی ہیں جنھوں نے اپنے رفیق کار ساجد صدیقی کی شرکت میں 'مکتبہ دین وادب' قائم کیا ہے اور تصنیف و تالیف کی قابل قدر خدمتیں انجام دے رہے ہیں، اب وہ اسی مکتبہ سے اسی مہینے میں 'کنز المطالب شرح دیوان غالب' شائع کر رہے ہیں جس کو غالب کا مہینہ قرار دیا گیا ہے اور ملک و بیرون ملک میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ یوم غالب خصوصیت سے غالب کی صد سالہ برسی کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ ساجد صدیقی اور والی آسی مستحق مبارک باد ہیں کہ شخصیت پرستی اور مصلحت بینی کے اس دور میں ان لوگوں نے پوری ادبی دیانت کے ساتھ اس شرح کا انتساب میر وغالب کے قدر شناس علم وادب کے محسن، مخیّر وخوش مذاق رئیس جناب مقبول احمد صاحب لاری کے نام کے ساتھ کیا ہے جن کی علمی وادبی خدمات کا ملک بھر میں چرچا ہے۔''[3]

ناطق گلاوٹھی کو کلام غالب سے والہانہ شغف تھا۔ ان کی نظر میں غالب کی جو شرحیں اس زمانے میں لکھی گئی تھیں وہ عیوب سے پاک نہ تھیں۔ اس لیے وہ خود چاہتے تھے کہ دیوانِ غالب کی ایسی شرح تیار کی جائے جس میں مشکل پسندی کے بجائے عام فہم اور سلیس زبان کا استعمال کیا جائے۔ حالانکہ ان کے استاد بیان میرٹھی نے بھی اپنے رسالے 'لسان الملک' میں دیوانِ غالب کی 13 غزلوں کی نامکمل شرح 'حل المطالب' 1895 میں لکھنا شروع کی تھی۔ بیان میرٹھی سے قبل شوکت میرٹھی بھی شوکت المطابع سے 'حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی' عنوان سے 1899 میں شرح دیوان غالب شائع کر چکے تھے۔ حالانکہ بعض ناقدین کی نظر میں شوکت میرٹھی کی شرح کا اسلوب الجھا ہوا اور غیر سلیس ہے۔ ناطق گلاوٹھی کے سامنے حسرت موہانی کی شرح 'دیوان غالب مع شرح' عبدالرحمٰن بجنوری کا 'محاسن کلامِ غالب' (مقدمہ دیوان غالب)، موہانی کی شرح دیوانِ غالب، سہا مجددی کی 'مطالب الغالب'، جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی 'مطالعۂ غالب' وغیرہ شرحیں موجود تھیں۔ لیکن انھیں سب سے زیادہ اعتراض نظم طباطبائی کی شرح 'شرح دیوان اردوئے غالب' (1900) پر تھا۔ جب انھوں نے نظم طباطبائی کی شرح کا مطالعہ کیا تو انھوں نے طباطبائی کی شرح کے حاشیوں پر نشانات قلم زد کیے۔ یہیں سے ان کے ذہن میں دیوانِ غالب کی مکمل شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم نے 'تفہیم غالب' کے دیباچے میں اس بات کی صراحت کی کہ میں نے اس کتاب میں جگہ جگہ طباطبائی سے اختلاف کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں طباطبائی کا احترام نہیں کرتا۔''[4] حالانکہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مقدمے میں وہی بات لکھی ہے جو ناطق گلاوٹھی نے 'کنز المطالب' کے مقدمے میں لکھی ہے۔ قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ فاروقی صاحب نے اپنے مقدمے میں دیوان غالب کی جن 20 شروحات کا ذکر کیا ہے اس میں ناطق گلاوٹھی کی شرح کنز المطالب کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ شاداں بلگرامی نے بھی اپنی شرح 'روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب [اردو]' کے مقدمے میں اپنے زمانے میں لکھی گئی شرحوں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے نظم طباطبائی کی شرح پر سخت اعتراض کیے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے اپنے مقدمے کے آخر میں نظم طباطبائی سے غالب کے مشکل اشعار کے معانی ومطالب نقل کرنے کا اعتراف کیا ہے۔[5] ناطق گلاوٹھی نے 13 جون 1965 کو 'کنز المطالب' کے دیباچے میں شرح نظم طباطبائی میں دیوان غالب کی فروگذاشتوں کے بارے میں لکھا:

''مجھے اس شرح کے متعلق عرض حال کے طور پر یہی لکھنا ہے کہ ناگپور شہر میں داؤدی جماعت کے ایک بزرگ بھائی حسین علی نامی رہتے تھے جو کئی سال تک جماعت کے سکریٹری بھی رہے۔ یہ بزرگ صاحب علم اور ادب نواز تھے جو مجھ سے کافی محبت کرتے تھے۔ ایک بار یہ نظم طباطبائی کی تصنیف کردہ شرح دیوان غالب لے کر میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ دیکھیے یہ مرزا غالب کے دیوان کی کتنی اچھی شرح ہے جس سے غالب کا کلام بہت آسان ہوگیا۔ میں نے ان سے کتاب لے لی اور کئی دن تک اسے اپنے مطالعے میں رکھا تو مجھے نظر آیا کہ اگرچہ مصنف نے بڑی قابلیت کے ساتھ شرح لکھی ہے لیکن کہیں کہیں کچھ زیادتی سے بھی کام لیا ہے۔ اس بات کا میں نے حسین علی صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ میرا مقصد اس کتاب کو پیش کرنے سے یہی تھا کہ غالب کے ساتھ طباطبائی صاحب نے جو ناانصافی کی ہے اس پر آپ کچھ لکھیں۔ اس وقت مجھے بھی یہی خیال ہوا کہ ان کے حکم کے [کی] تعمیل کروں لیکن بعد میں مناسب یہی سمجھا کہ پورے دیوان کی شرح لکھ ڈالوں اور طباطبائی صاحب نے جو کچھ زیادتیاں کی ہیں ان کے جواب بھی دے دوں۔ جس میں طباطبائی صاحب کا ادب بھی ملحوظ رہے۔ چنانچہ میں نے قلم برداشتہ پورے دیوان کی شرح لکھ ڈالی اور جہاں طباطبائی صاحب کی نگارشات کے خلاف لکھا وہاں اس بات کا اشارا بھی نہیں کیا کہ انھوں نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔''[6]

ناطق گلاوٹھی نے 'کنز المطالب' کو مکمل کرنے کے بعد میرٹھ کا سفر کیا۔ جہاں ان کی ملاقات رسالہ 'جلوۂ طور' کے مدیر شریف خاں آزاد سے ہوئی۔ ملاقات کے دوران یہ طے ہوا کہ اس شرح کو 'جلوۂ طور، میرٹھ' میں بالاقساط شائع کیا جائے گا۔ رسالہ 'جلوۂ طور' میں یہ شرح 'ز' کی ردیف تک 1938 تک شائع ہوئی۔ اس کے بعد شریف خاں آزاد کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے 'جلوۂ طور' بند ہو

ناطق گلاوٹھی کو جس کتاب نے عالمی شہرت عطا کی وہ کتاب 'کنز المطالب: شرح دیوان غالب' ہے۔ موصوف نے اس کتاب کو 1926 میں لکھا تھا۔ غور طلب رہے کہ ناطق گلاوٹھی نے اس شرح کو نظم طباطبائی کی شرح کے جواب میں لکھا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ شرح منظر عام پر نہ آسکی۔ لیکن والی آسی اور ساجد صدیقی کی کاوشوں سے اس شرح کو، مکتبہ دین و ادب، کچا احاطہ، لکھنؤ سے بعض ترمیم و اضافوں کے ساتھ، غالب صدی کے موقع پر 1968 میں شائع کیا گیا۔

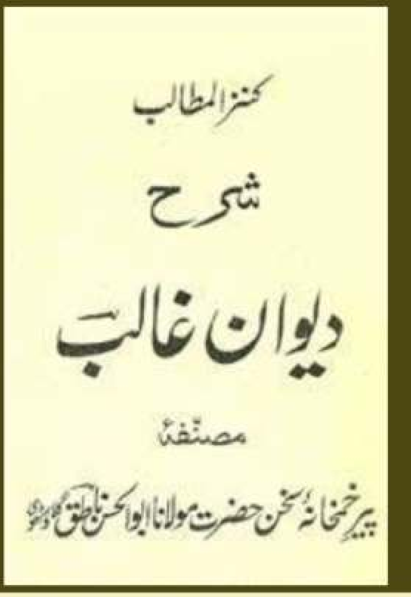

گیا۔اس کے بعد ناطق گلاؤٹھی کے پاس قارئین کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ اس شرح کو آپ جلد از جلد شائع کیجیے۔مولانا عبدالباری آسی سے اس شرح کی اشاعت کے بارے میں ناطق گلاؤٹھی نے مشورہ کیا۔آسی صاحب نے بتایا کہ خود انھوں نے اپنی شرح دیوانِ غالب کو صدیق بک ڈپو،لکھنؤ سے شائع کرایا ہے۔اس لیے آپ اس شرح میں غالب کے فن پر بھی بات کیجیے تو بہتر ہوگا۔ ناطق گلاؤٹھی نے مولوی عبدالحق سے اس شرح کی اشاعت کی بابت مشورہ کیا۔عبدالحق صاحب نے انھیں تسلی دی کہ اس شرح کو انجمن ترقی اردو، شائع کر دے گی۔لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔آخر کار عبدالباری آسی کے صاحب زادے والی آسی نے ناطق گلاؤٹھی کی 'کنزالمطالب' کو اپنے ذاتی اشاعتی ادارے مکتبہ دین و ادب سے فروری 1968 میں شائع کیا۔'کنز المطالب' میں غالب کی 231 غزلوں کی شرح پیش کی گئی ہے۔کتاب کا انتساب محسن علم و ادب عالی جناب مقبول احمد صاحب لاری کے نام ہے۔کتاب کی ضخامت 498 صفحات اور قیمت بارہ روپے پچاس پیسے (علاوہ ڈاک خرچ) تھی۔'کنز المطالب' کو بابو عبدالحلیم انصاری ناگپوری نے مرتب کیا ہے۔لیکن اس شرح میں کہیں بھی بابو عبدالحلیم انصاری کی لکھی ہوئی ایک بھی سطر نہیں ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ناطق گلاؤٹھی کی کتاب 'کلیل میں غلیل' میں 'کنز المطالب' کا اشتہار شائع ہوا تھا۔اس اشتہار میں دعوا کیا گیا ہے کہ کنزالمطالب اب تک کی سب سے اعلا اور بہترین شرح ہے۔اس شرح کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد کسی اور شرح کی ضرورت نہیں ہوگی۔یہاں تحقیقی نکتہ یہ ہے کہ اس اشتہار کو ناطق گلاؤٹھی نے خود شائع کرایا تھا یا ان کے کسی مداح یا ناشرِ کتاب نے شائع کیا تھا۔اس اشتہار کی زبان اور بیان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ 1968 میں کنزالمطالب کے شائع ہونے کے بعد دیوانِ غالب کی بہت سی شرحیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔اس لیے یہ کہنا کہ کنز المطالب کے شائع ہونے کے بعد کسی دوسری شرح کی ضرورت نہیں ہوگی، مبالغہ نہیں تو اور کیا ہے؟ 'کلیل میں غلیل' میں شائع اشتہار ملاحظہ کیجیے:

''کنزالمطالب شرح دیوان مروجہ غالب

مصنفہ

حضرت استاذ الاساتذہ فخر المتاخرین مرشد خم خانۂ سخن

مولانا ناطق گلاؤٹھی

زیرِ طبع ہے

جو عنقریب منصۂ شہود پر آنے والی ہے

یہ وہ شرح ہے جو شروح سابقہ کے حق میں ناسخ کا کام دیتی ہے۔غالب کے دیوان کی اب تک جتنی شرحیں شائع ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر شارح کی فہم کو دخل ہے۔مطلب، غالب کو نفسِ اشعار سے سمجھانے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔اس لیے اس کے مطالب سلجھنے کی بجائے اور زیادہ الجھ گئے ہیں۔حضرت ناطق گلاؤٹھی اردو کے مستند اہل زبان، مسلم استاد اور نکات شعری کے زبردست اور ماہر نقاد ہیں۔غالب نے جس تخیلِ بلند کے تحت شعر کہا ہے اور شعر میں جس نکتے کو اجاگر کرنا چاہا ہے، اس کی شان آپ کی اس شرح سے نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور دل میں بیٹھ جاتی ہے۔اس شرح کے بعد کسی اور شرح کی ضرورت نہیں رہتی۔لہٰذا ہم اس کو خاتم الشروح بھی کہہ سکتے ہیں۔اردو ادب اور شعر و سخن کے شائقین اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

ملنے کا پتا:

کوثر بک ڈپو، مینا چی کوئل اسٹریٹ، بنگلور'

محمد عبدالحلیم کی اطلاع کے مطابق 'کلیل میں غلیل' کی اشاعت 1950 اور مطبع برقی کوثر پریس بنگلور ہے [7]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اشتہار ناطق گلاؤٹھی کی مرضی کے بغیر شائع نہ ہوا ہوگا۔کیونکہ 'کلیل میں غلیل' کے دیباچے میں ابو صالح محمد غضنفر حسین شاکر ناطقی نے دعوا کیا ہے کہ یہ کتاب ناطق گلاؤٹھی کی ایما پر ہی 'برقی کوثر پریس، بنگلور' سے شائع ہو رہی ہے۔

ناطق گلاؤٹھی مرزا غالب کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔انھوں نے غالب کی زمین پر کئی غزلیں کہی ہیں۔انھوں نے غالب کی مشہور غزل۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

کی زمین میں مندرجہ ذیل تضمین لکھی:

سن لے، کہ جا رہا ہوں اَب اَپنی خبَر کو مَیں
لے زندگی سلام گیا عمر بھر کو مَیں
آپ اَور جنسِ دِل کے خریدار جی نہیں
پہچانتا ہوں صورتِ اہلِ نظر کو مَیں
ہر ذرّۂ وجود ہے دامَن کَشِ نَظر
بھاگوں صَنَم کَدہ سے تو جاؤں کِدھر کو مَیں
کب تک قدم قدم پہ الجھتا چلے کوئی
اَب راستہ بتا کے چلوں راہبر کا مَیں
رسمِ وفا، مصیبتِ ہستی، بجا درست
اچھا تو اَب سے عیب سَمجھ لوں ہنر کو مَیں
غارتگرِ شکیب جفا کار تابہ کے
آہوں سے چھین چھین کے رکھوں اثر کو مَیں
ناطق یہاں تو صبر و تحمل کا وقت ہے
غالب کے ساتھ بھیج نہ دوں نوحہ گر کو مَیں!

اس کے علاوہ انھوں نے اپنے کلام میں مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔

واہ رے حسنِ بیان، اللہ رے اندازِ کلام
میرزا غالب ہے ناطق، یوسفِ ثانی مجھے

'دیوانِ ناطق' کے صفحہ 211 پر 'خمسہ بر غزل مرزا غالب' عنوان سے تضمین شامل کی گئی ہے۔اس کا آخری بند ملاحظہ کیجیے۔

المدد اے تیغِ غم، سنگ شکستن المدد
کچھ گرفتاروں کی حد ہے کچھ گرفتاری کی حد
داغِ مایوسی ہزاروں، خارِ حسرت بے عدد
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم [8]

بہرکیف! ناطق گلاؤٹھی کی 'کنزالمطالب شرح دیوان غالب' میں آسان زبان کے ساتھ غالب کے اشعار کی شرح پیش کی گئی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ دیوانِ غالب کو سمجھنے کے لیے اس شرح کا مطالعہ ناگزیر ہے۔کیونکہ اس شرح کو 1926 میں ضرور لکھا گیا لیکن 42 سال کے بعد جب اسے شائع کیا گیا تو اس میں مولانا عبدالباری آسی کے مشوروں کے مطابق ضروری ترمیمات و اضافے کیے گئے۔اس شرح میں جہاں ایک جانب غالب کے اشعار کی شرح ہے وہیں غالب کے فن پر بھی ضروری بحث کی گئی ہے۔

حواشی:

1 دیوان ناطق، مرتبہ محمد عبدالحلیم، اشاعت اکتوبر 1976، ص 11
2 تذکرۂ معاصرین از مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اپریل 1972، ص 119
3 کنز المطالب: شرح دیوان غالب، فروری 1968، ص 5
4 تفہیم غالب، شمس الرحمٰن فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، چوتھا اڈیشن 2019، ص 18
5 روح المطالب فی شرح دیوان غالب (اردو) شارح سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، دسمبر 1967، ناشر: شیخ مبارک علی، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، پاکستان، ص 23
6 کنز المطالب: شرح دیوان غالب، فروری 1968، ص 6
7 دیوان ناطق، مرتبہ محمد عبدالحلیم، اشاعت اکتوبر 1976، ص 13
8 ایضاً، ص 211

Ibraheem Afsar
Ward No.:1, Mehpa Chauraha
Siwal Khas Meerut- 250501 (UP)
Mob.:9897012528

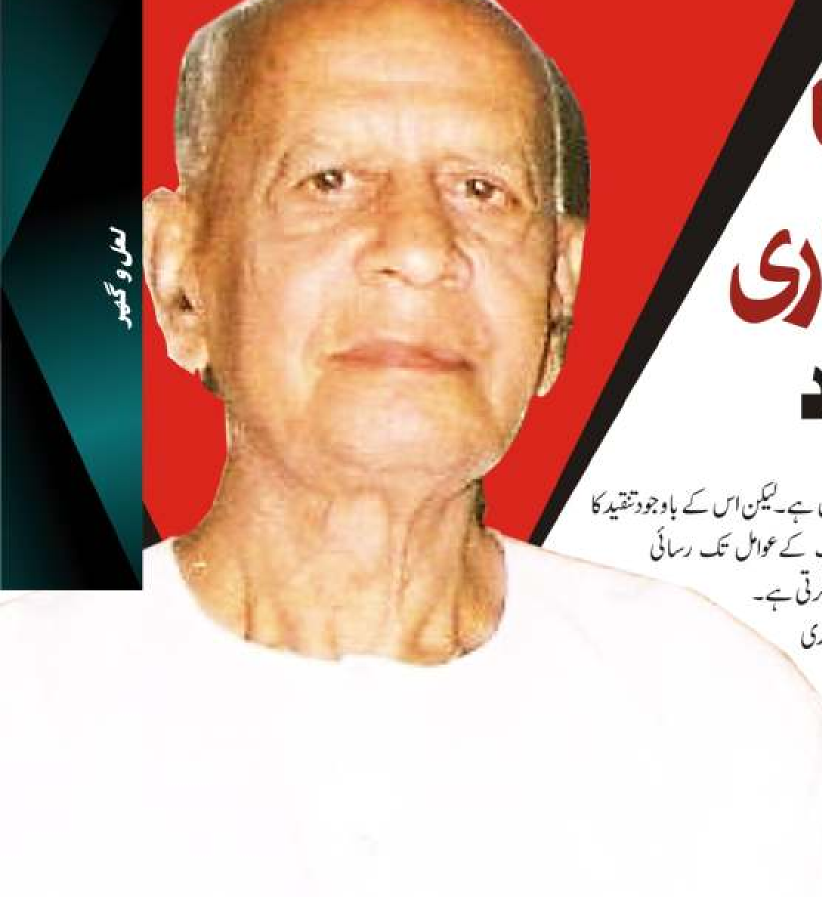

ندرانہ شفیع

اسلوب احمد انصاری بحیثیت ناقد

اردو ادب میں اسلوب احمد انصاری کی حیثیت ایک مستند ناقد کی ہے۔ وہ شاعری کے ہی نہیں فکشن کے بھی معتبر ناقد ہیں نیز ان کی ادبی صحافت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ انگریزی ادب کے استاد ضرور رہے ہیں مگر ان کی عمر اردو کے عظیم سرمایے کی تفہیم وتعبیر میں گزری۔

اسلوب احمد انصاری نے مغربی ادبیات کے علاوہ اردو کے تمام تر ادبی سرمایے کا گہرا مطالعہ کیا یہاں تک کہ فارسی اور عربی معیار نقد اور ادبیات سے بھی کسب فیض کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید پر ابھرے ہونے کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ وہ مغربی اور مشرقی روایت نقد کے مابین ایک خاص قسم کا اعتدال اور توازن رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری ان اہم ترین ناقدوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے نظریاتی تنقیدی مضامین میں اردو شعروادب کی تعیین قدر کے لیے عالمی سطح کے طے شدہ معیارات کی اہمیت اور ضرورت پر اصرار کیا۔ ان کا خیال ہے کہ ہر ادب کا ظہور کسی نہ کسی زبان کے وسیلے سے ہی ممکن ہے اور زبان سماجی اور ثقافتی صورت حال کی زائیدہ ہوتی ہے لہٰذا ادب کی تعبیر وتفہیم کے لیے اس سے متعلقہ تہذیبی وثقافتی نظام اور لوازمات کو جاننا ضروری ہے۔ مغربی ادبیات سے گہری وابستگی کے باوجود انھوں نے مغرب کی ادبیات اور معیار نقد کو مرعوب ہوکر یا فیشن زدگی میں اردو ادب پر منطبق نہیں کیا۔

اسلوب احمد انصاری نے تنقید کے نظری مباحث میں کسی تنقیدی نظریے یا رجحان کو یونہی قبول کرنے کے بجائے چھان پھٹک اور غور وفکر کو ترجیح دی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں نظریاتی نوعیت کے مضامین میں قدیم اور جدید ادبی رجحانات اور بہت سے تنقیدی زاویوں کی سائنٹفک انداز میں تعبیر وتفہیم کی گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شعروادب کے تجزیے سے جو عرفان وانکشاف کی منزلیں طے ہوتی ہیں ان کو کسی فارمولے یا نظریے کے تحت بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود تنقید کا کمال ہے کہ وہ ادب کے عوامل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اسلوب احمد انصاری کے ادبی اور تنقیدی سفر کا محاکمہ کریں تو اس کو کئی حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدا میں ان کے یہاں ترقی پسند نقطۂ نظر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کسی حد تک وہ اس سے ہٹ کر نفسیاتی طریقۂ کار اور تاثراتی نقطۂ نظر کو بھی عمل میں لاتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے اندر ایک واضح تبدیلی محسوس کی جانے لگتی ہے اور وہ ہیئتی دبستان اور نئی تنقید سے متاثر نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک موقف پر ڈٹے رہنے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان کی یہ تبدیلی ان کے سنجیدہ شعور، عمیق مطالعے، گہری ناقدانہ بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے مضمون 'اسلوب احمد انصاری کی تنقیدی فکر کا ارتقا' کا یہ اقتباس اس صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔

''... بعض مقامات پر ان کے ناقدانہ تصورات میں ترقی پسند نقطۂ نظر کی گونج بھی سنی جاسکتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا تنقیدی زاویۂ نگاہ کبھی بھی ترقی پسندی کے سکہ بند تصورات میں پوری طرح اسیر نہیں رہا۔ مگر ادب سے استفادہ کرنے کی کوشش ضرور کی۔''[1]

آگے لکھتے ہیں:

''تاہم ان کی نگاہ یہیں تک محدود نہیں رہتی۔ وہ سماجی اور سائنسی تنقید کی حتمیت پسندی کے حدود پر بھی سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں اور تنقید کے اس منصب سے غافل نہیں ہوتے کہ نقاد کو کس طرح اپنی پسند وناپسند سے بلند ہوکر تخلیقی عمل میں شامل عناصر کی نشاندہی میں مصروف رہنے کی ضرورت ہے۔''[2]

مزید آگے لکھتے ہیں:

''جب کہ صورت حال یہ ہے کہ وہ تخلیقی عمل کے بارے میں آرتھر کوئسلر اور بعض دوسرے ماہرین نفسیات سے اس طرح کسب فیض کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ تخلیقی عمل کے نہاں خانوں تک نقاد کی جزوی نارسائی کے اعتراف میں ذرا بھی تکلف محسوس نہیں کرتے۔''[3]

اسی بحث کے آخر میں انھوں نے اس امر کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ نئی تنقید کو اردو میں ایک روایت کے طور پر متعارف کرانے کا کام اسلوب احمد انصاری نے ہی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انگریزی تنقید میں آئی۔ اے۔ رچرڈ ان کے بعض تلامذہ اور ان کے بعد نئی تنقید کے بنیاد گزاروں نے متن کے عمیق مطالعے کی جو روایت قائم کی تھی۔ اردو میں اگر کسی نقاد نے اس روایت کو ایک رجحان میں کیا ہے تو وہ اسلوب احمد انصاری ہیں۔''[4]

یہ حقیقت ہے کہ اسلوب احمد انصاری نے تنقیدی مفروضات کو مسلم اور مستند سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ سیاق وسباق کے اعتبار سے اپنے معیارات پر نظرثانی کرتے رہے۔ کبھی مارکسی نقطۂ نظر کو قبول کیا تو کبھی تاثراتی تنقید کا سہارا لیا تو کبھی نفسیاتی تنقید کے طریق کار کو اپنانے کی کوشش اور بڑی حد تک سائنٹفک اور نئی تنقید کے عناصر کے اثرات سے بھی متاثر ہوئے اس سے ان کے تنقیدی

ذہن کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں وہ کھلے ذہن کے ایسے ناقد ہیں جنھوں نے عمومی قسم کے شعور وادراک پر اپنی تنقیدی تحریروں کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ ان کی تحریریں گہری بصیرت، کافی غور وخوض اور حساس ذہن کا پتہ دیتی ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کی تنقیدی تحریروں کے پیش نظر یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے نظریاتی اور اصولی بحثوں پر آغاز میں اور قدرے بعد تجزیاتی اور عملی تنقید سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔ اردو کے عام ناقدوں کی طرح بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے حتمی فیصلے صادر کرنے اور نتائج طے کرنے کے بجائے انھوں نے متن پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور متن کو ہی اپنے عمیق ترین مطالعے کا محور بنایا۔ ان کا یہ کمال ہے کہ اردو کے مختلف شعرا وادبا کے افکار اور فنی رموز کی تجزیاتی اور تقابلی طریق کار سے تعبیر وتفہیم کی۔ اس نوع کی ان کی تنقیدی تحریروں کا بڑا حصہ غالب اور اقبال کے متون پر مشتمل ہے اور ان دونوں شعرا میں بھی بالخصوص اقبال کی شاعری اور فکر کو ترجیح حاصل ہے۔ 'اقبال کی تیرہ نظمیں' اس اعتبار سے بے حد اہمیت کی حامل تصنیف ہے کہ اس کے ضبط تحریر میں آنے کے وقت تک اردو میں تجزیاتی طریق کار کو استعمال کرنے کا رجحان عام نہیں ہوا تھا۔ اقبال کی فکر اور شاعری پر ان کے کئی مضامین ہیں۔ انھوں نے اقبال کی غزلوں اور نظموں کے تجزیے بھی کیے ہیں اور شاعری کے سیاق میں ان کی فکر پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلوب احمد انصاری نے علامہ اقبال کے افکار وتصورات اور فن کے تمام تر پہلوؤں پر بحث کے سلسلے قائم کیے ہیں۔ افکار اقبال کے حوالے سے انھوں نے تصور خدا، تصور عشق، تصور فقر واستغنا، تصور خودی، حرکت وعمل، تصور کائنات، تصور جمال، نظریۂ تعمیر، مسئلہ وجود، نظریہ وجدان، نظریہ زمان ومکان، تصور حیات وممات، پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے علاوہ اقبال کی سیاسی بصیرت، مغرب کے مادی نظام پر ان کے نظریات، اسلام کے نظام اقدار اور روحانیت کو لے کر ان کے خیالات، سیکولرزم، سوشلزم، فاشزم اور دیگر رجحانات پر ان کی فکر کے تعلق سے بھی کھل کر اظہار خیال کیا۔ یہ تمام مباحث اقبال شناسی کے باب میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ اسی طرح کلام اقبال کے فنی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے علامت، استعارے کے تفاعل، پیکر سازی اور تجسیم، کردار سازی، ڈرامائیت اور خاص قسم کے اسطوری انداز کو ان کے کلام کا اہم ترین جزو بتایا۔ اس کے علاوہ وہ موسیقیت اور غنائیت کو بھی اقبال کے یہاں اہم گردانتے ہیں۔ ان کے لسانیاتی ڈھانچے کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں علامت اور استعارے کی معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے کلام اقبال میں اس کے مختلف زاویوں سے موجودگی کو فکر اقبال کی وسعت کا سبب بتایا ہے۔ جیسے کہ لالہ اقبال کے یہاں نمایاں علامتوں میں سے ایک ہے۔ جس پر اسلوب احمد انصاری نے دو مختلف اور غیر معمولی مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے لالہ کی علامتی معنویت اور کلام اقبال میں اس کے امکانات پر بحث کی ہے۔ اسی طرح وہ اساطیر کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور کلام اقبال میں اساطیر کا استعمال یا مکمل طور پر اساطیری پیش کش پر مبنی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نوع کے جائزے اقبال کو غیر رسمی اور منفرد انداز میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اسی طرح تصور خدا کے تحت انھوں نے اقبال کے تصور خدا کو ارتقا پذیر ثابت کرتے ہوئے بندہ اور خدا کے درمیان ایک ربط تلاش کیا ہے۔ یہاں وحدۃ الوجودی اور وحدت الشہودی نظریے کے ملے جلے اثرات سے ایک نئی صورت نکلتی نظر آتی ہے۔ جہاں دونوں کی ذات ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہوئے بھی بڑی حد تک ایک دوسرے میں پیوست بھی ہے۔ اسلوب احمد انصاری کا اقبال کے حوالے سے اصرار رہا ہے کہ وہ محض ایک شاعر یا محض ایک مفکر نہ ہو کر ایک مفکر شاعر ہے۔ انھوں نے ان تمام ناقدین کی رایوں کو سختی سے مسترد کیا جو اقبال کی فلسفیانہ شخصیت کو قبول کرتے ہیں اور ان کی شاعری پر ان کے تصورات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنے مختلف مضامین میں وہ مستقلاً اس مسئلے کو بار بار اٹھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے متعدد مثالوں اور متون اقبال کے حوالوں سے (باوجود خود اقبال کے بیان کے کہ وہ ان کو ایک مفکر یا فلسفی کے طور پر ہی سمجھا جائے) یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اردو کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم شعرا میں سے ایک ہیں اور ان کے کلام کی تفہیم وتعبیر کے لیے بذات خود ایک نئے تنقیدی مفروضے یا سانچے یا فارمولے کی ضرورت ہے۔ اقبال یا غالب جیسے شعرا کے لیے پہلے سے طے شدہ فارمولے کے تحت تعین قدر کرنا گمراہی اور ضلالت کا سبب ہوگا۔ انھوں نے اس امر پر توجہ دلائی کہ اقبال کی فکر اور ان کا فن ایک دوسرے کے اس حد تک معاون اور محتاج ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں اسلوب احمد انصاری کا یہ اقتباس درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اقبال فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک فلسفیانہ شاعر۔ ان کے فلسفے کی افہام وتفہیم ان کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو ادراک کی گرفت میں لانے میں بڑی حد تک ممد ومعاون ہیں اور اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی شاعر اس وقت تک عظیم کہلائے جانے کا مستحق نہیں، جب تک کہ وہ ایک بڑا مفکر نہ ہو۔ لیکن یہاں ہمارا سروکار مجرد فلسفے سے نہیں ہے بلکہ اس تفکر سے ہے جو اقبال کے عمومی مزاج اور شعری مزاج کا جزو لاینفک ہے۔''[5]

اقبال کے شاعرانہ امتیازات پر اظہار خیال کے علاوہ انھوں نے غالب کے ادبی معیارات، شاعرانہ قدر وقیمت پر بھی گفتگو کی ہے۔ غالب کے فکری تصورات کا جذبہ اور احساس میں ڈھل جانا، باضابطہ منظم فلسفے کا نہ ہونا اور اس کی وجوہات، کلام میں حسی پیکروں کی کارفرمائی، پیکر سازی کا عمل، استعارے کا تفاعل پر انھوں نے متعدد مضامین میں گفتگو کی ہے۔ یہ مضامین غالب شناسی کے باب میں نیا اضافہ ہیں۔

اسلوب احمد انصاری نے کلام غالب کے فنی محاسن کو نت نئے انداز اور مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعرانہ تدابیر کا حوالہ دیا ہے جس کے ذریعے غالب ایک جہان معنی تخلیق کر دیتے ہیں۔

استعارے کی بحث مغربی اور مشرقی معیار نقد کا مستقل حصہ رہی ہے۔ نئی تنقید نے اس بحث کو مزید اہمیت دی اور استعارے کے تفاعل پر خصوصی توجہ دلائی اور اسے فکر انگیز اور وسیع دائرہ کار پر محیط شاعری کے لیے بے حد اہم تصور کیا۔ اسلوب احمد انصاری نے بھی استعارے کے تفاعل کو اقبال اور غالب جیسے عظیم شاعروں کے کلام سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے استعارے کی اہمیت اور دائرہ کار کو گہرائی سے سمجھا ہے۔ غالب کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے استعارے کی اہمیت پر ان کا یہ اقتباس دیکھتے ہیں:

''استعارہ کی تخلیق وجود کی اس یگانگت پر مبنی ہے جو انسانی ذہن، اشیا کے درمیان اولین ردعمل میں محسوس ہوتا ہے اور اسی لیے استعارے کا کوئی سچا بدل تجویز نہیں کیا جاسکتا۔ بہ الفاظ دیگر استعارہ ایک مکمل اور قطعی بیان ہے۔ ایک طور سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مانوس اور جانی بوجھی اشیا کے درمیان جو چیز ارتباط پیدا کرتی ہے وہ استعارہ ہی ہے۔ اس کی بدیہی خصوصیت ایجاز اور جامعیت ہے۔''[6]

اسلوب احمد انصاری کا ایک تنقیدی امتیاز متن کی روشنی میں تقابلی انداز ہے وہ ایک زبان کے شاعر یا ادیب

کے تصورات وافکار اور فنی پہلوؤں کا دوسری زبان کے شاعر یا ادیب سے یا ایک ہی زبان کے دوشاعروں کا تقابل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی مضامین میں تقابلی تنقید کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ 'غالب اور اقبال' اور 'مومن اور غالب' مضامین ایک زبان کے دوشعرا کے مابین تقابل کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ 'اقبال اور بلیک' ایک زبان کا دوسری زبان کے شاعر اور کلام سے تقابل غیر معمولی اہمیت کا حامل تنقیدی مضمون ہے۔ ان مستقل مضامین کے علاوہ ان کے تمام تر تنقیدی مضامین میں دوران بحث تقابل اور موازنے کی صورتیں نظر آتی رہتی ہیں۔ وہ شیکسپیئر، گوئٹے، ایلیٹ، دانتے، بلیک، ورڈزورتھ کو اقبال اور غالب کے بالمقابل کھڑا کرتے ہیں اور بڑی فکر انگیز گفتگو کرتے ہیں۔ اردو میں اس نوع کے تقابل کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح وہ ٹامس ہارڈی، موپاساں چیخوف اور ایلیٹ جیسے فکشن نگاروں کو قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، شوکت صدیقی، مرزا ہادی رسوا اور نذیر احمد کے سامنے پیش کرتے ہیں اور حتمی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تصورات اور نظریات پر بحث کے دوران وہ برگساں، دانتے، گوئٹے، ابن العربی، مولانا روم، ڈیکارٹ، لاک، افلاطون، ارسطو، سارتر اور مارکس وغیرہ سے اقبال کے نظریات کا تقابل کرتے ہیں اور تفہیم وتعبیر کی نئی صورتیں تلاش کرتے ہیں۔ تجزیاتی صورت میں عملی تنقید کا ڈھلا ہوا یہ پہلو اسلوب احمد انصاری کے لیے تخصیصی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غالب اور مومن کے تعلق سے تنقیدی مضامین میں دونوں شعرا کی ایک خوبی نکتہ سنجی پر گفتگو کرتے ہیں جس کی ایک مثال ملاحظہ ہوں:

''مومن اور غالب کے یہاں جو عنصر مشترک ہے وہ نکتہ سنجی یعنی Wit کا استعمال ہے۔ برطانوی انشائیہ نگار ایڈیسن نے سب سے پہلے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ نکتہ سنجی دوطرح کی ہوسکتی ہے۔ ایک True Wit اور اس کے بالمقابل False Wit ان دونوں کا فرق ہی غالب کو مومن سے ممتاز کرتا ہے۔''7

اسلوب احمد انصاری کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ ان کی پہلی ترجیح صرف اور صرف اقبال ہیں۔ انھوں نے دلائل کی روشنی میں انھیں اردو کا بلکہ دنیا کا عظیم شاعر قرار دیا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی کہی جاسکتی ہے مگر اس امر سے انکار بھی کیا جاسکتا ہے کہ جہاں انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں اقبال کی خصوصیات اور امتیازات کو دوسروں کی خوبیوں پر فوقیت دی ہے۔ وہیں انھوں نے بعض مفکرین اور شعرا کو بعض خصوصیات کی بنا پر افضل بھی قرار دیا ہے۔ ان کا یہی انداز ان کو ایک بے لاگ اور معروضی ناقد کے طور پر پیش کرتا ہے۔ برگساں اور دانتے کے نظریات سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے دونوں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ان کے نظریات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک جگہ وہ دانتے اور اقبال کا تقابل کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جاوید نامہ کے شاعر کا شغف ان حوادثات اور کیفیات سے ہے جو کرۂ ارضی پر انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ مشرق ومغرب کی سیاست، قوموں کی تقدیر سازی کے پس پشت محرکات، خیر وشر کی باہمی کشمکش، اخلاقی ضابطوں کی بالا دستی، کفر وایمان کا تنازعہ اور انسانی خودی کے عشق کے وسیلے سے اثبات اور شعور ذات کی مختلف جہتیں یہی سب موضوعات ہیں جو اقبال کے لیے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں یہ تسلیم کرنے میں البتہ تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اقبال کے ہاں اشاریت کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے جتنا دانتے کے ہاں۔''8

اقبال اور غالب کے علاوہ ناصر کاظمی، شکیب جلالی، احمد مشتاق، شہر یار، افتخار عارف اور سید امین اشرف کے شعری کارناموں پر بھی انھوں نے تواتر کے ساتھ لکھا ہے۔ اس سے ان کی جدید شاعری کے منظر نامے سے گہری واقفیت اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری پر ان کا مبسوط اور وقیع مقالہ اردو تنقید کے باب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے شاعری کے علاوہ اردو فکشن کو بھی اپنی تنقید کا مرکز بنایا۔ احمد علی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری اور راجندر سنگھ بیدی پر تفصیلی مضمون کے علاوہ 'اردو کے پندرہ ناول' تصنیف سے وہ فکشن تنقید کو ایک نیا زاویہ اور اعتبار عطا کرتے ہیں۔ بقول شافع قدوائی:

'اردو کے پندرہ ناول' نے اردو ناول کی تنقید پر نہ صرف ایک نیا دریچہ وا کیا ہے۔ بلکہ یہ فکشن تنقید کا ایک نیا محاورہ اور معیار ومنہاج قائم کرتی ہے۔''9

اسلوب احمد انصاری کے تمام تر مضامین فکشن کی روایت، رسومات، اصول وضوابط پر عمیق مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی فکشن تنقید کا معیار بھی نہایت بلند ہے اور تنقید کی یہ صورتیں زیادہ تر عملی اور تجزیاتی ہیں۔ وہ پہلی بار اس جانب توجہ مبذول کراتے ہیں کہ 'باغ وبہار' کی تفہیم کے لیے اس کے اسطوری اپروچ سے واقفیت ضروری ہے۔ انھوں نے ان محاکمات پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ جن کی نوعیت Archetypal ہے۔ اسلوب احمد انصاری 'باغ وبہار' کے ایک مکمل حصے کو فنٹاسی کے مماثل بھی قرار دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے 'باغ وبہار' کا اس نوع کا مطالعہ فکشن تنقید کے باب میں نیا اضافہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلوب احمد انصاری توبۃ النصوح کو باقاعدہ اردو کا پہلا ناول قرار دیتے ہیں۔ کرداروں میں ابھرے پن کے باوجود اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔ 'امراؤ جان ادا' کو اودھ کی ثقافتی زندگی کا مظہر خیال کرنے کے بجائے انھوں نے اسے کرداری ناول قرار دیا ہے اور ناول میں مکالموں کی لسانی ساخت پر رک کر گفتگو کی ہے۔ 'میدان عمل' میں واقعات کے بہاؤ میں خلل اور بیانیہ کی منطق میں کمی کی بنا پر کمزور ناول قرار دیا ہے۔ وہ عزیز احمد کے ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' کا موازنہ ہارڈی کے ناول 'ریٹرن آف دی نیٹو' اور برونٹی کے ناول 'وودرنگ ہائیٹس' سے کرتے ہوئے تقابلی تنقید کی صورت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ناول میں موجود علامتوں اور استعاروں کو بھی بے حد اہم تصور کرتے ہیں اور ناول کے مجموعی تاثر کو ایک طرح کے ازالہ سحر سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ 'آگ کا دریا' میں وہ شعور کی رو کی تکنیک کے بجائے ایک نئی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جیسے وہ Shifting Identies کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے بلا تامل ناول کے تسامحات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اداس نسلیں، راجہ گدھ، کاروان وجود اور 'دشت سوس' میں پر اسراریت اور متصوفانہ تجربے کی اہمیت پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے فکشن کی تفہیم کے نئے گوشوں کو بڑی وضاحت سے تجزیاتی انداز میں اجاگر کیا ہے۔ شافع قدوائی کی یہ رائے اس مناسبت سے اس بحث کا تتمہ معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''...اسلوب احمد انصاری صاحب کی فکشن تنقید بیانیات Narratology کے نئے پہلوؤں سے آگاہی، مقدمات کی تدوین، نتائج کے استخراج اور متن سے براہ راست استنباط کے باعث فنی اور معنوی امکانات کی ایک نئی اور خیال انگیز دنیا کی خبر دیتی ہے اور اسلوب صاحب کو فکشن تنقید کا ایک معتبر نام عطا کرتی ہے۔''10

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلوب احمد انصاری اردو کے ایک بلند پایہ ناقد اور باذوق قاری ہیں جنھوں نے بے لاگ اور معروضی انداز میں اپنی تنقیدی تحریریں پیش کیں۔ اردو میں سائنٹفک انداز اختیار کیا۔ متن پر توجہ مرکوز رکھی۔ تجزیاتی اور تقابلی طریقہ کار کا استعمال کیا۔ نظریاتی تحریروں کے علاوہ عملی تنقید کے عمدہ نمونے پیش

کیے۔ اس نوع کا انداز اسلوب احمد انصاری سے قبل صرف کلیم الدین احمد کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر باقاعدگی سے اس مخصوص طریق کار کو تعبیر و تفہیم کے لیے مروج کرنے کا کام اسلوب احمد انصاری کا ہے۔ یہ ان کا اختصاص ہے کہ وہ بیک وقت نظری اور عملی تنقید سے سروکار رکھتے ہیں وہ اقبال شناس بھی ہیں اور غالب شناس بھی۔ انھوں نے شاعری کے تعلق سے جس قدر عمدہ تنقیدی تحریریں پیش کیں اسی قدر اعلیٰ سطح کی تحریریں فکشن تنقید کا بھی حصہ ہیں۔ وہ مشرق و مغرب کی روایت نقد میں ایک نوع کا توازن رکھنے میں بھی بے حد کامیاب رہے ہیں اور انھوں نے کسی مسلمہ رجحان کو خود پر یا اردو کی عظیم روایت پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

اسلوب احمد انصاری کی تنقید نگاری کا محاکمہ کریں تو چند باتیں وثوق سے کہی جاسکتی ہیں۔ ان کی تحریریں متن کی تعبیر اور تفتیش کے دوران سخت قسم کے محاسبے کے عمل سے گذرتی ہیں۔ ان کے یہاں جانب داری یا حمایت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ مجموعی طور پر ان کے تنقیدی رویے میں تجزیاتی انداز غالب ہے لہٰذا ہم اسلوب احمد انصاری کو نظری ناقد سے کہیں زیادہ عملی اور بالخصوص تجزیاتی ناقد قرار دے سکتے ہیں۔ ان کی تنقید ہمہ وقت تقابل اور توازن کے عمل سے بھی سروکار رکھتی ہے۔ لہٰذا ان کے یہاں تقابلی تنقید کا اختصاص قائم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم اسلوب احمد انصاری کو تقابلی نقاد کی صف اول میں رکھ سکتے ہیں۔ اقبال ان کا پسندیدہ اور خاص موضوع رہا ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ اقبال تنقید سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لوگ اقبال کے حوالے سے ان پر حمایت اور جانب داری کا الزام عائد کرتے ہیں ان کی رائے کو اس لحاظ سے قابل قبول نہیں قرار دیا جاسکتا کہ اسلوب احمد انصاری نے اقبال کی ان تخلیقات پر سخت رائے قائم کرتے ہوئے کمزور اور پست درجے کی نظموں میں شمار کیا۔ جو محض خطابت اور پند و موعظت تک محدود رہتی ہیں۔ ایسے مواقع پر وہ جواب شکوہ، مثنوی اسرار خودی و رموز بے خودی اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی اہم ترین نظموں میں فنی کوتاہیاں اور بے اعتدالیاں تلاش کرتے ہیں اور ان میں تخلیقیت کے عناصر نہ پائے جانے کے سبب کمزور نظموں میں شمار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''اقبال نے بعض ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں بڑی حد تک ایک بین، کھلی ہوئی اور واضح مقصدیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کا دائرہ اثر محدود ہے۔ ان کی دونوں مثنویوں اسرار اور رموز میں شاعری برائے نام اور نظم نگاری سرتاسر ملتی ہے۔ یہاں اقدار و نظریات کی تشریح اور وضاحت کی گئی ہے اور تاریخیت سے ان کا رشتہ جوڑا گیا ہے لیکن ان کی تحلیل اور انکشاف سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے۔''[11]

اسلوب احمد انصاری کا یہ کمال ہے کہ وہ اقبال کا صحیح معنوں میں دفاع کرتے ہیں۔ اقبال کو زمانے تک مذہبی شاعر کے زمرے میں رکھ کر ان کی شاعری کو غالب اور دیگر شعرا کے مقابلے کمتر قرار دیا گیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے اس مفروضے کو یکسر مسترد کیا اور مغربی و مشرقی روایت کو سامنے رکھ کر یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ دنیا کے عظیم شاعر جیسے کالی داس کی شکنتلا، ٹیگور کی گیتا نجلی، فردوسی کا شاہنامہ اور دانتے کی طربیہ خداوندی، ایسے عظیم فن پارے ہیں جن میں مذہبی فکر اور روحانی بصیرت موجود ہے اور ان کو اسی سبب استناد حاصل ہے۔ اسی طرح شیکسپیئر، ایلیٹ، ولیم بلیک، سوفو کلیز، ہومر، ملٹن، ورڈز ورتھ، ورجل اور گوئٹے وغیرہ کے یہاں روحانی بصیرت اور مذہبی فکر بے حد پختہ اور مستحکم نظر آتی ہے اور اس کو ان کے فن پاروں میں ایک خاص صفت کے طور پر تصور کیا جاتا ہے بلکہ یہ ان فن پاروں کی عظمت کی دلیل بھی ہے۔ انھوں نے اس امر پر اصرار کیا کہ اقبال کی خلاقیت اور انفرادیت کو وسیع تناظر میں اور عالم گیر روایت کے تسلسل میں دیکھنے کی ضرورت ہے تبھی اقبال کی صحیح معنوں میں تعبیر اور تفہیم ممکن ہے۔

اسلوب احمد انصاری یقین رکھتے ہیں کہ فن پارے کے اندر ہی متعین، واضح اور قابل اثبات معانی موجود ہیں لہٰذا ان کو دریافت کرنا اور اس کی قاری تک ترسیل کرنا ہی تنقید کا مقصد اولین ہونا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی تحریروں کا ایک مخصوص اسلوب رکھا جو معانی و نکات سے پُر، بے حد واضح اور مدلل تھا۔ ان کی تحریروں میں استحکام اور تیقن کی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بحث کے اختتام پر حتمی نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ ظاہری معنویت کو قبول کرنے کے بجائے معانی کی تہہ تک اترتے ہیں۔ لسانیاتی ڈھانچے کی ان کے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ وہ لفظوں کو ایک خاص تہذیبی سیاق میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ ان کی تحریریں متعین معانی اور نکات سے پُر ہوتی ہیں اور ان میں ایک نوع کی تنظیم اور ترتیب ہوتی ہے۔ ان کی بحث ایک وحدت میں ڈھل کر ابھرتی ہے۔ ان کا ایک بنیادی وصف معروضیت ہے اور انھوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ ان کی تنقیدی تحریروں کے مطالعے کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا یہ دعویٰ مبنی بر صداقت ہے۔ وہ 'اندازے' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''یہاں عمومیت یعنی Generalities پامال تراکیب یعنی Cliches بے عمل تزئین و آرائش یعنی غلو اور لفاظی سے احتراز برتا گیا ہے۔ ان کا کوئی شائبہ ان تحریروں میں نہیں ملے گا۔ فقرہ طرازی اور مہمل لفظیات کا استعمال اردو کے بیشتر نقادوں کا طرۂ امتیاز اور بین عیب ہے۔ اس تکیہ کلام کی جب چاٹ پڑ جاتی ہے۔ تو وہ پھر جیتے جی ساتھ نہیں چھوڑتی اور تنقید نگاری کی موزونیت اور وقعت کو مجروح کرتی اور نامعتبر بناتی ہے... ان مضامین میں راقم الحروف کا رویہ نہ Cantankerous یعنی جھگڑالو پن کا ہے اور نہ بلا وجہ طرف داری کا یعنی Discriminatory یہاں اعتدال، توازن اور حزم و احتیاط کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یعنی محاکموں تک پہنچنے کے لیے معروضیت برتنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔''[12]

انھوں نے ادب کے باذوق قاری کی طرح واحد متکلم کے صیغے سے بھی احتراز کیا ہے۔ اور یہی ان کی خوبی بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو اس قسم کی جانب داری اور تعلّی سے بچا لینے میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

حواشی

1 پروفیسر اسلوب احمد انصاری: نقاد اور دانشور، مرتبہ شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2008، ص 30
2 ایضاً، ص 31
3 ایضاً، ص 33-32
4 ایضاً، ص 51
5 اقبال حرف و معنی، اسلوب احمد انصاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1998، ص 214
6 نقش ہائے رنگ رنگ، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 1998، ص 11-110
7 ایضاً، ص 221
8 نقش اقبال، اسلوب احمد انصاری، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 1979، ص 132
9 پروفیسر اسلوب احمد انصاری: نقاد اور دانشور، مرتبہ شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2008، ص 132
10 ایضاً، ص 141
11 اقبال کی منتخب نظمیں اور غزلیں، اسلوب احمد انصاری، غالب اکیڈمی نئی دہلی، 1994، 6-5
12 اندازے، اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2008، پیش لفظ

■

Dr. Nazrana Shafi Mohd Shafi Hurra
Gund Jahanhir. Hajin
Bandipora - 193501 (J&K)
Mob.: 6005272845

شفیق جونپوری کی شعری جہات

محمد ارشد

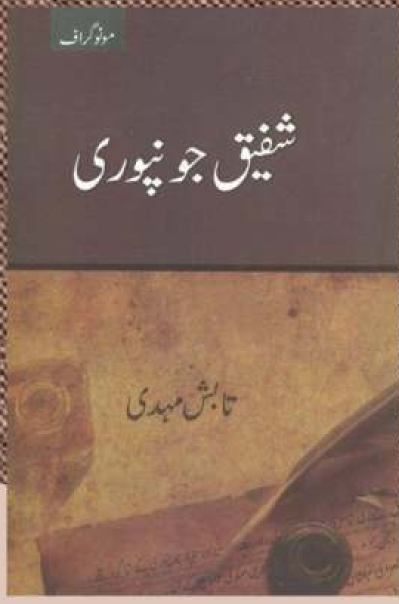

شفیق جونپوری 1902 کو جونپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انیق جونپوری ممتاز صوفی عالم دین آسی جونپوری کے پاس گئے۔ جنھوں نے شفیق کا نام 'ولی الدین' رکھا۔ شفیق جونپوری کی شخصیت اور ذہنی رویے پر اس کے واضح اثرات مرتب ہوئے۔ شفیق کی خالہ واحدہ خاتون شعروادب سے والہانہ ذوق رکھتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنا تخلص ہی 'پردہ نشیں' رکھا تھا۔ شفیق جونپوری کا بچپن انہی کی نگرانی میں گزرا۔ شفیق شاعر کے ساتھ ساتھ حافظ قرآن اور عالم دین بھی تھے۔ انھوں نے شاعری کے ابتدائی دور میں جونپور کے مشہور شاعر حکیم محمود نصیر سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد حفیظ جونپوری کے تلمذ میں آگئے۔ بعد میں نوح ناروی سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ 1925 میں حسرت موہانی کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شفیق جونپوری شعروادب کے باب میں بہت سنجیدہ تھے۔ گرچہ شعر گوئی کا عمدہ سلیقہ انھیں آگیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ وہ قصیدہ، تاریخی قطعات اور نعت ومنقبت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان اصناف سخن میں وہ والد محترم مولانا انیق جونپوری کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ شفیق نظم نگاری میں حالی، شبلی اور خاص طور اقبال سے بہت متاثر تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں کئی جگہ کیا ہے۔ اس مختصر معلومات سے قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ شفیق جونپوری شاعری میں کسی ایک صنف سخن تک محدود نہیں تھے۔ ایک غزل گو کے طور پر ان کو زیادہ شہرت ملی مگر دیگر اصناف سخن میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ شفیق جونپوری کا پہلا شعری مجموعہ بانگ جرس 1935 میں محسنی پریس جونپور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا مقدمہ کامل جونپوری نے لکھا تھا۔ بانگ جرس کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے علاوہ قطعات تاریخ اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اکیاون صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ خرمن عشق، نئے، شانہ، خرمن، سفینہ، طوبی، شفق، صبح کعبہ، اور فانوس کے نام سے ان کے مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔ پھول اور چراغ کے نام سے 1965 میں ان کے کلام کا ایک انتخاب بھی شائع ہوا۔ جسے سید محمد اقبال جونپوری نے مرتب کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ شفیق جونپوری کے چھوٹے بڑے تین درجن مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔

شفیق جونپوری شاعر کے ساتھ ساتھ نثر نگار بھی تھے۔ اپنے شعری مجموعوں کے دیباچے اور مقدموں سے ان کی نثر نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کی صحافتی سرگرمیوں سے ان کی پختہ نثر نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے خود ایک رسالہ ماہنامہ وحید العصر اور دوسرا رسالہ 'طارق' جاری کیا۔ اور پھر حسرت موہانی کے رسالے 'اردوئے معلیٰ' کے حلقۂ ادارت میں بھی شامل رہے۔ مولانا صبر شاہجہاں پوری نے روزنامہ 'مشیر' جب نکالا تو اس کے ایڈیٹر کے طور پر شفیق جونپوری کو طلب کیا۔ ان کے نثری کارناموں میں ان کی صحافت اور ان کے سفر حج بیت اللہ میں لکھے گئے دو سفرنامے قابل ذکر ہیں۔ شفیق کے سفرناموں میں حمد ونعت اور سلام وقصائد کثیر تعداد میں درج ہیں۔

شفیق جونپوری کا شمار بیسویں صدی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شہرت کا دارومدار شاعری میں علم وحکمت اور شعری وفنی کمالات کے اظہار میں مضمر ہے۔ جس نے

بھی ان کا کلام پڑھا یا سنا وہ ان کی شاعری کا گرویدہ ہوگیا۔اسی باعث لوگوں کے دلوں میں شفیق کی شاعری کے لیے عزت واحترام کا جذبہ مزید بڑھ گیا۔ان کے متعدد اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ وتابندہ ہیں۔اس ضمن میں کچھ مثالیں دیکھیے۔

کشتی کا ذمہ دار فقط نا خدا نہیں کشتی پہ بیٹھنے کا سلیقہ بھی چاہیے

خدا معلوم یہ شہرخموشاں کیسی بستی ہے زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

عشق کی ابتدا تو جانتے ہیں عشق کی انتہا نہیں معلوم

شفیق جونپوری ادب برائے زندگی کے شاعر ہیں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں وہ کبھی زمانی ہوتے ہیں کبھی مکانی اس لیے ادب کی تخلیق دونوں تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہونی چاہیے۔ان کا خیال ہے کہ جس طرح شے برائے شے کی ترکیب بے معنی ہے اسی طرح ادب برائے ادب اور شعر برائے شعر کا نعرہ بھی فضول ہے۔اس کا باقاعدہ اظہار انھوں نے اپنے شعری مجموعے فانوس کے مقدمے میں کیا ہے۔اس مقدمے سے شعروادب کے تئیں ان کے رویے اور رجحان کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

شفیق جونپوری کی شاعری ان کے گہرے سماجی شعور کی بھی آئینہ دار ہے۔ان کے بہت سے اشعار اس کی غمازی کرتے ہیں۔عصری حسیت پر مبنی یہ اشعار دیکھیں۔

تہذیب بھی ہے دور ترقی بھی ہے مگر انسانیت ہے آج کہاں کچھ نہ پوچھیے

کیا اسی کا نام ہے دور ترقی اے شفیق جگمگاتے ہیں در و دیوار دل بے نور ہیں

شفیق جونپوری مشرقی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے۔جس کے عوض انھیں ’شاعر مشرق‘ کے خطاب سے نوازا گیا۔ان کے اشعار میں بھی مشرقی تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

سر پہ گاگر لیے جاتی ہے جو پنگھٹ کی طرف میری جانب سے اسی دختر دہقاں کو سلام

وہ میرے ساتھ ہر تتلی کے پیچھے دوڑنا ان کا وہ بچپن کی کہانی یاد آتی ہے کئی دن سے

مٹنے دوں گا نہ شفیق اپنے کھنڈر کے آثار پھر بنانا ہے اسے جنت معمور مجھے

شفیق جونپوری اشتراکی فکر وخیال کے مخالف تھے۔انھوں نے اپنی متعدد نظموں اور غزلوں میں اس نظریۂ فکر کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ’سچی اشتراکیت‘ ’کمیونسٹ شاعر اور تاج محل‘ ’کمیونسٹ دوست سے خطاب‘ اور ’گندم نما جو فروش‘ جیسی نظمیں اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظریے کے ادیبوں میں کبھی وہ پسند نہیں کیے گئے بلکہ ایک طرح ان کی شاعری کو طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ان کی غزلوں اور نظموں میں متعدد اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں اشتراکی نظریۂ فکر کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

مثال کے طور پر ’نظم تاج محل‘ کا ایک بند دیکھیے۔

قاعدہ یہ ہے کہ ہر دور کے آثار حیات دیکھے جاتے ہیں اسی دور کی تہذیب کے ساتھ

قصر و ایواں پہ ہو جب عظمت اقوام امم مقبرہ کیوں نہ ہو ممتاز محل کا ممتاز

قوم پر شاہ جہاں کا یہ کم احسان نہیں کہ مسلمان فن تعمیر میں پیچھے نہ رہا

دیکھ کر تاج محل کے در و دیوار کی شان قوم کو حق ہے کرے عظمت اسلاف پہ ناز

اسی طرح غزل کا شعر ملاحظہ ہو۔

جو تجھ سے خوش نہیں تیرا نہ ہو سکا یا رب بھلا اسے ترے بندوں کا درد کیا ہوگا

شفیق ایک روایت پسند شاعر ہیں لیکن روایت پسندی میں وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے۔اگرچہ وہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں متعدد شعرا سے متاثر رہے اور ان کی طرز پر انھوں نے اشعار بھی کہے، لیکن بعد میں انھوں نے اپنی راہ خود نکالی، جس کا اظہار بھی انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

اغیار کی تقلید نہیں مجھ کو مناسب میں سب سے الگ راہ گزر کیوں نہ بناؤں

شفیق اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں اقبال سے متاثر تھے۔کبھی کبھی وہ خود کو اقبال کے رنگ وآہنگ والا شاعر گمان کرتے ہیں جس بات کا اظہار انھوں نے فخریہ طور پر کیا ہے:

خدا رکھے شفیق جونپوری کو زمانے میں اٹھا اقبال تو یہ دوسرا دانائے راز آیا

ہماری خود پسندی غیر کی تقلید کیا جانے ہم اے اقبال! تیری پیروی پر ناز کرتے ہیں

شفیق جونپوری کا نظریۂ محبت بھی جداگانہ ہے وہ مانتے ہیں کہ محبت جتنی بلند اور پاکیزہ ہوگی، اتنا ہی بلند و پاکیزہ تغزل ہوگا۔اور دل پر اس کا اثر دیرپا ہوگا۔وہ اپنے اشعار کی نوک پلک اسی محبت کے سانچے میں ڈھال کر سنوارتے اور نکھارتے ہیں۔اس بات کو نثر میں انھوں نے اس انداز سے بیان کیا ہے:

’’اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے محبت جتنی ہی بلند پیش کی جائے گی، تغزل اتنا ہی بلند و باکیف ہوگا اور وہ اظہار نیازمندی جو عاشق کی طرف سے ہوتا ہے تمام دیوانگیوں کا حاصل ہے جس کا خلوص حقیقتاً عظمت عشق ہے۔بشرطیکہ عشق عشق ہو۔‘‘ (شفیق جونپوری شخصیت وفن، ایس ایم عباس، ص، 186)

شفیق جونپوری اشتراکی فکر وخیال کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں اور غزلوں میں اس نظریہ ’فکر کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ سچی ’اشتراکیت‘ ’کمیونسٹ شاعر اور تاج محل‘ ’کمیونسٹ دوست سے خطاب‘ اور ’گندم نما جو فروش‘ جیسی نظمیں اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظریے کے ادیبوں میں کبھی وہ پسند نہیں کیے گئے بلکہ ایک طرح ان کی شاعری کو طنز کا نشانہ بنایا گیا۔

شفیق جونپوری اپنی شاعری میں محبوب کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے، ان کے اشعار میں عاشق ومعشوق کے رشتے کی پوری پاسداری ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں محبوب کے عزت واحترام کا جذبہ دوسرے شعرا کے مقابل زیادہ نظر آتا ہے۔ان کی شاعری میں پیش کردہ تصور محبت انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز بناتا ہے۔انتخاب غزلیات ’شفیق جونپوری‘ میں راجندر بہادر موج نے شفیق کی شاعری میں محبوب کے تصور پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’شفیق کی غزلیات میں شان تغزل بھی ہے، بے ساختگی بھی ہے اور رواں بھی مگر ان کے محبوب کے ہاتھوں میں خنجر نہیں ہے وہ حسن وعشق کا وقار قائم رکھتے ہیں اور وصل و ہجر دونوں کے اظہار میں دامان ادب کبھی نہیں چھوڑتے وہ شکوہ بھی کرتے ہیں تو احترام کے ساتھ‘‘ [انتخاب غزلیات شفیق جونپوری، راجہ بہادر موج، اتر پردیش اردو اکادمی، 1989]

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں۔

دامن سے بھی نہ تم نے لپٹنے دیا کبھی ہم نے اسی امید میں مٹی خراب کی

تمھی نے زندگی بخشی تھی ہم کو تمھی پر زندگی ہم نے لٹادی

خفا تم تھے تو دشمن چاندنی تھی میری قسمت میں تنہائی لکھی تھی

اس طرح کے اشعار شفیق کی شاعری میں ورق در ورق درج ہیں۔شفیق جونپوری کا ماننا ہے کہ رو لینے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔اور دماغ کو سکون محسوس ہوتا ہے۔عام

شفیق جونپوری کی شاعری میں موضوعات کا تنوع، تغزل و شعریت کی فراوانی اور آفاقیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔وہ قدیم فنی و شعری اقدار سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اقدار کے حامی ہیں۔ان کی شاعری زندگی کے تمام تر تقاضوں کی آئینہ دار ہے۔ شاعری میں ان کا اپنا خاص لہجہ ہے جس کو بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری میں آفاقیت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔غالباًاسی سبب ان کی پذیرائی ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ان کی شاعری کے امکانات روشن رہیں گے۔

طور پر آنسو غم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ آنسو اور غم کے اس رشتے کو شفیق جونپوری نے کیا خوب نفسیاتی انداز میں بیان کیا ہے۔

آنسوؤں سے غم کی زینت ہو گئی
رو لیے تو دل کو راحت ہو گئی

کبھی کبھی شعری حد بندیوں میں رہ کر شعر بے لطف و بے مزہ ہو جاتا ہے اور اس کا پیغام ترسیل بے معنی و بے سود ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس کبھی کبھی فنی لغزشیں شعر میں حسن پیدا کر دیتی ہیں کہ سننے والے کی زبان سے بے ساختہ داد نکلتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس لغزش میں ایک کیفیت ہو اور وہ کیفیت سامع کے کان میں سرور بھر دے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔

فریاد پہ ، فریاد پہ، فریاد کروں گا
بے داد پہ ، بے داد پہ، بے داد نہ کرنا

مذکورہ شعر میں الفاظ کی تکرار کے ذریعے صوتی آہنگ سے مزید غنائیت اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

متروک الفاظ کے سلسلے میں بھی شفیق جونپوری کا خاص نظریہ ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر متروک الفاظ سے شعر میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہو تو ان کا استعمال درست ہے چونکہ کچھ الفاظ متعدد خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں جن کے استعمال سے شعر کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن مزید دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کا استعمال شاعری میں درست ہے۔ جیسے لفظ 'نے' بمعنی 'نہ' مدت سے متروک شمار کیا جاتا ہے لیکن شفیق جونپوری نے بڑی خوبصورتی سے اپنی شاعری میں متعدد جگہ اس کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر دیکھیے۔

مغنی کا ترانہ نے صدائے مطرباں سنیے
دل مظلوم کی فریاد بے کس کا فغاں سنیے

بیسویں صدی میں غزل کے بارے میں یہ خیال عام سمجھا جاتا تھا کہ اس میں صرف عاشق و معشوق کی باتیں ہوں گی۔ چونکہ دیگر مضامین اور خیالات سے غزل کی روح مجروح ہوتی ہے۔ لیکن شفیق جونپوری نے بڑی بے باکی و جرأت مندی سے دیگر مضامین کو اس ہنرمندی سے باندھا ہے کہ غزل کے تغزل میں مزید دلکشی پیدا ہو گئی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کے مضامین دیگر شعرا کے یہاں بھی اکثر و بیشتر مل جاتے ہیں۔ لیکن شفیق جونپوری نے شعری نقطۂ نظر کو اپنی غزلوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ غزل اپنی تمام تر قدروں کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی قاری کے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔

یہ کہہ کر شمع ساری رات تنہائی پہ روئی ہے
کہ یارب روشنی دی ہے تو پروانوں کی محفل دے

میرے آزاد تصور! تیری وسعت کو سلام
تو بھی ہوتا ہے اسیر قفس و دام کہیں

اردو شاعری میں شیشہ و ساغر، جام و پیمانہ، رند و ساقی جیسے الفاظ کا علامتی استعمال اکثر شعرا کے یہاں مل جاتا ہے۔ لیکن شفیق جونپوری نے ان الفاظ کو قدرے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ اس بات کا اندازہ ذیل میں دی گئی مثالوں سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ساغر و مینا پہ رونق پھر نہ آئی میرے بعد
میرے ساقی نے بہت محفل سجائی میرے بعد

نہ صراحی، نہ سبو اور نہ ساغر دینا
رند خطرے میں ہے ساقی مجھے خنجر دینا

اگر ساقی مجھے آنے نہیں دیتا نہ آنے دے
ذرا دیکھوں تو کیوں کر میکدہ آباد ہوتا ہے

مزہ کیا اعتماد غیر پر پینے پلانے کا
جہاں جاتا ہوں اپنا جام و ساغر لے کے جاتا ہوں

امید ایک ایسی دھند ہے جو صاف دکھتی بھی نہیں اور چھپتی بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی دنیا اس کے سہارے چل رہی ہے۔ کوئی انسان اپنا سب کچھ گنوا دے اور اس کے پاس کچھ نہ بچے تب بھی امید اس کا آخری سہارا ہوتی ہے، جس کے سہارے وہ اپنی زندگی کے مستقبل کو دیکھتا ہے۔ ایک شاعر کے پاس بھی بس یہی امید کی دولت ہوتی ہے جس کے سہارے وہ خود کو زندہ رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی لیے ہجر کی طویل راتوں میں بھی اسے سرمئی صبح کی امید نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں فیض احمد فیض کا یہ شعر دیکھیں۔

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

اسی مضمون کو شفیق جونپوری نے بھی بیان کیا ہے۔

مایوسیوں کو پاس نہ آنے دے آدمی
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

شفیق جونپوری کی شاعری کی اہم خصوصیت رجائیت ہے۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ ذہنی طور پر اتنے مضبوط ہیں کہ ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوتے۔ امید و امکان کی دنیا وہ ہمیشہ آباد رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں زاہد، ناصح وغیرہ پر اکثر شعرا نے اشعار کہے ہیں۔ جن اشعار کی نوعیت اکثر طنزیہ ہی رہی ہے۔ شفیق صاحب نے بھی اس میں طبع آزمائی کی، اور اپنے اشعار میں حقیقت پسندی کا اظہار کیا، جو حقیقت آج کے کچھ زاہدوں پر بھی صادق آتی ہے۔

شفیق ان زاہدان شہر کو پہچانتا ہوں میں
برستا ہے تقدس منہ پہ دل چالاک ہوتا ہے

شفیق جونپوری کی شاعری میں موضوعات کا تنوع، تغزل و شعریت کی فراوانی اور آفاقیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ قدیم فنی و شعری اقدار سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اقدار کے حامی ہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے تمام تر تقاضوں کی آئینہ دار ہے۔ شاعری میں ان کا اپنا خاص لہجہ ہے جس کو بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں آفاقیت کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ غالباً اسی سبب ان کی پذیرائی ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ان کی شاعری کے امکانات روشن رہیں گے۔

مراجع و مصادر

1 شفیق جونپوری شخصیت و فن، ایس ایم عباس، ہندوستان پرنٹرس ممبئی، 1983
2 انتخاب غزلیات شفیق جونپوری، راجہ بہادر موج، اتر پردیش اردو اکادمی، 1989
3 پھول اور چراغ، انتخاب کلام، شفیق جونپوری، مرتب، سید اقبال احمد علمی الیکٹرک مشین پریس بنارس، 1965
4 شفیق جونپوری ایک مطالعہ، ڈاکٹر تابش مہدی، ادبیات عالیہ اکادمی، جامعہ نگر نئی دہلی، 2002

Mohd Arshad
502/122, Tegore Marg, Near Shabab Market
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.: 8948578605

سید امتیاز حسن

مادری زبان اردو — کل آج اور کل

ایک شماریاتی تجزیہ

زبان انسانی رابطے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے جو معلومات، خیالات اور احساسات کو ایک شخص سے دوسرے تک منتقل کرنے میں مدد ومعاون ہے۔ معاشرے میں زبان کی بہت اہمیت ہے۔ پورے عالم میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں اور اکثر ایک شخص مختلف زبانیں بھی بول سکتا ہے لیکن ہر شخص کی لیے مادری زبان ایک الگ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے ہم اپنی سوچ، احساسات اور خیالات کو ایک مخصوص شکل بآسانی دے سکتے ہیں۔ مادری زبان سے مراد بچپن میں گھر میں سیکھی جانے والی پہلی زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو عام طور پر ایک بچے کو اپنی پیدائش کے بعد گھر کے دیگر افراد سے سننے کو ملتی ہے اور عموماً گردونواح میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے موثر نتائج کے لیے یہ بہت اہم ہو جاتا ہے کہ اہم پیغام مادری زبان میں عام و خاص کے لیے دستیاب ہوں۔ نیلسن منڈیلا، جنھوں نے جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف کافی جدوجہد کی اور پھر جنوبی افریقہ کے پہلے صدر بھی رہے، کا ایک مشہور قول ہے:

''اگر آپ کسی انسان سے اس زبان میں بات کرتے ہیں جسے وہ سمجھتا ہے، تو یہ اس کے دماغ میں جاتا ہے۔ اگر آپ اس سے اس کی اپنی زبان میں بات کرتے ہیں تو یہ اس کے دل میں اتر جاتا ہے۔''

دنیا میں اردو کی مقبولیت

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، پوری دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن صرف چند ہی زبانیں ایسی ہیں جس نے طویل عرصے تک وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل کی ہے۔ اردو ان میں سے ایک ہے۔ اتھنولوگ (Ethnologue) کی تازہ ترین اشاعت کے مطابق، اردو دنیا کی دسویں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے، جس کے کل بولنے والوں کی تعداد لگ بھگ 23 کروڑ (231 Millions) ہے، جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسے دوسری زبان کے طور پر بولتے ہیں۔[1] اتھنولوگ ایک سالانہ حوالہ جاتی اشاعت ہے جو دنیا کی زندہ زبانوں کے اعداد وشمار اور دیگر معلومات فراہم کرتی ہے۔ اردو جنوبی ایشیا کی ایک مقبول زبان ہے اور خلیج کے علاوہ برطانیہ، امریکہ، فرانس، جرمنی اور دیگر ممالک میں بھی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ دنیا کی مقبول ترین دس زبانوں کو اتھنولوگ کے فراہم کردہ ڈیٹا کے مطابق بار گراف کے ذریعے تصویر 1 میں دکھایا گیا ہے۔

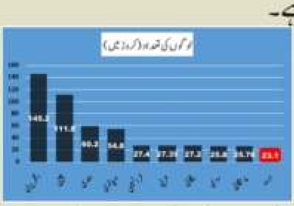

تصویر 1: دنیا کی مقبول ترین دس زبانیں (ماخذ 1)

ہندوستان اور مادری زبان اردو

رجسٹرار جنرل اور مردم شماری کمشنر، ہندوستان، وزارت داخلہ، حکومت ہند کے دفتر کے شائع کردہ اعداد و شمار (Indian Census 2011) کے مطابق، اردو ہندوستان میں ساتویں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے اور صرف ہندوستان میں ہی پانچ کروڑ سے زائد افراد (Numbers= 50725762) کی مادری زبان اردو ہے[2,3]۔ تصویر 2 مذکورہ بالا حکومت ہند کے اعداد وشمار کے مطابق ہندوستان کی دس سب سے زیادہ استعمال ہونے والی مادری زبانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

تصویر 2: ہندوستان کی مقبول ترین دس زبانیں (ماخذ: 2,3)

مندرجہ بالا حقیقت کی تشریح ان الفاظ میں بھی کی جا سکتی ہے کہ اردو ہندوستان کے تقریباً 4.19 فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اگر ہم مزید دیہی اور شہری کے لحاظ سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ دیہی اور شہری آبادی جن کی مادری زبان اردو ہے بالترتیب 2.10 اور 2.96 کروڑ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دیہی اور شہری اردو بولنے والوں کا تناسب بالترتب، 42 اور 58 فیصد ہے۔ یہ دیہی شہری تغیرات عام معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اس کا مزید تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک نمایاں فرق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

- دیہی شہری آبادی کا تناسب بالترتیب 69 بمقابلہ 31 فیصد ہے۔
- اس کا مطلب ہے کہ دیہی آبادی شہری آبادی سے دوگنی سے بھی زیادہ ہے۔
- اس کے باوجود کہ دیہی آبادی دوگنی سے بھی زیادہ ہے، شہروں میں اردو بولنے والوں کی تعداد گاؤں میں اردو بولنے والوں کی تعداد سے 16 فیصد زیادہ ہے۔

اگر اوپر کے پہلوؤں پر غور کیا جائے تو دیہی شہری اردو بولنے والے فیصد کی تقسیم بالترتیب 2.53 بمقابلہ 7.85 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیہی لوگوں کی فیصد جن کی مادری زبان اردو ہے شہروں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ براہ کرم تصویر 3 پر ایک نظر ڈالیں۔

تصویر 3: ہندوستانی مادری زبان اردو: دیہی بمقابلہ شہری (ماخذ 2,3)

ایسا کیوں ہے؟ ہندوستان کے دیہاتوں میں اردو کی کم مقبولت (کی وجوہات کیا ہیں؟ کیا یہ تعلیم کی وجہ سے ہے یا کسی اور وجہ سے؟ کیا اس حقیقت کے ساتھ ہم اردو کو عام آدمی کی زبان کہہ سکتے ہیں؟ یا یہ صرف مدارس، ادب اور ثقافت کی زبان ہے؟ جیسا کہ مہاتما گاندھی کا قول ہے ''ہندوستان کی روح اپنے گاؤں میں بستی ہے۔'' کیا اردو گاؤں کی روح بنے بغیر ہندوستان میں زندہ رہ پائے گی؟ ہم یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ اردو ایک شہری زبان

ہے۔اردو کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیں ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم وجوہات تلاش کرنے اور مذکورہ مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو دیہاتوں میں بھی اردو کو بڑے پیمانے پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ سوالات سماجی سائنس اور سیاسیات کے محققین کے لیے چھوڑتا ہوں۔ کمپیوٹر سائنس کے محقق ہونے کے ناطے، مذکورہ بالا سوالات کے جوابات تلاش کرنا اس مضمون کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔

اردو اور ہندوستانی ریاستیں

اردو ہندوستان کے آئین میں تسلیم شدہ 22 سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے۔ آبادی کے نقطہ نظر سے دس سب سے زیادہ اردو بولنے والی ریاستیں (تعداد کی گھٹتی ہوئی ترتیب میں) مندرجہ ذیل ہیں:

اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر، آندھرا پردیش (بشمول تلنگانہ)، کرناٹک، جھارکھنڈ، مغربی بنگال، تمل ناڈو، مدھیہ پردیش، دہلی

تصویر 4: پانچ سب سے زیادہ اردو بولنے والی ریاستیں (کل آبادی کے لحاظ سے۔ ماخذ 2,3)

اگر ہم ریاست کے اندر کی کل آبادی کے لحاظ سے ان لوگوں کی فیصد دیکھیں جن کی مادری زبان اردو ہے، تو کرناٹک 10.83 فصد کے ساتھ پہلے نمبر پر ہے اور اس کے بعد فیصد کے گھٹتے ہوئے ترتیب میں آندھرا پردیش، بہار، مہاراشٹرا، جھارکھنڈ کا نمبر آتا ہے۔ جبکہ اتر پردیش 5.42 فصد آبادی کے ساتھ چھٹے نمبر پر ہے۔ مثال کے طور پر بہار میں اردو بولنے والی آبادی 8.42 فیصد ہے، کیونکہ بہار میں اپنی مادری زبان کے طور پر اردو استعمال کرنے والے لوگوں کی تعداد 8770002 کے برابر ہے جبکہ بہار کی کل آبادی 104099452 ہے۔

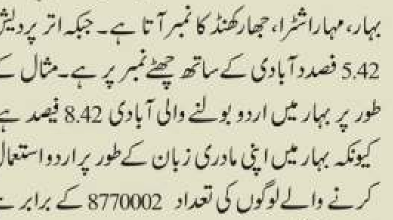

تصویر 5: دس ریاستوں کی اردو آبادی کا فیصد (ماخذ 2,3)

آزاد ہندوستان کی مردم شماری اور اردو کا مستقبل

ہندوستان کی مردم شماری کی تاریخ 130 سال سے زیادہ پرانی ہے، جس کا آغاز 1872 میں ہوا جب یہ پہلی بار برطانوی دور حکومت میں کرائی گئی۔ آزادی کے بعد، اس کی ذمے داری حکومت ہند کے رجسٹرار جنرل اور مردم شماری کمشنر، وزارت داخلہ کو سونپی گئی۔ آزاد ہندوستان کی پہلی مردم شماری سال 1951 میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ عام طور پر ہر 10 سال بعد کرائی جاتی ہے۔ آخری مردم شماری سال 2011 میں ہوئی تھی۔ (4,5)

دستیاب اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادری زبان اردو بولنے والی آبادی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن مختلف سینسس ڈاٹا سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سال 2001 کے مقابلے میں سال 2011 میں اردو بولنے والوں کی آبادی میں معمولی کمی آئی ہے۔ 2001 میں یہ آبادی 5.15 کروڑ تھی جب کہ سال 2011 میں گھٹ کر 5.08 کروڑ رہ گئی۔ (براہ مہربانی تصویر 6 رجوع کریں)۔

تصویر 6: آزاد ہندوستان کی مردم شماری کے اعداد و شمار پر مبنی اردو آبادی کا گراف (ماخذ 2,3,6,7)

یہ بھی واضح رہے کہ ملک کی مجموعی آبادی میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا، اردو آبادی میں یہ بتدریج اضافہ ملک کی مجموعی آبادی میں اضافے کی محض ایک عکاسی ہے۔ درحقیقت سچ یہ ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے ان کا فیصد مسلسل کم ہو رہا ہے۔ بالخصوص، 2001 سے 2011 کے درمیان یہ تعداد 5.01 سے کم ہو کر 4.19 فیصد رہ گئی ہے۔ مذکورہ بالا حقائق کو مختلف شائع شدہ ذرائع سے (2,3 6,7) اخذ کیا گیا ہے اور مرتب کیا گیا ہے اور پھر آپ کے حوالہ کے لیے گراف کے طور پر تصویر 6 میں پیش کیا گیا ہے۔

نتائج اور مباحثہ

مندرجہ بالا حقائق اور اعداد و شمار کے تجزیے کے بعد مندرجہ ذیل مشاہدات کیے جا سکتے ہیں:

- اردو دنیا کی دسویں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے اور اردو زبان کو وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل ہے۔
- اردو ہندوستان میں ساتویں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی مادری زبان ہے۔
- دیہی لوگوں کی فیصد جن کی مادری زبان اردو ہے، شہروں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔
- اگرچہ اتر پردیش میں سب سے زیادہ اردو آبادی ہے، لیکن ریاست کے اندر اردو بولنے والوں کی فیصد آبادی کے لحاظ سے، یہ چھٹے نمبر پر ہے۔
- ریاست کے اندر اردو بولنے والوں کی فیصد کے لحاظ سے کرناٹک پہلے نمبر پر آتا ہے۔ اس کے بعد آندھرا پردیش (بشمول تلنگانہ) اور بہار آتا ہے۔
- ہندوستان کی کل آبادی کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔
- لیکن ملک کی کل آبادی کے لحاظ سے اردو بولنے والوں کی فیصد مسلسل کم ہو رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا حقائق کی بنیاد پر ہم اردو کے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کر سکتے ہیں؟ خاص طور پر ہندوستانی تناظر میں؟ کیا یہ ایسی زبان ہے جو ہمیشہ موجود رہے گی یا وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے گی؟ دلائل دونوں سمتوں میں ہو سکتے ہیں۔ پرامید ہونا اچھی بات ہے، لیکن ہم حقائق کو نظرانداز بھی نہیں کر سکتے۔ ہم آنے والے خاموش خطرات اور غیر یقینی صورت حال کو اپنا کر شترمرغ کی طرح ریت میں ڈال کر یہ نہیں مان سکتے کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پرامیدی کے ساتھ ساتھ ہمیں ڈیٹا کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی، کیونکہ ڈیٹا کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور ڈیٹا ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں جس بات کا ذکر کر رہا ہے وہ تسلی بخش ہو سکتا ہے، لیکن حوصلہ افزا تو بالکل نہیں ہے۔

مندرجہ بالا نتائج کو ایک جملے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''ہندوستان میں اردو عمر دراز ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور بھی ہوتی جا رہی ہے اور اردو کو مؤثر و ترقی پسند اقدامات کی ضرورت ہے تا کہ عمر بڑھنے کے باوجود اردو اپنی توانائی برقرار رکھ سکے۔''

■

Dr. Syed Imtiyaz Hassan
Associate Professor & Head,
Dept of Computer Science & Information Technology,
(Maulana Azad National Urdu University)
Central University)
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.: 9811584058

شہناز رحمن

جن کتابوں نے متاثر کیا

کتابیں عادتاً، شوقیہ یا ضرورتاً پڑھی جاتی ہیں یہ ایک عمومی رویہ ہے لیکن کسی کتاب کے حوالے سے پسند، ناپسندیدگی یا کسی طرح کے تاثرات کا اظہار ذاتی عمل ہے۔ کسی کو اس ذاتی عمل میں اس امید پر شریک کرنا کہ وہ بھی اس کی طرف راغب ہوگا، یہ خیال بہت امید افزا تو نہیں مگر ایسے حالات میں جب انٹرنیٹ کی عطا کردہ تفریح وتلذذ کی بہتات کی وجہ سے کتابیں نظر انداز ہو رہی ہوں اور مطالعے کا رجحان کم یا تقریباً ختم ہو رہا ہو تو کسی حد تک یہ طریقہ کارآمد ہو سکتا ہے۔

ذاتی پسند میں شریک کرنے کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ہر شخص کی پسند دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، کسی کو فکشن سے دلچسپی ہے تو کوئی شاعری کا دلدادہ ہے، کوئی تاریخ اور سماجیات کا شائق ہے اور بعض لوگ آپ بیتیوں، خاکوں اور سوانحی تحریروں کے رسیا ہوتے ہیں۔ پسندیدگی کے ان اختلافات کے باوجود اپنی پسندیدہ کتابوں سے متعارف کرانے میں مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اسی موہوم سی امید کے تحت یہاں چند ایسی کتابوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اپنے موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے اہم اور منفرد ہونے کے ساتھ فکری انجماد کو متحرک کرنے کی صلاحیت سے بھی معمور ہیں۔ ماضی قریب میں ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابیں جو میرے مطالعے میں رہیں، ان میں سے بیشتر کا تعارف وتبصرہ ادبی حلقوں میں ہوتا رہا ہے۔ جن میں بلھا کیہ جاناں میں کون (ذکیہ مشہدی) اللہ میاں کا کارخانہ (محسن خان) دھول دیپ (یعقوب یاور) نعمت خانہ، ایک خنجر پانی میں (خالد جاوید) زندیق (رحمٰن عباس) ہجور آما (شبیر احمد) کشکول (عبدالصمد) خودکشی نامہ (رضوان الحق) رقص نامہ (جیم عباسی) مجھے فیمنسٹ نہ کہو (طاہرہ کاظمی) سناٹوں کی پرچھائیں (عادل رضا منصوری) وغیرہ سرفہرست ہیں۔ فکشن سے دلچسپی ہونے کے سبب ان میں فکشن کا تناسب زیادہ ہے۔ سمیناروں اور ادبی مجلسوں میں زیر بحث رہنے والی کتابوں سے گریز کرتے ہوئے اس مضمون میں قصداً ان کتابوں پر گفتگو کی گئی ہے، جن کا تعارف عام قارئین کے درمیان نہیں ہوا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس تحریر کے ذریعے تحرک پیدا ہو اور ان کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔

Silence:Shusaku Endo

تسلیم شدہ امر ہے کہ عظیم اور لازوال ہونے کے لیے عصریت اور ابدیت کا عکس ضروری ہے۔ جاپانی ناول نگار سوشا کو ایندو کا ناول 'خاموشی' ایک ایسا ہی لازوال شاہ کار ہے جو لکھا تو گیا تھا 1966 میں لیکن حالیہ تناظر میں اس ناول کا مطالعہ اس اعتبار سے دلچسپ اور بصیرت بخش ہے کہ یہ ناول سوال قائم کرتا ہے کہ مذہب اور وجود کی بقا کی کشمکش میں مذہب کو نظر انداز کر کے وجود کا انتخاب طمانیت بخش ہے یا بے چین رکھنے والا فیصلہ ہے۔ ناول کا ترجمہ مسعود اشعر نے کیا ہے۔ ناول کے ترجمے میں صرف زبان سے واقفیت کافی نہیں تھی بلکہ اس کے لیے عیسائیوں اور جاپانیوں کے مذہبی بیانیے اور تاریخ پر بھی دسترس ضروری تھی۔ اس فنی مہارت کے بغیر ترجمے میں تخلیقیت اور روانی نہ پیدا ہوتی۔

بیسویں صدی میں تحریر کردہ اس ناول میں سترہویں صدی کے جاپانیوں کے عقیدے، حالات، مذہبی استعماروں کی شدت پسندی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مذہب، عقائد، مذہبی برتری، مختلف مذاہب میں خدا کے تصور، خدا کے وجود اور قادر مطلق ہونے کے تصورات، نسلی تحفظات اور ثقافتی آمریت پر کاری ضرب لگانے والا یہ ناول انسان کے متشدد ہونے کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ یہ منکشف ہوتا

ہے کہ مذہب کے نام پر تشدد ہر زمانے میں روا رکھا گیا ہے۔ قتل وغارت گری کو خوشنودی خدا سمجھا جاتا رہا ہے۔

ناول بظاہر تبلیغ مذہب کی غرض سے جاپان جانے والے فریرا نامی ایک پادری کے مرتد ہونے کی خبر کی تفتیش پر مبنی ہے۔ لیکن اس تفتیشی سفر میں اس تسلط اور فوقیت کے جنون کی تخم ریزی بھی شامل ہوگئی ہے جو قوموں اور ملکوں کی سائیکی پر غالب آ کر فسطائیت پر اکساتا ہے۔

پرتگال سے دو پادری فریرا کے حوالے سے تحقیق اور جاپان میں عیسائیت کی آخری شمع کی ٹمٹماتی لو کو بچانے کے لیے سفر کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے جاپان پہنچتے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان کو دی جانے والی جسمانی اذیتوں اور معصوم عیسائیوں پر روح فرسا مظالم کے احوال مصنف نے اس انداز سے بیان کیے ہیں کہ ناول کا موضوع مذہبی کشمکش نہ ہو کر انسانی نفسیات میں شامل اذیت پسندی کی وجوہ دریافت کرنے کی ایک کلید معلوم ہونے لگتا ہے۔ ناول کے واقعات یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کی وجودی حالت ایک تنہا اجنبی کی ہے جو سکون اور معیت کا متلاشی ہے۔ تنہائی میں وہ خدا کو پکارتا ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل پر وہ خدا کی ذات کو قادر مطلق تسلیم کرتا ہے اور تشنہ رہ جانے کی صورت میں اسی تشویش، شبہے اور دہشت کا ظہور ہوتا ہے جو اس ناول کے کرداروں میں ظاہر ہوا ہے۔

حسن اور سفاکی کی سرزمینیں: اجمل کمال

دیرپا اثرات کی حامل اسی طرح کی ایک کتاب 'حسن اور سفاکی کی سرزمینیں' (مطبوعہ کتاب دار ممبئی) ہے۔ یہ اجمل کمال کے ترجمہ کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ

مضامین مانوس ذائقے سے ذرا مختلف مگر نہایت ہی معلومات افزا ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے چلی آ رہی پیدائشی برتری کے اظہار کے نتیجے میں ہونے والے تنازعے اور پرتشدد عوامل کی چشم کشا صورتیں ان مضامین میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے دنیا کے مختلف ممالک کی جو سیاسی اور سماجی سرگرمیاں سامنے آتی ہیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طاقت اور تشدد لازم و ملزوم رہے ہیں۔ شوقیہ یا تفریحی طور پر کتابیں پڑھنے والوں کے لیے یہ مضامین مثل کوہ گراں ہو سکتے ہیں مگر مطالعے کے بعد انکشافات اور معلومات کا ایک خزانہ ضرور حاصل ہوگا۔ کسی ایک کتاب کے مطالعے سے اگر دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والوں کی خوشیوں اور مصائب سے اس حد تک ہم واقف ہو جائیں اور یہ محسوس کر سکیں کہ ان کے شب و روز ہم سے کس قدر اور کس طرح مختلف یا مماثل ہیں تو شاید اسے مطالعے کا ماحصل کہہ سکتے ہیں۔

اوراق عصام عبدالعاطی: علا الاسوانی

مصری ادیب علا الاسوانی کا ناولٹ 'عصام عبدالعاطی کے کاغذات' (مطبوعہ آج 67: مدیر اجمل کمال) معروف ادیب اور مترجم محمد عمر میمن کا ترجمہ کردہ ہے۔ ترجمے میں تخلیقی دلکشی برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے جزئیات میں آنے والی تمام چیزوں کو اصل سے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسوانی کے طنزیہ اور اشاراتی طرز بیان سے آشکار ہونے والا مفہوم اس ترجمے میں موجود ہے۔

ایک باصلاحیت، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان عصام کے احوال زندگی پر مبنی یہ ناول مصری معاشرے کے افکار و خیالات، سیاسی اور معاشرتی اطراف کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان اوصاف (تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی) سے متصف ہونا اس قدر قابل ذکر نہیں کہ دوسری زبانوں کے قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے، کیونکہ جس زبان اور جس معاشرے میں ادب لکھا جاتا ہے، اس کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں لاشعوری اور بالواسطہ طور پر تحریر میں شامل ہو جاتی ہیں، اس لیے کسی ناول کو محض ان خصوصیات کی بنیاد پر سرفہرست نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنے ایک انٹرویو میں اسوانی نے اپنے ناولوں کے حوالے سے سیاسی، تہذیبی، سماجی، فلسفیانہ، وجودی یا کسی بھی نوع کا لیبل لگانے والوں سے معذرت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں نے زندگی کے تمام ترنگوں اور جہتوں کو افسانوی قالب میں ڈھالا ہے، سیاست، سماج اور دوسری چیزیں انسانی زندگی کا حصہ ہیں لیکن ان کے نقوش اس قدر شدید نہیں کہ ناول کو کسی ایک غالب عنصر سے مختص کر دیا جائے۔

زندگی کے حقائق کی پیشکش میں اس نے گفتگو اور عمل سے آشکار ہونے والے نتائج سے کرداروں کی زندگی کا خاکہ بنایا ہے اسی لیے ناول پڑھتے ہوئے ہمیں اس میں اپنے ملک کے معاشرتی المیے اور اجتماعی خال و خد نظر آتے ہیں۔ اس ملک میں بھی عالم و دانشور اور منفرد سوچ کے حامل افراد کا انجام عصام عبدالعاطی کے المیے سے کچھ مختلف نہیں۔

Esther's Enheritance:SandorMarai

بیسویں صدی کے ہنگرین ناول نگار شاندور مارئی کے ناول 'ایستھر کا ورثہ' کے مترجم بھی محمد عمر میمن ہیں۔ یہ

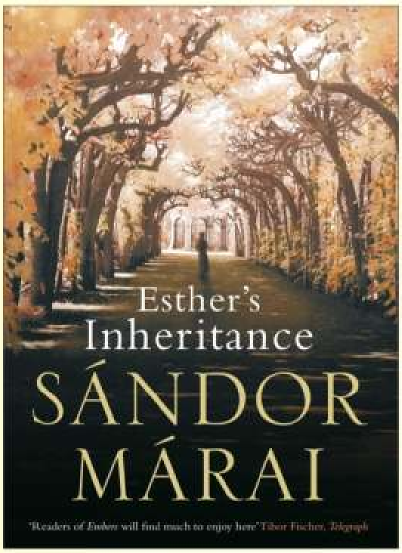

ناول اگر کسی رومانی ناول نگار کے قلم سے لکھا گیا ہوتا تو عشق اپنی انتہا پر ہوتا۔ اپنا وجود، رعنائی اور ساری جمع پونجی قربان کر دینے والی عورت کے حصے میں زندگی کے کچھ لمحے تو آتے ہی جو اسے سرشار کرتے لیکن شاندور مارئی کے سفاک قلم نے عشق اور جذباتی لمحوں کی حقیقت سے روبرو کرایا ہے۔ ناول کا آغاز دلچسپ اور پرتجسس ہونے کی وجہ سے قاری ہوا کے دوش پر سوار انجام جاننے کی خواہش میں کرداروں کے رویوں پر غور کیے بغیر خود رو بیانیہ اور اسلوب کی دلکشی میں محو ہو کر نفسیاتی گرہ کشائی بھی نہیں کر پاتا اور اخیر میں واقعات اور اپنی قرات دونوں کے حوالے سے مایوس ہوتا ہے۔ متکلم راوی ایستھر نے ساری زندگی لیوش نام کے جھوٹے اور مکار شخص سے محبت کی۔ لیوش کے حربے اور چالاکیاں جاننے کے باوجود خود کو نفرت کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ سب کچھ لوٹنے کے بعد وہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اس عرصے میں وہ موت کی منتظر پرانی یادیں رقم کرتی رہی۔ بیس سال بعد ایک دن اچانک اسے تار موصول ہوتا ہے کہ لیوش واپس آ رہا ہے۔ اس بار بھی

وہ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے پر مجبور پاتی ہے۔ ناول کا پلاٹ بظاہر تقدیر پسندوں کے یقین کی توثیق معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی معنویت ایستھر کے بجائے لیوش کے کردار کا تجزیہ کرنے پر آشکار ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کا مزاج جس طرح تبدیل ہوا، ان حالات میں عشق یا کسی بھی طرح کے روحانی جذبے کی توانائی و تقدس کو سفاکی، فریب، جھوٹ اور سفلہ پروری کے ہاتھوں پامال ہوتے دکھانا نہ تو حیرت انگیز ہے اور نہ ہی غیر فطری۔ تازہ تر موضوع کی جستجو سے قطع نظر اگر انسانی لغزشوں کے عبرتناک انجام، غیر معمولی دلکش انداز بیان اور عشق کی نیرنگی دیکھنا ہو تو یہ ناول پڑھنا یقیناً دلچسپ ہوگا۔

پوسٹ باکس نمبر 203 نالا سوپارا: چترا مدگل

معروف ہندی فکشن رائٹر چترا مدگل کے ناول 'پوسٹ باکس نمبر 203 نالا سوپارا' (مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی) کا اردو ترجمہ احسن ایوبی نے کیا ہے۔ تھرڈ جینڈر کے مسائل، ان کی محرومیوں اور ان کے ساتھ برتے جانے والے سماجی رویے پر مبنی یہ ناول دلچسپ اور منفرد اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ خطوط کی تکنیک گرچہ بہت پرانی ہے لیکن اس ناول میں تخلیقی سطح پر اس تکنیک کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ ناول پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کا ٹریٹمنٹ اس تکنیک کے علاوہ کسی اور صورت میں اتنا موثر نہ ہوتا۔ خط میں چونکہ انسان اپنے ذاتی معاملات اور راز و نیاز لکھتا ہے، مزید یہ کہ جب خط ماں سے بچھڑے ہوئے، اس کی ممتا کے لیے تڑپتے ہوئے ایک بیٹے کا ہو تو چویشن مزید متاثر کن ہو جاتی ہے۔ انھیں گمبھیر خطوط سے اس ناول کا پلاٹ تعمیر کیا گیا ہے۔ ونود اپنے اوپر لگائی جانے والی بندشوں کی وجہ شروع میں سمجھ نہیں سکا لیکن اہل خانہ کی گفتگو سے رفتہ رفتہ اسے یہ اندازہ ہونے لگا کہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے اور پھر اس کی زندگی میں انکشافات اور حادثات کے انبار لگ گئے۔ کنروں کے ذریعے اٹھائے جانے کے بعد اسے اسکول میں مردہ قرار دیا جانا، کنروں کی مخصوص عادتیں اختیار کرنے پر مجبور کرنا ایسے دل سوز صدمے ہیں جن کا خیال آتے ہی اس کا جگر چھلنی ہونے لگتا ہے۔

اپنے خونی رشتوں اور اجنبی رویوں نے اس کے وجود کو اتنے حصوں میں منقسم کر دیا کہ وہ خود عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا ہو گیا، یہاں تک کہ خط میں تین ناموں پر مشتمل اپنا نام 'ونود عرف بنی عرف بملی' لکھنے لگا۔ اس موضوع پر اردو کی کسی صنف خواہ وہ فکشن ہو یا شاعری یا نان فکشن کہیں اس طبقے کے مسائل اور حقوق کے متعلق خاطر خواہ توجہ نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے اردو میں اس ناول کا ترجمہ ہو جانا خوش آئند اور سودمند ہے اور کتاب کا مطالعہ یقیناً انکشاف آمیز۔

لفاظ اور دوسری کہانیاں: یوگیندر آھوجا

یوگیندر آہوجا کا نام ہندی ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی کہانیوں کے ترجمے اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'لفاظ اور دوسری کہانیاں' میں تین طویل کہانیاں 'لفاظ'، 'منانا' اور 'ڈاگ اسٹوری' شامل ہیں۔ ان تینوں میں لفاظ سب سے عمدہ ہے۔ اس کہانی کا سارا حسن کردار سازی میں موجود ہے۔ اس طویل افسانے کا مرکزی کردار لفاظ بظاہر ایک انقلاب پسند مگر فطری طور پر فاشسٹ رویوں کا حامل ہے جو اپنی باتوں سے مسحور کرنے اور موقع محل کی مناسبت سے بیانیہ تعمیر کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہے۔ اس پراسرار شخص کی اصلیت جاننے کے تجسس میں کہانی کی طوالت بالکل گراں نہیں گزرتی۔ لفاظ نے اپنی موثر باتوں کے ذریعے جس طرح کئی بار لوگوں کا استحصال کیا، اس کے ذریعے ملک میں مذہبی اور سیاسی کشمکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا اپنا پہلو مضبوط کرنے والے افراد کی مصلحتیں، اخلاقی زوال کے شکار معاشرے میں لفظوں کی حرمت اور تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے رجحان کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔ 'منانا' کا بیانیہ بھی اسی طرح پیچیدہ مسائل کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے لیکن ظاہری اعتبار سے ذمے داریوں کے بوجھ تلے کراہتے افراد کی زندگیوں میں بڑھتے ہوئے فاصلے، ازدواجی زندگی میں قربت اور محبت کی گم ہوتی ہوئی ڈور اس کہانی کا موضوع ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے سماج اور سیاست کا وہ رخ سامنے آتا ہے جو اردو افسانوں میں عموماً واضح کرنا آسان نہیں۔

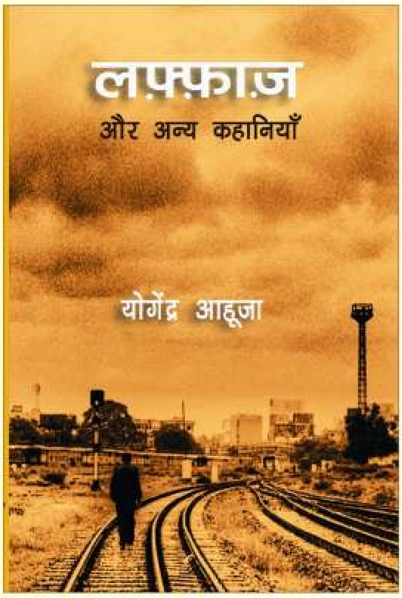

جی اے کلکرنی کی کہانیاں: سلام بن رزاق

جی اے کلکرنی مراٹھی زبان کا ایک ایسا نام ہے جس نے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے مراٹھی کہانیوں کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ ان کی کہانیوں کی فضا طلسماتی اور ان کا اسلوب نیم علامتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے ایک انوکھی جہت متشکل ہوتی ہے۔ سلام بن رزاق نے ان کے اسلوب اور موضوع کی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اس انداز سے ترجمہ کیا ہے کہ کہانیاں پڑھتے ہوئے اصل مصنف کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بعض کہانیوں میں فارسی آمیز زبان استعمال کی گئی ہے جو اس افسانوی فضا میں بالکل مناسب معلوم ہوتی ہے۔ 'غلام' قدیم عرب کی روایات اور قبائلی رسوم کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے۔ اس کہانی سے مترشح ہوتا ہے کہ ظلم و جبر کا کوئی مذہب اور قبیلہ نہیں ہوتا بلکہ طاقت ہی ہے جو ظلم کو فروغ دیتی ہے۔ اسی طرح 'سوامی' کی زبان ہندی اور سنسکرت آمیز ہے۔ اس میں مذہب کے نام پر جذباتی استحصال کرنے والے ٹھیکیداروں اور ان کے مٹھ نما اڈوں کی حقیقت بیان کرنے کے ساتھ افسانہ نگار نے زندگی کی حقیقت اور مقصد کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ پیش کردہ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی قربانیوں کی طالب ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں 'قاصد'، 'مکتی'، 'آدی باسی'، 'منجولا' اور 'جب میں نے ذات چھپائی' وغیرہ کو پڑھ کر موضوعات کا تنوع اور اسی لحاظ سے نئے تازہ اسالیب سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ نئے تجربات کا بھی احساس ہوتا ہے جن کا ہمیں اب تک ادراک نہیں تھا۔

■

Shahnaz Rahman
C-4/3,Suroor Apartment
Sir Syed Nagar
Aligarh-202001 (UP)
Mob.: 9458537513

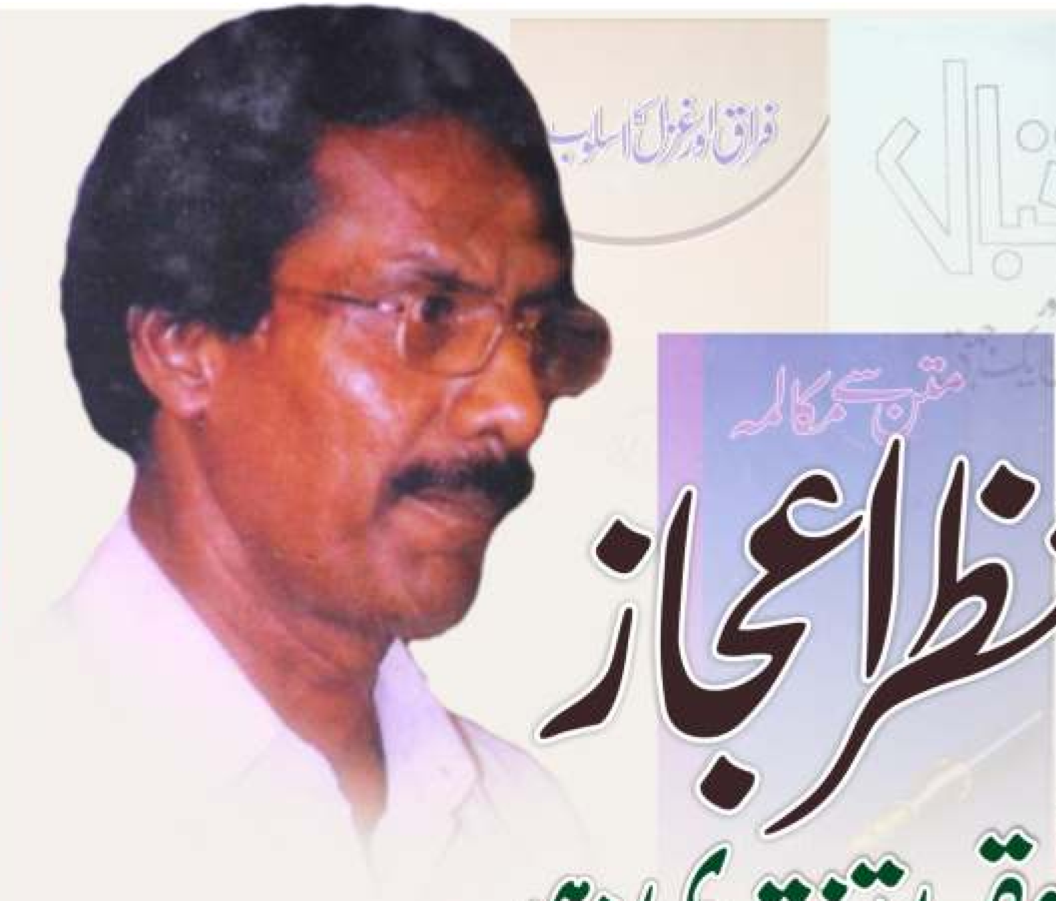

محمد حامد علی خان

منظر اعجاز

توانا تخلیقی اور تنقیدی ذہن

جناب منظر اعجاز سے میری دید شنید کا وقفہ کوئی تین دہائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ تب کی بات ہے جب میں سائنس کا طالب علم تھا اور منظر اعجاز مظفر پور میں ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرم تھے اور 1978 میں انھوں نے ایک رسالہ 'انجو' کا اجرا کیا تھا جس کی حیات تیسرے شمارے پر مکمل ہوگئی پھر 1981 میں پندرہ روزہ 'انعکاس' جاری کیا، لیکن یہ بھی چند شماروں کے بعد اپنے مقدر کو پہنچ گیا۔ ہر چند کہ اس کا ضخیم 'فراق نمبر' شائع ہوا۔ منظر اعجاز نے انعکاس کا فراق نمبر شائع کر کے ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا۔ ادبی حلقے میں اس کی خوب خوب پذیرائی بھی ہوئی۔ 1982 میں جب مظفر پور کے چند نوجوانوں نے روحوں کا مشاعرہ منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا تو خصوصی ادبی مشیر کی حیثیت سے منظر اعجاز مدعو کیے گئے اور میں صرف یوں ان نوجوانوں کا معاون تھا کہ اگر کسی نے پروگرام کے ماحول کو بگاڑنے کی کوشش کی تو میں ایسی کوششوں کو ناکام کردوں۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے پھر حسن اتفاق کہ میں نے سائنس سے ادب کا رخ کیا تو 1986 اور 1987 میں بالترتیب ایم اے اردو و ایم اے فارسی کے امتحانات ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ دیا اور نتیجہ تقریباً مقابلے کا رہا اور اسی زمانے میں میں نے جانا کہ منظر اعجاز دراصل سید محمد منظر الحق ہیں۔ یوں منظر اعجاز کا شمار میرے سنیئرز میں ہے۔ پھر 1991 میں ہم دونوں نے ہی ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، صدر شعبۂ اردو، ایل۔ ایس۔ کالج مظفر پور کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کی سند بہار یونی ورسٹی مظفر پور سے حاصل کی۔ حسن اتفاق کہ مجھے یہ سند جون 1991 میں ملی جبکہ منظر اعجاز کو نومبر 1991 میں دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب منظر اعجاز کا مطالعہ و مشاہدہ نکھرنے لگا تھا اور میں رفتہ رفتہ ان کی تحریروں سے متاثر ہونے لگا تھا۔ ان کے کلام کا جو رنگ و آہنگ تھا اور فکر کی جو بالیدگی چھن کر آتی تھی وہ یقیناً اس عہد کے نوجوانوں میں منظر اعجاز کی انفرادیت کی دلیل تھی۔ 1992 میں درس و تدریس کے فرائض سے وابستہ ہوتے ہی منظر اعجاز کی ادبی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں اور آج ان کی پہچان نہ صرف یہ کہ زود نویس تنقید نگار کی حیثیت سے ہونے لگی ہے بلکہ زود گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی پہچان تقریباً بن چکی ہے اور ان کی ادبی کاوشوں:

اقبال اور قومی یک جہتی 1994
اقبال عصری تناظر 2000
فیض احمد فیض اور صلیبیں مرے دریچے میں 2003
اعجاز نظر 2006
قومی وطنی شاعری کا منظر نامہ 2006
ورق ورق اجالا 2009

کو ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔

'اقبال اور قومی یک جہتی' دراصل منظر اعجاز کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بہار یونی ورسٹی مظفر پور نے انھیں نومبر 1991 میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض کی تھی۔ بعد میں اسے ہی انھوں نے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ کی اشاعتی مالی امداد سے جون 1994 میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ کتاب اپنے ظاہری حسن میں نفاست و سادگی کے ساتھ ساتھ منظر اعجاز کے مزاج و مذاق کی طرف اشارے کرتی ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ فلسفہ و سیاست سے براہ راست متعلق ہے جو بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں اقبال کی شخصیت متنازعہ بھی رہی ہے کیونکہ اقبال کے معترضین اور ناقدین کا یہ عام خیال ہے کہ اقبال کی اولین دور کی شاعری حب الوطنی، انسان دوستی اور قومی یک جہتی کے شعور سے مالا مال ہے لیکن یورپ سے واپسی کے بعد ان کے لہجے اور فکر میں زبردست تبدیلی آئی اور انھوں نے ملت اسلامیہ کی بیداری اور نشاۃ ثانیہ کو اپنا مقصود بنالیا

جس سے قومی یک جہتی کے جذبے کو زبردست ٹھیس لگی۔

اقبال پر اعتراضات کا دوسرا منطقی جواز یہ بھی ہے کہ اقبال کے تصورِ خودی اور تصورِ مردِ مومن پر جرمنی مفکر نطشے کا زبردست اثر ہے اور نطشے چونکہ فاسسٹ ہے، وہ اپنی انفرادیت کے زعم میں جمہوریت کو رد کر دیتا ہے اس لیے اقبال کی خودی اسے شاہینی فلسفے کا قائل بنا دیتی ہے۔ وہ وطنیت، قومیت اور جمہوریت کے شعور سے برگشتہ وبیزار نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایسے مفکر شاعر سے ''قومی یک جہتی'' کی تعلیم وتلقین کی توقع ہی بے سود ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو اقبال کی شخصیت کو متنازع بنا دیتی ہیں لیکن منظر اعجاز کی تقریباً تمام تر کاوشیں اپنے منطقی جواز سے اس تنازع کو حل کرنے سے متعلق رہی ہیں۔

ڈاکٹر منظر اعجاز نے معقول منطقی جواز کے تحت اقبال کو محبِ وطن، جمہوریت پسند، انسان دوست اور قومی وحدت کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اگر 'اقبال عصری تناظر' کے مشتملات پر نظر ڈالی جائے اور ان کے چند مضامین مثلاً تصورِ خودی، تصورِ عشق، 'ساقی نامہ' 'شاہین' اور منظری شاعری کا گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو وہ شکوک وشبہات دور ہو سکتے ہیں جن میں معترضین مبتلا رہے ہیں۔ منظر اعجاز نے اس زاویۂ نظر سے ان فرسودہ موضوعات پر روشنی ڈالی ہے جس کے وسیلے سے اقبال بالکل ہی عام اور روایتی ناقدین کے اندازِ نظر سے مختلف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کی ملت پسندی کا انکار نہیں کیا ہے لیکن فلسفۂ خودی کی ترتیب وتدوین میں اقبال کی اوّلین دَور کی شاعری نیا شوالہ (گائتری کا ترجمہ) آفتاب، جگنو، قومی ترانہ، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، رام اور نانک اور ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، سے لے کر ساقی نامہ تک کے حوالوں سے کام لیا ہے اور خودی کا فلسفہ مرتب کرنے میں 'ساقی نامہ' کو بنیاد بنایا ہے۔ جو دوسری طرف خودی کے کامل تصور پر مبنی ہے یعنی جس بنیاد پر اقبال کو فاسسٹ تصور کیا جاتا رہا ہے اسی بنیاد پر منظر اعجاز نے اقبال کو قومی وحدت کا نمائندہ قرار دیا ہے اور یہی تصور جمعیت آدم کا نظریہ بھی واضح کرتا ہے اس طرح یہی چیز انسان دوستی کے شعور کی ضامن ہو جاتی ہے اور انسان دوستی کا جذبہ وطن کے مادی تصور کی واقعیت کو تسلیم کرتے ہوئے آفاقیت اختیار کر لیتا ہے اور یہی چیز جمہوریت اور انفرادیت کو بھی داخلی طور پر مربوط کر دیتی ہے۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

'من وتو' کی معنوی تخلیقی ہمکاری سے ہی 'ہم' یعنی اجتماعی شعور کی مستحکم تعبیر ممکن ہے۔ یعنی اختلافات کے تعین اور استقرار کے بغیر یک جہتی کا تصور ناقص ہے اور منطقی طور پر اس خیال کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وحدت کا تعین تضادات واختلافات کی ترتیب وتنظیم سے ہی ممکن ہے اس سلسلے میں منظر اعجاز نے چارلس ڈبلیو بوڈیمر جیسے امرائیولوجسٹ کا بے حد مفید اور اہم حوالہ بھی پیش کیا ہے اور اپنے خیال کو زبردست تقویت پہنچائی ہے۔

'اقبال عصری تناظر' مطبوعہ 2000 بنیادی طور پر ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن جب انھیں یکجا کر کے کتابی صورت میں لایا گیا تو اس کی معنوی جہت دوبالا ہو گئی کیونکہ منظر اعجاز نے اس میں سات ابواب قائم کیے مثلاً:

'تصورات: عصری تناظر' یہاں خودی، پیکار، حریت، شاہین، مردِ مومن، عشق، عورت کے حوالے سے گفتگو کی ہے تو 'معجزات: عصری تناظر' میں فن، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، نظم نگاری، غزل گوئی اور منظری شاعری کے حوالے سے معجزاتِ اقبال کا بیان ہوا ہے۔ 'تجزیات: عصری تناظر' میں اقبال کی نظم خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ، 'لینن خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا' ذوق وشوق، دین وسیاست، ساقی نامہ، فصلِ بہار، محاورہ مابین خدا وانسان، اگر خواہی حیات اندر خطر زی کے حوالے سے گفتگو کی۔ 'الٰہیات: عصری تناظر' میں مذہب، تصوف، تو 'سیاسیات: عصری تناظر' میں جمہوریت، اشتراکیت، وطنیت، قومی یک جہتی، انسان دوستی کے حوالے سے گفتگو ہے اور بالآخر 'متفرقات: عصری تناظر' میں مولانا روم، غالب، نطشے کے حوالے سے گفتگو ہے اور بالآخر 'متفرقات: عصری تناظر' میں اقبال اور عالمی ادب، اقبال بحیثیت مفکر، اقبال بحیثیت نثر نگار، تصورِ خودی اور اقبال وآزاد کے حوالے سے اقبال عصری تناظر کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ گویا یہ پرانی شراب کو نئی بوتل میں منتقل کرنے کا فن بھی ہے لیکن اس کی معنوی گہرائی اور گیرائی نیز وسعت وپنہائی کا اندازہ ڈاکٹر عبدالحق کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے:

''منظر اعجاز نے دل ونظر کے سفینے کو اقبالیات کے بحرِ بے پایاں میں عزم واستقلال کے ساتھ جس طرح جولاں کیا ہے وہ صد آفریں ہے۔ اقبال پر تحقیقاتِ علمیہ کے ساتھ ایک گراں قدر تصنیف کی پیش کش کے لیے ہم ان کی اقبال شناسی کے معترف ہیں۔ یہ ان کی دوسری مفید اور منفرد کوشش ہے جس میں اقبال کی شعری وفکری جہات کے متنوع مباحث کو سہل وسادہ اسالیب میں پیش کیا جا رہا ہے۔'' (ماخوذ: اقبال عصری تناظر، سکنڈ فلیپ)

'فیض احمد فیض اور صلیبیں مرے دریچے میں' منظر اعجازی کی مختصر مگر جامع تصنیف ہے جو فیض کو مکتوب نگاری کے فن میں بھی یکتائے روزگار بنانے کی ایک کاوش ہے۔ دراصل فیض نے 9 مارچ 1951 سے 19 اپریل 1955 تک قید وبند کی صعوبتیں جھیلی تھیں اس دوران کئی مقامات کے جیل خانوں کی ہوائیں کھائیں اور اس دوران اپنی اہلیہ ایلس فیض اور بیٹیوں کے نام انگریزی میں کئی خطوط لکھے تھے لیکن 20 اپریل 1955 کو رہائی کے بعد ان مکاتیب کو از خود اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں 125 خطوط بیگم کے نام اور آٹھ خطوط اپنی دونوں بیٹیوں کے نام والے شامل ہیں۔ منظر اعجاز نے ان مکاتیب کو چار ذیلی عنوان حسیات، اخلاقیات، انتقادیات اور 'فلسفۂ حیات' میں بانٹ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زیادہ زور فیض احمد فیض کے اسلوب پر دیا گیا ہے اور کوئی نئی بات نہیں کہ فیض کے شعری سرمائے میں اگر ڈکشن پر توجہ مرکوز کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی مروجہ روایتی لفظیات کو اس سلیقے اور ایسے تیور کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ان کے معنوی آفاق پھیل گئے ہیں۔ ان کے جہانِ معانی میں وسعتیں پیدا ہو گئیں ہیں۔ فیض نے بہتیرے گھسے پٹے اور فرسودہ الفاظ کو بھی اپنے استعمال کے سلیقے سے نئی زندگی بخش دی ہے۔ یہاں تک کہ فیض نے حافظ شیرازی کے ڈکشن کو بھی اپنے کلام میں استعمال کیا تو فارسی کی ترکیبیں، علامتیں اور تشبیہیں، استعارے پیکر اردو میں ڈھل کر اردو کا ہی سرمایہ بن گئے اور کچھ ایسی ہی خوبیاں فیض کی نثر میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز نے اپنے وسیع مطالعے اور مشاہدہ کی بنیاد پر فیض کے مکاتیب کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے وہ یقیناً فیض کو پہچاننے میں معاون ہے۔

'اعجاز نظر' ڈاکٹر منظر اعجاز کے پندرہ مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں منظر اعجاز نے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان مضامین کی نوعیت بہر حال تنقیدی ہی ہے لیکن نظریاتی طور پر اس تنقید کا تعلق کسی مخصوص دبستان نقد ونظر سے نہیں۔ میں ویسے بھی فن میں چاہے، وہ تخلیق کا فن ہو یا تحقیق وتنقید کا فن، کسی نظریاتی وابستگی کا قائل نہیں۔ حالانکہ نظریاتی وابستگی کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے زیادہ نقصان کا

اندیشہ لگا رہتا ہے۔

(اعجاز نظر' منظر اعجاز، مکتبہ انعکاس، مظفر پور، 2006، ص 56)

لیکن اس مجموعہ مضامین کا کلیدی مضمون فیض احمد فیض کا فلسفۂ حیات اور مولانا ابوالکلام آزاد کا فلسفۂ حیات ہے لیکن اس مجموعے میں مختلف موضوعات کے ہوتے ہوئے بھی قدرے مشترک کی حیثیت رکھنے والی ایک چیز جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے وہ منظر اعجاز کا لفظیاتی اور لسانی نظام ہے اور سب سے بڑھ کر ان کا Philosophical approach جو انھیں معاصر نقادوں میں ممتاز و منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔ یوں ان کا مزاج و مذاق شروع ہی سے فلسفیانہ رہا ہے اور اس کے لیے وہ حلقۂ احباب میں بدنام بھی ہیں اور نیک نام بھی۔ مولانا آزاد کے فلسفہ حیات کی تعبیر و تفسیر سے بھی ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''حیات دراصل انا ہی کا ایک پہلو ہے اور انا زندگی کی حقیقی توانائی۔ یہ عمل شعور، ارادے اور مقصد سے ہم کار ہے۔ چونکہ یہ بامقصد ہے اس لیے اس میں حرکت ہے اور چونکہ اس میں حرکت ہے اس لیے اس میں حصول مقاصد کے لیے شدت کی ضرورت ہے اور حرکت میں شدت پیدا کرنے کے لیے رکاوٹ ضروری ہے۔ دراصل قوت حیات اپنے اظہار میں اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب اظہار کی راہ میں رکاوٹ حائل ہو چنانچہ حیات اظہار کے لیے جہاں راہ بناتی ہے وہیں رکاوٹ بھی خلق کر لیتی ہے اور اس میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ دراصل اظہار کی طلب ہی اس کے لیے حدود فراہم کر دیتی ہے اور یہی حدود یا رکاوٹیں ہیں جنھیں واقعیت بھی کہتے ہیں۔ خلق کی سطح پر یہی افراد و اشخاص ہیں یا دوسرے مظاہر و موجودات۔''

(اعجاز نظر، منظر اعجاز، مکتبہ انعکاس، مظفر پور، 2006، ص 56)

اس اقتباس اور دوسرے بیانات سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ منظر اعجاز کی فکر پر فلسفۂ اقبال کا گہرا اثر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد اور فیض کے مطالعات و اکتسابات نے بھی ان کی فکر اور اسلوب پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

'قومی وطنی شاعری کا منظر نامہ' (جلد اول) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں حرفِ چند کے علاوہ نظیر اکبر آبادی، محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی، شاد عظیم آبادی، شبلی نعمانی، ظفر علی خاں، سرور جہان آبادی، چکبست، حسرت موہانی، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، پرویز شاہدی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، ظفر حمیدی اور محمد اقبال کی قومی وطنی شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے بیشتر مضامین موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے بعد میں کچھ اور مضامین شامل کر کے کتاب کی شکل دے دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت پھیلا ہوا تھا جس کی متحمل کوئی مختصر سی کتاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے جو کام ہو چکا تھا اسے منظر عام پر کتابی صورت میں لانے کی کوشش کی گئی۔

منظر اعجاز اپنے فلسفیانہ میلان یا اپنے نسلی خاندانی متصوفانہ رجحان کی وجہ سے وحدت و یک جہتی کے قائل رہے ہیں اور جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال، مولانا آزاد اور فیض کے غائر مطالعے نے بھی انھیں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا مبلغ بنا دیا ہے چنانچہ کم و بیش پینتیس برسوں کی قلمی کاوش میں ان کے قلم کی نوک سے کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا جس سے وحدت انسانی کے جذبے کو ٹھیس لگتی ہو۔ منظر اعجاز مزاجاً اور فطرتاً گوشہ نشیں قسم کے انسان ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں انھیں Introvert Tendency کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ Extrovert Tendency کے حامل ہوتے تو انھیں امن عالم کا داعی، مبلغ یا علمبردار قرار دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں سمجھا جانا چاہیے کہ وہ زمانہ شناس نہیں لیکن منظر اعجاز خالص Humanist ہیں۔

'ورق ورق اُجالا' منظر اعجاز کا شعری مجموعہ ہے جس میں ان کی فکری نیرنگی و بوقلمونی کا سر جوش ملتا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

''منظر اعجاز کی غزلیں دیگر جدید شاعروں کی طرح عصری مسائل کی پیچیدگیوں اور تلخیوں سے عبارت ہیں۔ ان کے یہاں تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت، عقیدے کی ٹوٹ پھوٹ، خواب اور تعبیر خواب کی اذیتیں اور عصری انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن کا انعکاس ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق کا سوز و گداز اور تڑپ و کسک بھی موجود ہے۔ اور فلسفیانہ پیچیدگی اور لب و لہجے میں دقت پسندی ہے پھر بھی زبان میں حلاوت اور شیرینی موجود ہے۔ ایک خاص قسم کی متانت اور سنجیدگی بھی ان کی غزلوں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کا مخصوص لب و لہجہ اور منفرد رنگ و آہنگ ہے جو انھیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز بناتا ہے۔''

(مظفر پور علمی ادبی اور ثقافتی مرکز، محمد حامد علی خاں، ادراک پبلی کیشنز، مظفر پور، 1988، ص 214)

اور یہ امتیاز جو منظر اعجاز کو اپنے ہمعصروں سے الگ شناخت عطا کرتا ہے وہ ہے فکر کی گہرائی اور لفظوں کا

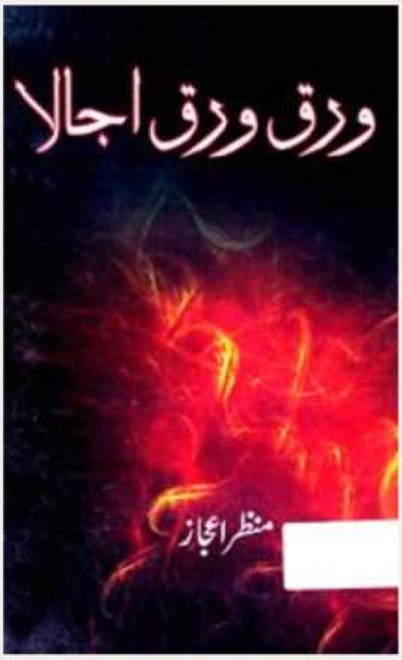

اہتمام۔ کیونکہ منظر اعجاز کی غزلوں میں ایسے ایسے قافیے اور ردیف کا استعمال ہوا ہے کہ اس پر اتنی رواں، دواں اور فکر انگیز غزلیں کہنا بہتوں کے لیے ممکن ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور یہ سب نہ صرف بے وجہ ہے بلکہ بقول خود اور بہ قلم خود منظر اعجاز:

''فن شاعری شعور کے روشن نقطے کا وہ انعکاس ہے جس میں حیات و کائنات کی تجلیات سمٹ کر بے مثال اور لازوال ہو جاتی ہیں۔ لیکن شعور کا یہ لفظ روشن کیسے ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ فطرت جب دل کے تاروں کو چھیڑنے لگے اور روح گنگنا اٹھے تو اس کے آہنگ سے جو شرارے پھوٹتے ہیں۔ انہی شراروں سے یہ نقطہ روشن ہوتا ہے۔ کوئی بڑی شاعری یا غیر معمولی شاعری اس کے بغیر ممکن نہیں اور یہ کسی معجزے سے کم نہیں۔ لیکن یہ معجزہ شاذ و نادر ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ساری زندگی کی ریاضت بھی اس کے لیے کم ہے۔ غالباً اسی وجہ سے افلاطون نے فن شاعری کو عطیہ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی دوسرے کمالات زندگی کی طرح فن شاعری بھی خدائے بخشندہ کی بخششوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے۔

میرا علم، میرا فن بھی چاہے وہ جس معیار کا ہو، اسی خدائے بخشندہ کی بخششوں اور عنایتوں کا نتیجہ ہے''۔

(ورق ورق اجالا، منظر اعجاز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009، ص 9)

دراصل منظر اعجاز نے اقبال اور غالب و فیض کا مطالعہ اس قدر دقیقہ سنجی سے کیا ہے کہ وہ بھی ان اصحاب فن کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے ہیں اور اپنے فن کو بھی اقبال کے اس مصرع ع

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو

تو کبھی غالب کے اس بیان کہ 'آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں' کے مصداق تصور کرتے ہیں اور جناب منظر اعجاز کا یہ دعویٰ کسی حد تک حق بہ جانب بھی ہے۔ میں نے اکثر انھیں دیکھا کہ ہم لوگ خوش گپیوں میں محو ہیں اور اچانک کچھ دیر کے لیے چپ ہوگئے۔ گفتگو کا سلسلہ توڑ کر جیب (جو کبھی پوسٹ بکس ہوا کرتا تھا) سے ایک کاغذ نکالا اور شاعری شروع ہوگئی۔ پھر اشاروں میں کبھی چائے کی فرمائش کردی تو کبھی سگریٹ کی اور درمیان میں کسی نے ٹوک دیا توان کا انداز 'اچھا چلتا ہوں'۔ نہایت ہی بداخلاقی کے ساتھ وہ چل دیتے اور انداز بھی ایسا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہو اور وہ پناہ کے لیے بھاگ رہے ہوں اور یہ کیفیت نہ صرف ان کی عملی زندگی کا خاصہ رہی بلکہ ان کے فن میں بھی درآئی ہے کہ کبھی وہ اپنے گردونواح کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہیں تو کبھی اس سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا بیان ہے کہ:

''ڈاکٹر منظر اعجاز فنی اعتبار سے ایک پختہ شاعر ہیں جن کے یہاں Contradictions کا اجتماع اور ادغام ہے۔ وہ سامنے کے لفظوں سے Irony کی کیفیت پیدا کرنے میں بے حد چابکدست نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں صنعتوں کا استعمال روایتی نہیں ہے اور اس میں وہ حدت سے زیادہ صلابت پر یقین رکھتے ہیں.... اب فکری نظام کی طرف واپس آیئے تو ایک صورت ان کے یہاں ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف وہ زندگی کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹھیک اسی وقت کوئی احساس درد بھی کہیں نہ کہیں ابھر جاتا ہے اس لیے اپنی فکری روش میں مثبت رجحان کے باوجود انفعال کی کیفیت سے گزرتے رہتے ہیں''۔

(ورق ورق اجالا، منظر اعجاز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009، ص 19-20)

اوراب پروفیسر وہاب اشرفی کا یہ بیان دیکھیں:

''منظر اعجاز نے بحیثیت شاعر اپنی شناخت کروانی چاہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعر یا افسانہ نگار سے زیادہ ان کے مضامین متاثر کرتے ہیں۔ دراصل ان کا تنقیدی ذہن مطالعہ اقبال اور فیض سے مرتب ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے تنقیدی مضامین میں ان جہات کی تلاش ملتی ہے۔ جن کے پس منظر میں اقبال اور فیض شعر کہتے رہے تھے۔ ترفع کی تلاش ان کے مضامین کے وہ پہلو ہیں جو ان کی ہر تحریر سے نمایاں ہے۔ منظر اعجاز نے کچھ افسانوں کے جائزے میں اپنی بصیرت کا احساس دلایا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک اچھا نقاد ان کے اندر پرورش پا رہا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد دوم، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007، ص 143)

مجھے پروفیسر وہاب اشرفی صاحب کے ان دونوں بیانات میں روایتی طریقہ تنقید کی کیفیت ملتی ہے کہ 'میرے تو دونوں بھلے' یوں مجھے منظر اعجاز کی شاعری خوب صورت، توانا، اور بڑی جاندار لگتی ہے کیونکہ ان کے ڈانڈے کلاسیکی شعری روایات سے مل جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا لسانی وطیرہ ہر چندکہ عام نہیں پھر بھی کوئی بیزارکن یکسانیت نہیں ملتی جبکہ 1980 کے بعد کی شاعری میں یہ چیز اکثر دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ منظر اعجاز کی شاعری 'از دل خیزد بر دل ریزد' کے مصداق نہیں ہوتی۔ ان کے اشعار میں جو فکری گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے، وہ جب تک گرفت میں نہ آئے، ان کے اشعار سے لطف اندوزی کی توقع بیکار ہوگی مثلاً یہ شعر:

ریزہ ریزہ ہوئے تابندہ خیالوں کے ورق
تیرگی چاٹتی جاتی ہے اجالوں کے ورق

یا۔

میرے مورث کا جو ترکہ تھا نہ محفوظ رہا
دیمکیں چاٹ گئیں کہنہ رسالوں کے ورق

اقدار کی شکست وریخت اور پامالی کا یہ حزنیہ اظہار اس لب ولہجے اور اس انداز واسلوب میں ان کے معاصرین کے یہاں کہیں اور نہیں مل سکتا۔

ایک دوسری غزل کا مطلع اور ایک شعر ملاحظہ ہو۔

فصیل سنگ اثر پہ پھیلے تو حدّ دشت انا نہ ٹوٹے
پھسل پھسل کر مرے لبوں سے کہیں یہ حرف دعا نہ ٹوٹے
حدود عرفاں کی منزلوں پر ہیں سنگ میل آگہی کے روشن
قیاس تیرہ نگاہ سے پھر تجلّیِ نقش پا نہ ٹوٹے

خواب پلکوں سے لرز کر جو گرا ٹوٹ گیا
گرچہ شیشہ بھی نہ تھا کیسے بھلا ٹوٹ گیا

آٹھ اشعار پر مشتمل یہ پوری غزل جس حزنیہ کیف کی حامل ہے وہ اشعار سے ظاہر ہے لیکن اس کے بعض اشعار میں جو Philosophical Depth ہے۔

ویسے کچھ اشعار ایسے بھی منظر اعجاز کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں جو سادہ نظر آتے ہیں لیکن ان کی پرکاری وہاں بھی مطالعے کی سنجیدگی اور متانت کا تقاضا کرتی ہے۔

وہ تو اک پتھر تھا اور پتھر کا پتھر رہ گیا
موم تو میں بھی نہ تھا کیسے پگھل کر رہ گیا
نیند کی لذت سے جب محروم آنکھیں ہوگئیں
ترجمان شب شکن آلود بستر رہ گیا

یا۔

جب کسمسائی سانسوں میں خوشبو حیات کی
رکھ کر زباں کانٹوں پر پھولوں سے بات کی

اس طرح کے بہت سے شعر منظر اعجاز کے مجموعہ غزل 'ورق ورق اجالا' میں بھی ہیں اور 'مباحثہ' اور 'انتساب'، وغیرہ میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سید محمد منظر الحق، منظر اعجاز ابن سید مقبول احمد نے زندگی کے سرد وگرم موسم کے تقریباً 71 سال کا تجربہ جھیلا یعنی سند کے اعتبار سے 12 دسمبر 1953 کو موضع رسول پور ترکی، ڈاکخانہ اسوئی، ضلع ویشالی میں پیدا ہوئے۔ 1965 میں مڈل بورڈ کا امتحان پاس کیا۔ پھر بھگوان پور ہائی اسکول، ویشالی سے 1971 میں ہائر سکنڈری کا امتحان پاس کر کے مظفرپور آگئے۔ اور مضافاتی طبیب کی حیثیت سے مظفرپور کے شکل روڈ میں ایک مطب بنالیا۔ بلا کے ذہین تھے اس لیے یہاں کے شعرا وادبا سے تعلق قائم ہوا جن میں ظفر عدیم، اسد رضوی، قیصر صدیقی اور چندر بریلوی ان کے رفقا میں رہے۔ 1979 میں پھر تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو 1985 اور 1986 میں بالترتیب ایم۔ اے اردو، ایم اے فارسی کے امتحانات میں شریک ہوئے اور بہتر نتیجہ حاصل کیا۔ دسمبر 1991 میں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی صدر شعبۂ اردو ایل ایس کالج کی نگرانی میں 'اقبال اور قومی یک جہتی' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ 1992 میں یونی ورسٹی سروس کمیشن پٹنہ کی سفارش پر پہلے ایس یو کالج ہلسہ میں اردو کے لکچرار مقرر ہوئے۔ تقریباً سات برسوں کی تگ ودو کے بعد ان کا تبادلہ اے این کالج، پٹنہ میں ہوگیا۔ یہیں سے ریڈر اور پروفیسر تک کے عہدے تک پہنچے۔ 18 مارچ 2018 کو مگدھ یونی ورسٹی گیا سے الگ ہوکر پاٹلی پترا یونی ورسٹی، پٹنہ قائم ہوئی تو پاٹلی پترا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے پہلے صدر شعبہ ہوئے لیکن دسمبر 2018 ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ شومیِ قسمت کہ ابھی ادب کی خدمت کرنا باقی ہی تھا کہ مسلسل امراض میں مبتلا ہوتے گئے اور بالآخر 19 مارچ 2023 کو صبح کے تقریباً تین بجے محبوب حقیقی سے جاملے۔

■

Prof. Mohd Hamid Mahmood Ali Khan
Dept of Urdu, BRA Bihar University
Muzaffarpur- (Bihar)
Mob.:9431073132
Email.: hamidalikhan546@gmail.com

سلسلۂ صحافت

اسعد فیصل فاروقی

تین بھولی بسری خاتون اور قومی تحریک آزادی

اردو میں نسائی صحافت کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوتا ہے، جب آگرہ سے 'مفید عام' نام کا پندرہ روزہ اخبار فروری 1869 میں احمد خاں صوفی کی ملکیت میں جاری ہوا۔ ایک عام معلوماتی اخبار ہونے کے باوجود، مفید عام اپنے دیگر ہم عصروں سے اس لیے منفرد تھا کہ اس نے اپنے آٹھ نکاتی مقاصد میں نسائی مضامین کو بھی ترجیحی بنیاد پر شائع کرنے کا اعلان کیا۔ پندرہ روزہ 'مفید عام' کا تذکرہ اختر شاہنشاہی میں بھی درج ہے نیز علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت 19 مارچ 1869 کے پرچہ میں بھی اس کا اشتہار شائع ہوا۔ اختر شاہنشاہی (1888) کے مطابق: ''مدارس دختراں کے واسطے بہت عمدہ عمدہ مطالب ومضامین مفید عام میں لکھے جاتے ہیں، جس سے فی الواقع یہ اخبار اسم بامسمی ہورہا ہے۔'' مفید عام کی اشاعت کے پندرہ برس بعد 5 مارچ 1884 کولکھنؤ سے مسیحی مشنری، پادری کریون نے 'رفیق نسواں' کے نام سے ایک نسوانی رسالے کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس کی مدیرہ مسز ہیڈلی تھیں اور یہ میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوتا تھا۔

اردو میں نسائی صحافت کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک پورے ملک (ہندو پاک) سے جاری ہونے والے نسائی رسائل و جرائد کی تعداد جہاں صرف نو تھی، وہیں بیسویں صدی کے آغاز (1901) سے ملک کی آزادی (1947) تک یہ تعداد سو سے زائد تجاوز کر چکی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کا مقصد خواتین میں تعلیم کو فروغ دینا اور ان کی علمی، ادبی اور سماجی اصلاح کرنا تھا۔ اس زمانے کے چند اہم نسائی رسائل وجرائد جنھوں نے خواتین کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ سماج پر مثبت اثر ڈالا اور تبدیلی کی ایک روش ڈالی، ان میں شریف بیویاں (لاہور، 1893)، معلم نسواں (حیدرآباد دکن، 1894)، تہذیب نسواں (لاہور، 1898)، خاتون (علی گڑھ، 1904)، پردہ نشیں (آگرہ، 1906)، عصمت (دہلی، 1908)، ظل السلطان (بھوپال، 1913) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ جرائد خواتین کے اندر سے اندھی تقلید اور بے جا رسم ورواج کو ختم کرنے میں بھی معاون بنے۔ ان جرائد نے خواتین قلم کاروں کے لیے ایک پلیٹ فارم بھی مہیا کیا، ان کے اندر بیداری پیدا کی، ان کی ادبی تخلیقات کو جگہ دی اور، ان کے خیالات کو شائع کیا۔ ایسا نہیں کہ اس دور میں خواتین سے متعلق جو جرائد جاری ہوئے، وہ سب کے سب موضوعاتی طور پر صرف تعلیمی، سماجی، مذہبی اور اصلاحی ہی تھے، بلکہ ان کے علاوہ بھی، بیسویں صدی کے پہلے نصف میں چند ایسے اختصاصی تحریکی جرائد جاری ہوئے، جو موضوع کے اعتبار سے کلی طور پر سیاسی تھے اور جن کا مقصد خواتین میں سیاسی شعور پیدا کرنا اور قومی تحریک آزادی کے جذبے کو پروان چڑھانا تھا۔ البتہ ایسے جرائد اور ان کے مالکان اور مدیروں کو حکومت کا عتاب ضرور جھیلنا پڑا۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں جہاں مردوں نے اہم کردار ادا کیا، وہیں خواتین نے بھی شانہ بہ شانہ ان کا ساتھ دیا۔ بیگم حضرت محل (1820-1829) ہوں یا رانی لکشمی بائی (1828-1856) یا پھر بی اماں (1850-1924) ہوں یا نشاط النساء بیگم (1884-1937) ایسی خواتین مجاہدین آزادی کی ایک لمبی فہرست ہے، جنھوں نے مردانہ وار طریقے سے ہندوستانی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ تاریخ صحافت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ تحریک آزادی میں مردوں کے ساتھ اردو کی ایسی خاتون صحافیوں، قلم کاروں اور ادیبوں کا بھی حصہ رہا ہے، جنھوں نے اپنے قلم سے مختلف اردو اخبارات اور رسائل میں سیاسی وسماجی مسائل اور جنگ آزادی کے تناظر میں قومی سیاست پر مضامین تحریر کیے اور اپنے تخلیقی فن پاروں میں بھی انگریزی راج کے ظلم وستم اور استبدادی رویے کو گفتگو کا موضوع بنایا۔ ان میں چند اہم نام نذر سجاد حیدر (1894-1937)، زخ شروانیہ (1894-1922) ، رشید جہاں (1905-1952)،عصمت چغتائی (1951-1991) وغیرہ ہیں۔ اس طرح ان خواتین قلم کاروں اور صحافیوں نے ہندوستانی جنگ آزادی کی تحریک میں اپنا بھرپور تعاون پیش کیا۔

تحریک آزادی کے دوران چند خواتین مجاہدین آزادی ایسی بھی تھیں، جنھوں نے خود کے اپنے سیاسی اور تحریکی جرائد جاری کیے اور ان کے وسیلے سے خواتین کے اندر تعلیمی، سماجی اور سیاسی شعور اور قومی یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن عام طور پر لوگوں کو ان کے اور ان کی خدمات کے بارے میں واقفیت نہیں ہے یا کم ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں ایسی ہی تین بھولی بسری مسلم خواتین مجاہدین آزادی اور ان کی صحافت پر گفتگو کی جائے گی، جن کی ادارت میں سیاسی جرائد اردو میں جاری ہوئے۔ ان جرائد کے وسیلے سے انھوں نے تحریک آزادی کے مشن کو آگے بڑھایا، عورتوں میں خود اعتمادی پیدا کی، ان کے اندر سماجی مسائل سے نبرد آزما ہونے کا شعور بھی پیدا کیا، ان کو قومی یکجہتی اور امن کا پیغام دیا اور ان کو ان کی قومی ذمے داری اور فرائض کا احساس دلایا۔ ان اخبارات و رسائل نے آزادی کے بعد کے نئے ہندوستان میں خواتین کو کس طرح کی ذمے داری ادا کرنی ہے اس پر بھی گفتگو اور مباحثہ کیا۔ ان خواتین میں بیگم خورشید خواجہ (1894-1921) جو معروف کانگریسی لیڈر عبدالمجید خواجہ (1885-1964) کی زوجہ تھیں، نے علی گڑھ سے 1920 میں ہفت روزہ 'ہند' جاری کیا۔ کلثوم سایانی (1900-1987) کی ادارت میں 1942 میں بمبئی سے ہفت روزہ 'رہبر' نکلا۔ اور ہاجرہ بیگم (1910-2003) نے 1945 میں ماہنامہ 'روشنی' اپنی ادارت میں بمبئی سے جاری کیا۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ تاریخ اردو صحافت کے متعلق اب تک جو تحقیقی کام ہوئے ہیں، ان میں مذکورہ تینوں جرائد و رسائل کے بارے میں تذکرہ نہیں ملتا۔ تاریخ اردو صحافت کے محققین بشمول امداد صابری، عتیق صدیقی، اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی اپنے تحقیقی کاموں میں ان جرائد کو موضوع گفتگو نہیں بنایا ہے۔ البتہ پروفیسر عابدہ سمیع الدین (ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، پٹنہ 1990) اور ڈاکٹر جمیل اختر (اردو میں جرائد نسواں کی تاریخ، 2016) نے ثانوی ماخذ کو بنیاد بنا کر ہفت روزہ 'ہند' کا رسمی تذکرہ تو کیا ہے، لیکن ان کے یہاں 'رہبر' اور 'روشنی' کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ملتی۔ ذیل کی سطور میں ان تین گمنام خواتین مجاہدین آزادی کی قومی اور صحافتی خدمات کا معروضی محاکمہ ان کی ادارت میں جاری ہوئے جرائد کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ قارئین کو ان خواتین صحافیوں کی جنگ آزادی میں کردار کے بارے میں معلوم ہو سکے۔

بیگم خورشید خواجہ اور ان کا اخبار ہفتہ وار 'ہند'

بیگم خورشید خواجہ ہماری جدوجہد آزادی کا ایک نمایاں چہرہ تھیں۔ وہ 1894 میں نواب سربلند جنگ حمیداللہ خاں کے یہاں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی ممتاز آزادی پسند اور قوم پرست رہنما عبدالمجید خواجہ سے ہوئی تھی۔ عبدالمجید خواجہ نے نوآبادیاتی حکومت کے خلاف گاندھی جی کی عدم تشدد کی مزاحمت کی فعال حمایت کی تھی۔ بیگم خورشید خواجہ نے اپنے شوہر کے ساتھ جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے علی گڑھ سے ایک اردو ہفتہ وار 'ہند' جاری کیا تاکہ مسلم خواتین کو جدوجہد آزادی میں حصہ لینے اور ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کی ترغیب دی جا سکے۔ علی گڑھ میں انھوں نے آزادی کی جدوجہد، خاص طور پر سودیشی تحریک میں بھی جوش وخروش سے حصہ لیا، اور 1920 میں علی گڑھ میں کھادی بھنڈار بھی قائم کیا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے بھی انتھک کوششیں کیں اور 1932 میں الہ آباد میں حمیدیہ پرائمری اسکول قائم کیا، جو 1975 میں حمیدیہ ڈگری کالج بن گیا۔ بیگم خورشید خواجہ کا انتقال جولائی 1981 کو ہوا۔

ہفتہ وار ہند کی ادارت

ہفتہ وار 'ہند' ایک اہم قوم پرست اردو اخبار تھا، جو جدوجہد آزادی کے پس منظر میں شائع ہوتا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ایسا سیاسی اخبار تھا، جسے ایک مسلمان خاتون بیگم خورشید خواجہ نے ایڈٹ کیا تھا۔ اس ہفتہ وار نے خواتین میں علمی بیداری کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہندوستانی مسلم خواتین کی رائے کو ہموار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اس اخبار کے وسیلے سے مسلم خواتین کو آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کا موقع فراہم کیا اور یہ بتایا کہ وہ اس اخبار کے وسیلے سے اپنے قومی احساسات اور جذبات کو پیش کر سکتی ہیں۔ اس اخبار میں خواتین کی تعلیم اور ان کو بااختیار بنانے پر بھی توجہ دی گئی۔ یہ 16 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، اور اس میں مضامین اور خبریں تین کالم میں درج ہوتی تھیں مطبع ملیہ میں بہ اہتمام علی محمد خاں چھپتا اور دفتر ہند سے سعید الدین خاں پبلیشر شائع کرتے تھے۔ اس اخبار کی قیمت سالانہ چھ روپیہ اور سہ ماہی دو روپیہ تھی۔

ہفتہ وار 'ہند' کا سرورق دو حصوں میں منقسم ہوتا تھا، اوپر کا نصف حصہ یعنی ماسٹ ہیڈ ٹائٹل سے مزین ہوتا تھا۔ ٹائٹل میں ہندوستان کا نقشہ اور دائیں بائیں (گجرات اور آسام) حصے میں کانگریس کا نقشہ مع چرخہ چھپا ہوتا تھا نیز پیپٹ میں جلی حروف میں اخبار کا نام 'ہند' اور اس کے اوپر 'اللہ اکبر' درج ہوتا تھا نیز اس سے اوپر سورج کی شعاعیں نکلتی ہوئی دکھائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اوپر دائیں اور بائیں دونوں کناروں پر یہ اشعار درج ہوتے تھے۔ ع

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سرورق کے نیچے کے حصے میں آزادی کے متوالوں کی نظم پیش کی جاتی تھی، دراصل ہفتہ وار ہندایک سیاسی اخبار تھا جس کا مقصد خواتین میں سیاسی اور علمی بیداری کو تحریک دینا اور ان کو عالمی طور پر ہونے والی سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ کرنا تھا نیز ان کے اندر جدوجہد آزادی کے تئیں جذبہ بیدار کرنا تھا۔ اخبار کے صفحات پر مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی سیاسی قلمی کاوشیں جابہ جا دیکھنے کو ملتی تھیں، جن کو ''عالم نسواں'' کے عنوان سے ایک علیحدہ گوشے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا جاتا تھا۔ نیز یہ اخبار دیگر قومی اخباروں اور رسائل سے بھی سیاسی مضامین اخذ کرتا تھا مثلاً مسلم آؤٹ لک، لاہور، جوہر، زمانہ، کانپور، ہمدم، وکیل وغیرہ۔

'ہند' کی اولین جلد کے شمارہ نمبر 16 بابت 27 ستمبر 1922 میں جو مشمولات درج ہیں ان میں افادات آزاد (نظم مولانا آزاد سبحانی)، اڈیٹوریل: مشرق قریب، انور پاشا، انگورہ کی فوجی مدد، اکالی سکھ، ہمارے اعتدال پسند، مولانا رشید احمد صاحب کی وفات (خورشید خواجہ)، کوائف، عالم نسواں: بہنوں سے دو دو باتیں، زنانہ دعا و نماز شکریہ سولن میں (نذر سجاد حیدر)، سوراج کب ملے گا (رضویہ خاتون)، 'اوبرا مرگاؤ' یوروپ کی عیسائیت سے وابستگی کا خلوص (م ح ف)، اصلی اور نقلی مجنوں، باسفورس اور درہ دانیال کی آزادی، رئیس وفد عرب فلسطین کا خط عالی جناب سیٹھ چھوٹانی کے نام، اڈیٹر چہرہ نما (فارسی اخبار) سے ملاقات (مسلم آؤٹ لک لاہور، بحوالہ کانگرس)، یونانی مظالم کی دردناک داستاں (ایک فرانسیسی جریدہ نگار کے قلم سے، بحوالہ زمانہ)، غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور درہ دانیال و شاخ زریں (بحوالہ ہمدم)، ہندوستان کی مشہور درسگاہیں (جناب سعید متعلم تاریخ، بحوالہ جوہر)، بعد از انکشاف (بحوالہ وکیل) صلح جویوں کی آزمائش، انقلاب امریکہ پر ایک اجمالی نظر مصطفےٰ کمال پاشا، تازہ خبر، بلوہ ملتان مراسلات، مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڑھ، اشتہارات

اسی طرح جلد اشارہ 28 بابت 20 دسمبر 1922 میں درج تحریروں کے عناوین یہ ہیں: نظم (رشحات جوہر)، اڈیٹوریل، برقیات، عالم نسواں، شری متی پاربتی ہندوستانی خاتون پرزور، شری متی پاربتی جی کا پرجوش تحریری بیان، مسئلہ مشرق قریبہ، ہندوستان کا دور جدید، اقتباسات

ہفتہ وار 'ہند' کے 27 ستمبر 1922 کے پرچے میں 'افادات آزاد' کے عنوان سے مولانا آزاد سبحانی کی نظم شائع ہوئی، جس کو ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

کبھی یہ گھر بھی تھا آباد یعنی عشق کا گھر تھا
تمھیں تم دل میں تھے اور غیر یعنی میں بھی باہر تھا
خوشا ایام وصل و کامرانی جب کہ جان من
ترا در تھا میرا سر تھا ترا سر تھا مرا در تھا
گرا قصر تمنا ایک آہِ نامرادی میں
جو قصر آہنیں سمجھا گیا تھا ریت کا گھر تھا
حریفو خوش نہ ہو یہ گردش چشم زمانہ ہے
کبھی اس آستان ناز پر اپنا بھی بستر تھا
مبارک تم کو عیش و کامرانی اہل خوش بختی
گوارا کرلیا ہم نے بھی جو اپنا مقدر تھا
گل افتادہ رکھ کر سامنے بلبل یہ کہتی تھی
ابھی یہ نو بلادیدہ ذرا پہلے گل تر تھا
ہوس کاری نے کھودی آبروئے عشق دنیا سے
یقین مانو مقام عشق اس سے پہلے برتر تھا
جہان دل کی قطع راہ اک تفسیر وحدت تھی
کہ دل ہی راہ تھا رہرو تھا اور رہرو کا رہبر تھا
کہاں تک کوئی سنتا سننے والے تھک اٹھے آخر
ترا آزاد اک حرف الم طومار دفتر تھا

پرچے کے اڈیٹوریل اور مضامین کو پڑھ کر مدیرہ کے سیاسی فہم وادراک کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ خورشید خواجہ نہ صرف ایک قوم پرست بلکہ ایک منجھی ہوئی سیاست داں تھیں اور اپنے وقت کے قومی اور بین الاقوامی واقعات پر ان کی گہری نظر بھی تھی۔

جیسا کہ اس ہفت روزہ کا ایک مقصد خواتین کے اندر بھی سیاسی فہم وشعور اور جدوجہد آزادی کا جذبہ بیدار کرنا تھا اسی وجہ سے مدیرہ 'عالم نسواں' کے گوشے کے تحت 'بہنوں سے دو دو باتیں' کے عنوان سے خواتین کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کرتی اور ان کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے شوق اور حوصلہ دلاتیں تاکہ ہماری خواتین قومی سیاست سے متعلق مضامین لکھنے کے لیے آمادہ ہوسکیں، مدیرہ 27 ستمبر 1922 کے پرچے میں 'دو دو باتیں' کے تحت رقمطراز ہے:

''اس عرصہ میں اگرچہ عدم موجودگی کی وجہ سے اخبار اور بالخصوص عالم نسواں پر اس قدر توجہ نہ کرسکی جیسی کہ ضرورت تھی لیکن یہ سمجھتی تھی کہ فتح سمرنا کی خوشی میں اکثر مضامین بہنوں کے موصول ہوں گے اور بالخصوص نظمیں اس لیے کہ اس سے قبل خلاف توقع اکثر نظمیں آتی تھیں لیکن اس مرتبہ ایسا نہ ہوا۔

آئندہ ہفتہ میں ملک کے مسلمہ لیڈر مہاتما گاندھی کے سالگرہ اگرچہ میری غیر حاضری کے سبب خاص نمبر کا انتظام دشوار ہے لیکن چاہتی ہوں کہ بہنیں ضرور اپنے صفحات کے لیے مہاتما کی سالگرہ کی تقریب میں خاص مضامین عنایت کریں اگرچہ مہاتما گاندھی کے احسانات تمام عالم پر ہیں اور ہندوستان کا توکہ ومہ ان سے واقف ہے لیکن طبقہ نسواں بالخصوص ان کا ممنون احسان ہے۔

اخبار انڈپنڈنٹ الہ آباد کی حق پسندی نے شیخ مبشر حسین صاحب قدوائی کی تجویز حمایت انگورہ کو عملی جامہ پہنایا ہے اور اخبار موصوف نے تجویز کیا ہے کہ ایک مختصر فوج ہندوستانی مسلمانوں کے ترکوں کی مدد کے لیے روانہ کی جائے، اس سلسلہ سے بڑی مسرت ہوئی جب یہ دیکھا کہ ہماری دو بہنوں یعنی بیگم قدوائی اور ان کی صاحبزادی نے بھی اپنے نام اس فوج میں بہ حیثیت نرس دیے ہیں۔ اس اعلان کو بلاشبہ ہماری جدید قومی تاریخ میں ایک نایاب سمجھنا چاہیے۔'' (مدیرہ) (ص 6)

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب 'ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ' میں 'ہند' کو ہفت روزہ اخبار کے بجائے ماہانہ جریدہ لکھا ہے جو غلط ہے، دراصل ان کی رسائی اصل اخبار تک نہ ہوسکی تھی بلکہ ان کی اس معلومات کا ماخذ پروفیسر جمال خواجہ کا خط تھا۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین رقمطراز ہیں:

''انھوں نے علی گڑھ میں ایک کھادی بھنڈار بھی قائم کیا اور 1921 میں علی گڑھ سے ہی 'ہند' نام کا ایک ماہانہ جریدہ بھی شروع کیا جس کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے خود ہی انجام دیے اپنے ایک پوسٹ کارڈ میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا کہ وہ انھیں اردو میں اپنا سب سے پہلا خط لکھ رہے ہیں۔''

(ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، ص 161)

امۃ الحمید خانم مرزا اپنے مضمون 'زنانہ اخبارات ورسائل' میں اس اخبار کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ہند سیاسی ہفتے وار اخبار محترمہ خورشید خواجہ صاحبہ کی اڈیٹری میں علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ سال بھر بعد اشاعت کا انتظام ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے بند ہوگیا۔ سنا تھا پھر جاری ہوگا۔ معلوم نہیں کہاں تک ٹھیک ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ خبریں، اڈیٹوریل اور مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ دو صفحے عالم نسواں کے عنوان سے نسوانی مضامین کے لیے مخصوص تھے جو خواتین کی عنایت سے بہ مشکل پر ہوتے تھے۔''

(تہذیب نسواں، لاہور 20 دسمبر 1923، ص 839)

قومی جنگ آزادی سے متعلق علی گڑھ سے جاری ہونے والے رسائل واخبارات میں ہفت روزہ 'ہند' کا شمار ایک اہم نیشنلٹ کے اخبار کے طور پر ہوتا ہے جس نے گاندھی جی کی سرپرستی میں آزادی کی تحریک کے لیے عوامی رائے بنانے میں نہ صرف اہم کردار ادا کیا بلکہ خواتین کی حصے داری کو بھی ممکن بنایا اور ان کے خیالات اور آرا کو بھی فوقیت سے شائع کیا۔

کلثوم سایانی اور ان کا پندرہ روزہ اخبار 'رہبر'

ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی گمنام خواتین میں کلثوم سایانی (1987-1900) کا نام بھی شامل ہے۔ وہ گاندھی جی کے قریبی رفیق اور ذاتی معالج ڈاکٹر رجب علی پٹیل کی بیٹی تھیں۔ ڈاکٹر رجب علی پٹیل کا تعلق مسلمانوں کے سنی خوجہ جماعت سے تھا۔ کلثوم سایانی کی پیدائش 21 اکتوبر 1900 کو ہوئی۔ ان کا خاندان قومی سرگرمیوں کے لیے ممتاز تھا اس وجہ سے وہ بھی بچپن سے ہی قوم پرستانہ اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگی تھیں۔ ان کی شادی ڈاکٹر جان محمد سایانی سے ہوئی تھی جو کہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رحمت اللہ سایانی (1902-1847) کے بھتیجے تھے۔ ڈاکٹر سایانی خود بھی قومی تحریک میں معاون ہونے کے ساتھ ساتھ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے معالج خصوصی بھی تھے۔ انھوں نے کلثوم سایانی کو بھی قومی، سیاسی

اور سماجی کاموں میں حصہ لینے کا حوصلہ دیا۔ کلثوم سایانی نے تعلیم خصوصی طور پر تعلیم بالغان میں اپنی دلچسپی کی وجہ سے اپنا زیادہ تر وقت بمبئی کے لوگوں کو چرخہ کلاس میں حصہ لینے کی ترغیب دینے کے لیے وقف کیا۔ وہ 1930 میں یونٹی کلب کی سکریٹری مقرر ہوئیں، جس کا مقصد عوامی شعور کو بیدار کرنا تھا۔ انھیں 1938 میں کانگریس حکومت کی جانب سے قائم کردہ پہلی قومی پلاننگ کمیٹی کی خاتون رکن کے طور پر نامزد کیا گیا، انھوں نے اس موقع کا بہترین استعمال کیا اور خواتین کو بااختیار بنانے کی سمت اہم اقدامات اٹھائے۔ انھوں نے گھریلو تعلیم کی اسکیم تیار کی اور مسلم خواتین کے درمیان کام کرنا شروع کیا۔ بیگم کلثوم سایانی نے بمبئی میں بی جی کھیر (1957-1888) کی قیادت میں قائم 1937 کی حکومت میں تعلیم بالغان کی جو کمیٹی بنی تھی وہ پہلے اس کی رکن کے طور پر نامزد کی گئیں اور بعد میں اس کی نائب صدر کے عہدے پر بھی فائز ہوئیں۔ وہ ہنسہ مہتا (1995-1897) کی گرفتاری کے بعد آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی 1943 میں ایکٹنگ جنرل سکریٹری مقرر ہوئیں اور 1944 تا 1946 کے درمیان انھوں نے باقاعدہ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن، نئی دہلی کی آغاز سے ممبر تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستانی پرچار سبھا کی بھی شروع سے ہی ممبر رہیں، جس کے تحت انھوں نے متعدد تعلیمی لیکچر اور سمیناروں کا انعقاد کیا۔ اور اس طرح انھوں نے گاندھی جی کے مشن کو آگے بڑھایا۔

کلثوم سایانی نے آزادی کے بعد نئے ہندوستان کی تعمیر وترقی میں ایک سرگرم کردار ادا کیا۔ حکومت نے بھی ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کو کئی کمیٹیوں اور اداروں میں ممبر کی حیثیت سے جگہ دی، مثلاً جسٹس آف پیس، بچوں کی عدالت کی آنریری مجسٹریٹ، سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، قومی یکجہتی کانفرنس، ریڈیو ایڈوائزری بورڈ، بمبئی اور فلم سنسر بورڈ بمبئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے تعلیم بالغان سے متعلق کئی بین الاقوامی کانفرنسوں اور ورکشاپس میں شرکت کی۔ وہ یونسکو کی تعلیم بالغان کی مشاورتی کمیٹی میں ہندوستانی کی نمائندہ تھیں۔ بیگم سایانی کو 1959 میں حکومت ہند نے پدم شری ایوارڈ سے نوازا اور 1969 میں انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی جانب سے ان کو نہرو لٹریسی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بیگم سایانی کا انتقال 28 مئی 1987 کو چھیاسی برس کی عمر میں ہوا۔

رہبر کا اجرا

1940 میں انھوں نے سادہ ہندوستانی میں ایک پندرہ روزہ اخبار 'رہبر' جاری کیا۔ رہبر کے زیادہ تر مضامین سماجی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی ہوتے تھے اس کا مقصد وہ لوگ جو نئے پڑھے لکھے ہیں، ان کو ہندوستانی زبان میں تعلیم دینا تھا۔ یہ ایک قوم پرست اخبار تھا اور یہ اردو کے علاوہ دیوناگری اور گجراتی رسم الخط میں بھی شائع ہوتا تھا۔ 16 جنوری 1945 کو لکھے گئے خط میں گاندھی جی نے سایانی کو بیٹی کلثوم کے نام سے مخاطب کیا اور ان کے پندرہ روزہ اخبار کی تعریف کی۔ انھوں نے لکھا: ''مجھے رہبر کا ہندی اور اردو کو متحد کرنے کا مشن پسند ہے، میں اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں''۔ 1942 میں سیکڑوں مجاہدین آزادی جو کہ سیاسی قیدی کے طور پر ملک بھر کے جیلوں میں بند تھے، رہبر کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں اس نے مختلف زبان بولنے والے سیاسی قیدیوں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دی۔ کلثوم سایانی نے پندرہ روزہ رہبر کو 20 برس 1940 تا 1960 تک جاری رکھا اور وہ پوری طرح اس کی ادارت سے منسلک رہیں۔ رہبر کے وسیلے سے انھوں نے گاندھی جی کے ہندوستانی زبان کے نظریے کو فروغ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم بالغان کے مشن کو بھی پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

راقم الحروف کو پندرہ روزہ 'رہبر' کی جلد 7 نمبر 15،15 فروری 1947 کے پرچے کا پہلا صفحہ ردی کی دوکان سے حاصل ہوا۔ اس کے سرورق کا جائزہ لینے پر یہ معلومات حاصل ہوتی ہے کہ یہ رسالہ دو کالموں میں ٹیبلائیڈ شکل میں چھپتا تھا۔ جس کی قیمت فی پرچہ ڈیڑھ آنہ تھی۔ سرنامے پر 'بالغوں کا پندرہ روزہ اخبار' اور پھر اس کے ذیل میں جلی حروف میں ٹائیٹل 'رہبر' درج ہے۔ اس کا مقصد نوآموز بالغوں میں تعلیمی اور سیاسی شعور کو پروان چڑھانا تھا۔ رہبر کے مضامین ہلکے پھلکے ہوتے تھے اور ان کی زبان آسان ہندوستانی ہوتی تھی۔

مذکورہ پرچے کا جائزہ لینے پر یہ پتا چلتا ہے، کہ اخبار کا آغاز 'نیک بات' کی سرخی سے ہوتا ہے، جس کے تحت یہ حدیث درج ہے 'عالم کی سیاہی کی بوند شہیدوں کے خون کے برابر ہے'۔ اس کے بعد اپنی باتیں کے تحت قومی، سیاسی، اور سماجی خبریں درج ہیں۔ بیرسٹر آصف علی کے امریکہ میں پہلا سفیر مقرر ہونے کی خبر ہے نیز مولانا ابوالکلام آزاد کے وزیر تعلیم مقرر کیے جانے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک خبر سبھاش چندر بوس کے جنم دن پر لوگوں کی ہلڑ بازی پر ہے اور اس پر سخت اعتراض جتایا گیا ہے۔ بمبئی میں ہوئے فساد پر بھی ایک خبر ہے، جس پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ اخبار میں خواتین کی اصلاح کے لیے مضامین بھی شامل ہیں۔

ہاجرہ بیگم اور ان کا ماہنامہ 'روشنی'

ہاجرہ بیگم (2003-1910) کا تعلق رامپور کے

ایک معروف خانوادے سے تھا۔ ان کی پیدائش سہارنپور میں 24 دسمبر 1910 کو ہوئی۔ والد ریاست رام پور میں نائب تحصیلدار تھے۔ والدہ کا انتقال بچپن میں ہوا۔ ابتدائی روایتی تعلیم گھر پر ہوئی 1926 میں کوئینز میری کالج، لاہور سے میٹری کولیشن کیا۔ پہلی شادی خاندان میں ہوئی لیکن شوہر سے نبھی نہیں اور انھوں نے 1932 میں طلاق لے لی۔ 1933 میں وہ اپنے دو سالہ بیٹے کے ساتھ لندن گئیں جہاں انھوں نے مانٹی سوری کالج ٹیچرس کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ لندن میں وہ سجاد ظہیر (1973-1899) اور دیگر ہندوستانی طلبا کے ساتھ کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوگئیں۔ واپس آنے کے بعد وہ کرامت حسین کالج، لکھنؤ میں ٹیچر انچارج کی حیثیت سے منسلک ہوگئیں جہاں ان کا تقرر ٹیچر انچارج جونیئر اسکول ہوا۔ لکھنؤ میں ہی انھوں نے سجاد ظہیر کے ساتھ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کے لیے کام کیا۔ اس دوران وہ کمیونسٹ پارٹی کے لیے پی سی جوشی (1980-1907) کے ساتھ بھی خفیہ طور پر کام کرتی رہی تھیں۔ 1935 میں ہی انھوں نے معروف کمیونسٹ لیڈر زیڈ اے احمد (1999-1908) کے ساتھ دوسری شادی کی۔ یہ شادی سجاد ظہیر کے مکان پر ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد دونوں نے الہ آباد میں کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ ہاجرہ احمد نے پارٹی کے حکم سے انڈین نیشنل کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی کی رکنیت بھی حاصل کی۔ اس دوران وہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم ممبر کے طور پر بھی خفیہ طور پر کام کرتی رہیں۔ اس خفیہ کام کرنے والوں کی ٹیم میں زیڈ اے احمد اور کنور محمد اشرف (1962-1903) بھی شامل تھے۔ 1936 میں انھوں نے کانگریس کے ماس کانٹیکٹ پروگرام کے تحت خصوصی طور پر خواتین کے لیے کام کیا اور 1937 کے ضمنی انتخابات میں سرگرم رول ادا کیا۔ وہ کانگریس کے فیض پور، ہری پور اور رام نگر کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئیں۔ 1940 میں ہاجرہ بیگم اور زیڈ اے احمد کانگریس سے علیحدہ ہوگئے اور کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ہاجرہ بیگم نے 1940 میں آل انڈیا وومینس کانفرنس کی آرگنائزنگ سکریٹری کے طور بھی خدمات انجام دی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار 'قومی جنگ' کی مستقل مضمون نگار تھیں۔ انھوں نے اس دوران ٹریڈ یونین تحریکوں اور خواتین کی تنظیموں میں نمایاں کام کیا، قومی یکجہتی اور امن پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا نیز پنڈت سندر لال کی رہنمائی میں امن دستوں میں شامل ہوکر فرقہ وارانہ فسادات ختم کرانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ آزادی سے قبل اور بعد میں ملک میں پیدا ہوئے فرقہ وارانہ حالات کا انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور پنجاب اور سرحدی علاقوں میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے تدارک کے لیے دیگر خواتین کے ساتھ دورے کیے، علاقائی امن کمیٹیاں قائم کیں اور آپسی بھائی چارے کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں پھنسی ہوئی خواتین اور بچیوں کی حفاظت کے ساتھ بازیابی کروائی اور ان کو ان کے خاندان والوں تک بحفاظت پہنچایا۔ 1949 میں حکومت کے کمیونسٹوں کے خلاف کریک ڈاؤن میں ان کو بھی گرفتار کیا گیا اور وہ پانچ برس لکھنؤ جیل میں قید رہیں۔ ہاجرہ بیگم کا انتقال 20 جنوری 2003 کو ہوا۔

ماہنامہ روشنی کا اجرا اور اس کی ادارت

ماہانہ روشنی ہاجرہ بیگم نے بمبئی سے 1946 میں جاری کیا تھا۔ یہ انجمن خواتین ہند (آل انڈیا وومین کانفرنس) کا ماہانہ رسالہ تھا اور یونائیٹیڈ فائن آرٹ لیتھو، مازگاؤں، ممبئی سے چھپتا تھا۔ یہ رسالہ 34 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس رسالے کا مقصد خواتین کو معاشی طور پر خود اختیار بنانا تھا اور اس کی اصلاح کی تدابیر کرنا تھا نیز ان کے اندر قومی معاملات سے متعلق سوجھ بوجھ پیدا کرنا تھا۔ تاکہ وہ بعد آزادی ہندوستان کی ترقی میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ اس کی مجلس ادارت میں لیڈی راماراؤ، بیگم معصومہ حسین علی خاں، مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز رامیشوری نہرو، بیگم کلثوم سایانی اور راج کماری امرت کور شامل تھیں۔ ریختہ کی ویب سائٹ پر راقم الحروف کو روشنی کے تین پرچے دستیاب ہوئے ہیں، جن میں دو آزادی سے قبل کے اور ایک آزادی کے بعد کا ہے۔ ان تینوں پرچوں کا معروضی جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے نے آزادی سے قبل اور بعد میں فرقہ وارانہ حالات کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور خواتین کو سیاسی طور پر بیدار کرنے میں بھی اس کی کوششیں بہت نمایاں تھیں۔ ان شماروں کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف خواتین قلم کاروں کے مضامین ہی شامل ہوتے تھے۔

ہمارے سامنے جلد 1 کا شمارہ چار بابت اگست 1946 موجود ہے جس کا اداریہ 'کانفرنس کی نئی تجویزیں' کے عنوان سے ہے۔ جس میں مدیر نے انجمن خواتین ہند کی کانفرنس میں جو تجویزیں پاس کی ہیں ان پر گفتگو کی ہے نیز ہندوستان کے سماجی وسیاسی منظرنامے پر جو تبدیلی آرہی تھی، اس پر بھی روشنی ڈالی، اداریے کا یہ اقتباس دیکھیں:

''آج ہندوستان میں صرف پڑھے لکھے لوگوں میں ہی ہل چل نہیں ہے بلکہ ان لوگوں میں بھی ایک نئی بیداری پائی جاتی ہے جو ابھی تک آزادی کی لڑائی سے بہت دور رہتے تھے۔ کارخانوں کے ضروری نہیں بلکہ کلرک، ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیچر میونسپلٹی کے مہترحتیٰ کی اینگلو انڈین اور عیسائی لڑکیاں، پولس اور فوج کے سپاہی تک نڈر ہوکر اپنی حالت بہتر کرنے کے لیے احتجاج کر رہے ہیں۔ اسی طرح ایسی ریاستوں کے رہنے والے جو ابھی تک باقی ہندوستان کے رہنے والوں سے الگ رکھے جاتے تھے ایسا راج اپنی ریاستوں میں قائم کرنے کی تحریک کر رہے ہیں۔ جس میں ان کی بھی شنوائی ہو۔ جہاں ان کو اختیار دیے جائیں اور جہاں صرف راجہ اور نواب کی نادر شاہی نہ ہو بلکہ عام لوگوں کے صلاح مشورے سے کام کیا جائے۔''

ایک مضمون 'ہماری غلہ کی دوکان' کے عنوان سے بھی اس شمارے میں شامل ہے، جس میں بڑودہ میں انجمن خواتین نے غریب لوگوں کے لیے راشننگ کا جو نجی طور پر انتظام کیا تھا اس کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک مضمون صوبۂ بمبئی کی کوآپریٹو سوسائٹی کی تجویز پر ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس طرح کی کوآپریٹو سوسائٹیوں سے خواتین کس طرح فائدہ اٹھا سکتی ہیں اور خواتین کو امپاور کرنے اور ان کو با اختیار بنانے میں کس طرح مدد کی ہے۔ اسی شمارے میں ایک مضمون معروف سماجی کارکن رامیشوری نہرو (1966-1886) اور ان کے خواتین کے لیے اصلاحی کارناموں پر ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کی صحت اور ان کی تربیت پر بھی کالم ہے۔ خبروں کے تحت ریاست سانگلی میں میونسپلٹی اور دوسری چنی ہوئی کمیٹیوں میں عورتوں کی نمائندگی پر بات کی گئی ہے۔ ایک

مضمون 'اٹلی کی عورتیں' کے عنوان سے بھی شامل ہے۔

روشنی کے جلد2 نمبر1، 2 بابت مئی جون 1947 کے پرچے میں اداریہ پنجاب میں فساد پر ہے جس میں انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے، کہ جس طرح خواتین کو زودکوب کیا گیا ہے وہ ہندوستانیوں کے لیے افسوس ناک بات ہے۔ تقسیم کے وقت فسادات میں سب سے زیادہ متاثر عورتیں اور بچے ہوئے۔ ہاجرہ بیگم اس سے بہت متاثر تھیں۔ وہ اپنے اداریے میں لکھتی ہیں:

''جو نتیجہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے وہ تو یہی کہ آج کی سیاست ہماری ترقی تعلیم، سماج سدھار، قومی ایکے اور سیاسی آزادی کی سب ہی سوالوں کو دن بہ دن زیادہ مشکل بنائی جارہی ہے اور ہمارا عزم کہ ہم ہندوستان کی عورتوں کو ایک مضبوط کڑی کی باندھ دیں گے اور اس کا سلسلہ دنیا کی عورتوں کی تحریک سے ملادیں گے۔ روز بروز زیادہ دشوار ہوتا جارہا ہے۔ مگر ہماری انجمن نے عورتوں کی خدمت اور امداد، ان کی تنظیم اور آزادی کا کام جو ہاتھ میں لیا ہے۔ اس کو ہم نہ چھوڑیں گے ہندوستان ہو یا پاکستان ہو۔ عورت ذات کی مجبوریاں اور ضرورتیں بدستور قائم ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش ہم جاری رکھیں۔

پنجاب کی دکھی عورتوں کے ساتھ ہماری گہری ہمدردی ہے ساتھ ہی ہم اپنی ان بہادر بہنوں کو مبارک باد دیتے ہیں جو کہ نفرت اور انتقام کے جذبوں سے بالاتر ہیں۔ وہ سیکڑوں مسلمان بہنیں جنھوں نے اپنی جان پر کھیل سکھ عورتوں اور بچوں کو پناہ دی اور ان کی امداد کی، وہ ہمت والی سکھ اور ہندو عورتیں جنھوں نے مسلمان مرد اور عورتوں کی جان اور عزت کو بچایا۔

ہماری انجمن کی بہنیں پنجاب میں اب بھی پوری تندہی سے کوشش کررہی ہیں کہ پنجاب کی عورتیں سمجھ جائیں کہ آپس میں لڑوانے والا کون ہے اور ہندو مسلمان اور سکھ کی لڑائی سے کس کی طاقت مضبوط ہوتی ہے، تاکہ ان کا غم اور غصہ ان کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کردینے کی بجائے مل کر اپنے دشمن سے لڑنے پر تیار کرے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی یہ کوشش ئوبے کار نہ جائے گی اور پنجاب اور ہندوستان بھر میں وہ اس ایکے کو قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوگی جس کے بغیر ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوسکتے اور ملک کو صحیح معنوں میں آزاد نہیں کرواسکتے۔''

اسی پرچے میں معروف سماجی مصلح اور مجاہد آزادی کملا دیوی چٹوپادھیا (1988-1903) کا ایک مضمون بعنوان 'انجمن کو کیا کرنا ہے؟' شامل ہے، جس میں انجمن کے مقاصد کے بارے میں درج کیا گیا ہے اور اس کو عملی طور پر فعال بنانے کے لیے اقدامات بتائے گئے ہیں۔ 'پنجاب کے فساد اور ہمارا کام' کے عنوان سے ایک تحریر پورن مہتا کی بھی ہے۔ چوڑیاں بنانے والی کے عنوان سے ایک مضمون حسنہ بیگم انصاری کا ہے، جس میں انھوں نے ان خواتین کی حالت زار اور ان کی غربت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو اس صنعت سے وابستہ ہیں نیز ان کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی جانب اقدام کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ ایک اچھا جائزہ ہے۔ ایک مضمون 'کرناٹک میں کستوربا فنڈ کا کام' اومابائی کنڈا دیوی کا ہے۔ آخیر میں تھیٹر کی معروف شخصیت اور پنجابی زبان کی معروف شاعرہ شیلا بھاٹیہ (2008-1916) کی ایک طویل پنجابی نظم 'ہندیو! بےخبرو' پیش کی گئی ہے۔

'روشنی' آزادی کے بعد لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔ اس کا شمارہ10، جلد2 بابت فروری 1948 گاندھی جی کی شہادت پر خصوصی شمارہ تھا۔ جس میں مدیرہ ہاجرہ بیگم نے 8 صفحات پر مشتمل ایک طویل تعزیتی اداریہ گاندھی جی کی یاد میں تحریر کیا۔ مدیرہ نے اپنی اس تحریر میں گاندھی جی کی خواتین کو بیدار کرنے کی سمت میں جو خدمات رہی ہیں، اس پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی ہے۔ مدیرہ اپنے اس اداریے میں رقمطراز ہیں:

''ہندوستان کی عورتوں کو آزادی کی تحریک میں شریک کرنے میں گاندھی جی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ہر تحریک میں انھوں نے ملک کی رہنما خواتین کو اپنے مشوروں میں شریک کیا اور ان کے لیے خاص کام اور خاص جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پہلی ستیہ گرہ کمیٹی میں مسز سروجنی نائیڈو اور انسوما بہن ان کی شریک تھیں۔ ہریجن کام میں مسز رامیشوری نہرو اور راجکماری امرت کور کو انھوں نے اپنے ساتھ رکھا، خلافت تحریک میں ہزاروں مسلمان عورتیں ان کا پیغام سن کر آگے بڑھیں اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوئیں کستوربا کے مرنے پر ان کی یادگار میں انھوں نے دیہاتی عورتوں اور بچوں کی امداد کا ادارہ قائم کیا۔ ہندوستان کی عورتوں کو انھوں نے سپاہی بننا سکھایا، دیش سیویکا بنایا، وردی پہنوا کر میدان عمل میں لاکھڑا کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کی عورتیں رورہی ہیں کہ ان کا ایک بڑا سرپرست اور معاون دنیا سے اٹھ گیا۔''

ایک ایسے دور میں جب عام طور پر ہندوستانی مسلمان خواتین کے بارے میں یہ تصور قائم تھا کہ وہ گھریلو ہوتی ہیں نیز ان کا کام خاندان کو سنوارنا اور ان کی خدمت کرنا ہوتا ہے، اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیگم خورشید خواجہ، بیگم کلثوم سایانی اور ہاجرہ بیگم کی زندگیاں قومی آزادی کی جدوجہد سے عبارت ہیں۔ انھوں نے اپنی روشن خیالی، اپنی قوت ارادی، اپنے عمل سے پرانی دقیانوسی رسوم وروایات کو توڑا اور اپنے جرائد اور اپنی صحافت کے وسیلے سے جدوجہد آزادی کی تحریک میں روشن مثال قائم کی۔ وہ نہ صرف آزادی کی لڑائی میں پیش پیش رہیں بلکہ انھوں نے صنف نسواں میں سیاسی، سماجی اور تعلیمی بیداری، اور شعور پیدا کرنے اور ان کو بااختیار بنانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

ماخذات وحوالے

1 نقوی، سید محمد اشرف، اختر شاہنشاہی، لکھنؤ، 1888

2 صابری، امداد، تاریخ صحافت اردو، حصہ دوم، حصہ سوم، حصہ چہارم، حصہ پنجم، دہلی، 1953، 1974، 1983

3 خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام، کاروان صحافت، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1966

4 ارشد، محمد (مرتب)، ہندوستانی صحافت۔ محمد عتیق صدیقی کے صحافتی مضامین، 2001

5 فاروقی، محبوب الرحمن اور کاظم، محمد (مرتبین)، آج کل اور صحافت، پبلی کیشن ڈویژن، دہلی، 2000

6 سمیع الدین، ڈاکٹر عابدہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ 1900

7 اختر، ڈاکٹر جمیل، اردو میں جرائد نسواں کی تاریخ، جلد اول، دہلی، 2016

8 چندن، جی، ڈی، اردو صحافت کا سفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2007

9 فاروقی، اسعد فیصل، علی گڑھ میں اردو صحافت، علی گڑھ، 2016

10 دہلوی، انور علی، اردو صحافت، اردو اکاڈمی، دہلی، 1987

11 ماہنامہ، تہذیب نسواں، لاہور 20 دسمبر 2913

12 ہفت روزہ 'ہند'، علی گڑھ (جلد1، شمارہ نمبر 16 بابت 27 ستمبر 1922)

13 پندرہ روزہ ''رہبر''، بمبئی (جلد7 نمبر 15، بابت 15 فروری 1947)

14 ماہنامہ ''روشنی''، بمبئی لکھنؤ (جلد1، شمارہ4، اگست 1946، جلد2، شمارہ1، 2، مئی جون 1947، جلد2، شمارہ10، فروری 1948)

15 https://www.s-asian.cam.ac.uk, interview Kulsum Sayani

■

Dr. Asad Faisal Farooqui
Dept of Mass Communication
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 9412595891
Email.: asadfaisalamu@gmail.com

ہندوستان کا سو سالہ قدیم اردو اخبار

روزنامہ رہنمائے دکن

عبدالرحمن پاشا

رہبر دکن سے رہنمائے دکن تک کا تابناک سفر

رہبر دکن، دکن کا قدیم اردو اخبار رہا ہے، جو آج بھی رہنمائے دکن کے نام سے جاری ہے۔ 'حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات: ایک جائزہ' نامی کتاب کے مصنف محمداعجاز الدین حامد روزنامہ رہبر دکن کی تاریخ کے ضمن میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''سید احمد محی الدین نے اپنی ادارت میں یکم اگست 1921 کوافضل گنج، حیدرآباد سے ایک روزنامہ جاری کیا جس کا نام 'رہبردکن' تھا۔ رہبر دکن جن حالات میں جاری ہوا وہ حالات اردو اور صحافت دونوں کے لیے ناسازگار تھے، اخبار کا جاری ہونا بڑا مشکل کام تھا لیکن سید احمد محی الدین نے اپنی بے باکانہ صحافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس اخبارکو جاری کیا جو آگے چل کر شہر حیدرآباد کا ایک عظیم اخبار ثابت ہوا۔

رہنمائے دکن نے اب سے ایک صدی قبل جو سفر شروع کیا تھا، وہ سفر اب بھی جاری ہے۔ یہ سفر نہ صرف جاری ہے بلکہ اقبال کے ایک مصرعے کے مطابق 'تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول' کے مصداق مسلسل آگے کی طرف رواں دواں ہے۔ ایک صدی قبل رہنمائے دکن (سابق نام رہبر دکن) نے صحافت کے میدان میں قدم رکھ کر جو سفر شروع کیا تھا، اس نے اب ایک روشن تاریخ رقم کی ہے۔ بے سروسامانی اور کم وسائل کے باوجود شروع کیا گیا سفر پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ روزنامہ رہنمائے دکن کا مقصد ہمیشہ سے ہی بروقت اور بے باک انداز میں قارئین تک خبروں کو پہنچانا رہا ہے۔ بلیک اینڈ وائٹ سے لے کر ملٹی کلر تک رہنما کا پورا سفر قارئین کے سامنے ہے۔ اس دوران رہنمائے دکن نے ماہر ترین صحافیوں کی پوری ایک نسل تیار کی۔ اردو زبان و ادب کی اشاعت اور فروغ کے ضمن میں اردو اخبارات کا اہم کردار رہا ہے۔ رہنمائے دکن نے اس حوالے سے قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ قارئین کی کئی نسلیں اس سے وابستہ رہی ہیں۔ نہ صرف ریاست تلنگانہ و آندھرا پردیش میں بلکہ پورے جنوب میں اردو کی اشاعت اور اس کے فروغ کے ضمن میں رہنمائے دکن اپنے اجرا کے روز اول سے ہی پیش پیش رہا ہے۔

رہنمائے دکن سے قبل رہبر دکن کی تاریخ

رہبر دکن، دکن کا قدیم اردو اخبار رہا ہے، جو آج بھی رہنمائے دکن کے نام سے جاری ہے۔ 'حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات: ایک جائزہ' نامی کتاب کے مصنف محمداعجاز الدین حامد روزنامہ رہبر دکن کی تاریخ کے ضمن میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''سید احمد محی الدین نے اپنی ادارت میں یکم اگست 1921 کو افضل گنج، حیدرآباد سے ایک روزنامہ جاری کیا جس کا نام 'رہبر دکن' تھا۔ رہبر دکن جن حالات میں جاری ہوا وہ حالات اردو اور صحافت دونوں کے لیے ناسازگار تھے، اخبار کا جاری ہونا بڑا مشکل کام تھا لیکن سید احمد محی الدین نے اپنی بے باکانہ صحافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس اخبار کو جاری کیا جو آگے چل کر شہر حیدرآباد کا ایک عظیم اخبار ثابت ہوا''۔[1]

رہبر دکن کے بانی مدیر سید احمد محی الدین کے بارے میں رہنمائے دکن کے سابق مدیر سید محمود وحید الدین اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ ''سید احمد محی الدین کے دادا مولوی احمد علی صاحب حیدرآباد کے پہلے چیف جسٹس تھے۔ سید احمد محی الدین صاحب کے والد تحصیلدار تھے۔ سید احمد محی الدین صاحب 1898 میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ اور مدراس یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ کئی اچھے آفرز تھے لیکن انھوں نے اخبار ہی نکالا۔ سنہ 1921 میں 'رہبر دکن' جاری ہوا۔ یہ اس زمانے میں بھی انگلینڈ، مصر، عرب اور افغانستان جاتا تھا''۔[2]

کئی برسوں تک اخبار پوری شان کے ساتھ سید احمد محی الدین کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ سنہ 1942 میں سید احمد محی الدین کا انتقال ہوگیا اور حامد محی الدین اس اخبار کے مدیر بنائے گئے۔ صرف ایک سال تک وہ اس اخبار سے وابستہ رہے چونکہ ان کی تقرری حیدرآباد سول سروس میں ہوگئی۔ اسی لیے ان کو اخبار چھوڑنا پڑا اور ان کی جگہ سید محمود وحید الدین اس اخبار کے مدیر نامزد ہوئے۔ انڈین یونین کی جانب سے سنہ 1948 میں مملکت دکن پر پولیس ایکشن اور بقول سید محمود وحید الدین قادری 'ملٹری ایکشن' تک بھی سید محمود وحید الدین رہبر دکن کے مدیر رہے، لیکن ملٹری ایکشن کے بعد رہبر دکن پر پابندی لگادی گئی۔

خاکسار نے کتاب 'حیدرآباد کے اردو روزناموں

کی ادبی خدمات' کے مصنف سید ممتاز مہدی (فرزند سید منجو قمر یداللہ) سے اپنی ملاقات کے دوران سوال کیا کہ آزادی ہند سے قبل رہبر دکن پر پابندی اور اس کو بند کرانے کی کیا وجہ رہی؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ اخبار اس زمانے میں مملکت دکن کے حکمران حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی خوب تائید کرتا تھا اور نظام دکن سے متعلق خبروں اور ان کے عوامی فرامین کو خاص کر شائع کرتا تھا اور حضور نظام کی شاعری کو بھی مناسب جگہ دی جاتی تھی۔ اس دوران انڈین یونین کی جانب سے بہت سی مطلوب شخصیات پر پابندی لگائی گئی تھی۔ اسی طرح اخبار رہبر دکن کو بند کر دینا پڑا۔

پولیس ایکشن کے بعد رہنمائے دکن کا اجرا

سید ممتاز مہدی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''پولیس ایکشن کے بعد رہبر دکن کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کی اجازت نہیں ملی۔ حتیٰ کہ مدیر کی حیثیت سے جناب محمود وحید الدین صاحب کے نام پر کسی نئے اخبار کا اجرا دشوار ثابت ہونے پر محمد منظور حسن کی ادارت میں 'رہنمائے دکن' جولائی 1949 میں جاری ہوا۔ محمد منظور حسن صاحب ادارہ رہبر دکن سے وابستہ رہے تھے۔ لہٰذا رہنمائے دکن کے مینیجنگ ایڈیٹر کے فرائض تو وہ ادا کرتے رہے لیکن اس روزنامے کے کرتا دھرتا اور مالک سید محمود وحید الدین ہی تھے۔ سنہ 1976 میں سید محمود وحید الدین نے سید لطیف الدین قادری کو ادارت سپرد کر دی جب کہ منظور حسن صاحب نومبر 1968 میں سبکدوش ہوگئے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد 20 جنوری 1984 کو سید لطیف الدین قادری کا انتقال ہوگیا اور سید وقار الدین قادری رہنمائے دکن کے مدیر ہوگئے۔''[3]

سید ممتاز مہدی رہنمائے دکن کی ادبی خدمات کو ناقابل فراموش قرار دیتے ہوئے اس کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ مہدی کے مطابق ''پہلا دور 1949 تا 1958 کا ہے۔ جس میں ادب کی جانب خاص توجہ نہیں دی گئی۔ دوسرا دور 1959 تا 1965 کا ہے، جس میں گاہے گاہے ادبی نگارشات اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ تیسرا دور 1966 تا 1967 تک ہے۔ جو رہنمائے دکن کی ادبی خدمات کا سنہرا دور کہلانے کا مستحق ہے۔ چوتھے دور 1977 تا 1984 کو اپنے سنہرے دور کی یاد کو تازہ رکھنے کی ایک کوشش والا دور کہا جاسکتا ہے۔''[4]

واضح رہے کہ سید ممتاز مہدی نے ان ادوار کو ادب کے ضمن میں درجہ بندی کی ہے۔ دیگر پہلوؤں کے ضمن میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ 90 کے دہے میں رہنمائے دکن کا خوب چرچہ رہا ہے اور اس دور میں رہنمائے دکن کا طوطی بولتا تھا۔

ممتاز شخصیتوں اور قلم کاروں کا تعاون

ماضی میں رہنمائے دکن کو بالخصوص پورے خطہ جنوب اور بالعموم پورے ملک میں خاص مقبولیت حاصل رہی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کی ممتاز شخصیتیں اور اردو زبان وادب کے اہم قلم کاروں کا رہنما کو تعاون حاصل رہا۔ جن میں ماہر لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ماہر دکنیات نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر سید احتشام حسین، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد عبداللہ، کریم رضا، ایم باگاریڈی، سلیمان اطہر جاوید، ممتاز ادیب قاضی عبدالغفار، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، عابد صدیقی، مومن خان شوق، اوج یعقوبی، محمد طیب انصاری، ولی تنویر، غضنفر علی خاں، حسن فرخ، ظہیر الحق، عالم خوندمیری، پروفیسر حمید الدین شاہد، ڈاکٹر اسد انصاری، یوسف اثر غوری، نظیر علی عدیل، خرم نفیس، شجاع الدین شجیع (آئی آئی ایس)، ڈاکٹر شجاعت علی راشد، اکبر ہزاری (اے سی پی)، عبدالرحیم قریشی، عثمان شہید ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، برہان الدین سائنٹسٹ، ملک شہباز، حمید الدین محمود، عبدالقادر، مجلسی ایم ایل اے ممتاز احمد خان کے خسر، مظہر صاحب مشین آپریٹر، مسعود انصاری، ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز، فہیم الدین (محمد فہیم الدین ترک)، مقبول احمد اور بے شمار معروف وغیر معروف قلم کاروں کا تعاون شامل رہا۔ فہیم الدین ترک کو سنہ 1989 میں سب ایڈیٹر کی ذمے داری سونپی گئی اور وہ اس وقت رہنمائے دکن کے سب سے سینئر ترین صحافی ہیں، جو ہنوز اخبار سے وابستہ ہیں۔

خواتین میں جیلانی بانو، ڈاکٹر سیدہ جعفر، پروفیسر اشرف رفیع، نسیم بانو، ہچکچاں جہاں نور، مہر بانو مہر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اسی طرح آصف سابع نظام ہفتم نواب میر عثمان علی خاں کا نعتیہ کلام 'خسروشیریں' بھی شائع ہوا تھا۔ نامور ادبا وشعرا میں سلیمان خطیب، مولانا ظفر علی خاں، وحید اختر، فیض احمد فیض، آل احمد سرور، شاذ تمکنت، ندا فاضلی، سریٹ حیدرآبادی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، متین سروش، جگن ناتھ آزاد، حمید الدین شاہد، فائز چشتی، سید غلام حسین مضطر (مضطر مجاز)، علامہ نجم آفندی، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی، سعید شہیدی، طالب رزاقی، رائے منوہر لال بہار، پرنس معظم جاہ شجیع، مغنی تبسم، بیکل اتساہی، کنور مہندر سنگھ سحر، غلام ربانی تاباں، شمیم کرہانی، ڈاکٹر سید داؤد اشرف، پرویز یداللہ اور نیاز فتح پوری وغیرہ بھی رہنمائے دکن کے قلمی معاونین میں شامل رہے ہیں۔

رہنمائے دکن کی خصوصیات

اخبار پورے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اسے معاشرے کا ہر طبقہ پڑھتا ہے۔ رہنمائے دکن شروع سے ہی قارئین کی ضرورتوں کے پیش نظر کئی خصوصیات کا حامل رہا ہے۔ خاص کر رہنمائے دکن کا اداریہ ہر عام وخاص کی دلچسپی کا باعث رہا۔ ان اداریوں میں حالات کے اعتبار سے زبردست گفتگو کی جاتی اور عوام کو بہتر انداز میں رہنمائی بھی فراہم کی جاتی رہی، جو کہ ہنوز جاری ہے۔ وہیں مخصوص مواقع پر میلاد النبیؐ نمبر، شب معراج نمبر، شب برات نمبر، یوم عاشورہ نمبر، حضرت ابوبکر صدیق نمبر، رحمتہ اللعالمین نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، آصف سابع نمبر اور جامعہ عثمانیہ کے پچاس سال کی تکمیل کے موقع پر گولڈن جوبلی نمبر قابل ذکر ہے۔

رہنمائے دکن میں مشہور اور مقبول عام کالم بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'پسند اپنی اپنی' کالم میں قارئین اپنے اپنے پسندیدہ اشعار بھیجتے اور انھیں اہتمام سے شائع کیا جاتا۔ 'بچوں کا صفحہ' کے نام سے ایک مکمل صفحہ ہر ہفتے شائع ہوتا، جس میں کہانیاں، نظمیں، لطیفے، پہیلیاں اور انعامی معمے شائع ہوتے رہے۔ بعد میں اس کا نام 'طلبا و نوجوانوں کا صفحہ' کر دیا گیا، جو کہ بچوں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ سائنس وٹکنالوجی اور دیگر معلومات کے لیے مختص کر دیا گیا۔ طنزیہ ومزاحیہ کالم 'رہنما ور ہرؤ'، کتابوں پر تبصروں کے لیے 'نقد ونظر'، غالب کے اشعار کی تفہیم کے لیے کالم 'خلیفہ عبدالحکیم غالب کو سمجھیے'، عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے تعارف کے ضمن میں کالم 'ہماری جامعات' اور نثری وشعری تخلیقات کے لیے 'گلہائے صد رنگ' کالم کو قارئین ہاتھوں ہاتھ پڑھا کرتے تھے۔ سنہ 1976 تک ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے رہنما کے ادبی صفحے کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ وہیں آج بھی ہر پیر کو چار الگ صفحات پر مبنی 'رفتار سیاست' اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ جس میں سیاسی حالات کا تجزیہ، مذہبی مضامین اور شعر و ادب پر مبنی نگارشات کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

کتاب صحافتی کہکشاں کے مصنف ڈاکٹر محمد محبوب فرید لکھتے ہیں کہ ''رہنمائے دکن نے اردو ادب کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، انھیں تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''[5]

وقار صحافت سید وقار الدین قادری

مرحوم سید وقار الدین قادری (وفات 9 دسمبر 2021) اپنے بڑے بھائی سید لطیف الدین قادری کی 20 جنوری 1984 کو وفات کے بعد سے لے اپنی آخری سانس تک

رہنمائے دکن

روزنامہ رہنمائے دکن کے ایڈیٹر انچیف کے فرائض انجام دیتے رہے۔ سید وقار الدین قادری نے رہنما کو اکیسویں صدی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے اپنے دور ادارت میں اردو صحافت کو نیا وقار عطا کیا اور اخبار کو 'ہندوستانی مسلمانوں کا ترجمان' بنادیا ہے۔ اب اخبار کا ای ایڈیشن انٹرنیٹ پر دنیا کے ہر کونے میں دستیاب ہے، جسے بآسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ رہنما نے عالمی وبا کورونا وائرس (کووڈ۔19) کے دوران اپنے صفحات میں کوئی کمی نہیں کی، جب کہ دیگر اردو اخبارات نے اپنے صفحات میں کمی لائی ہے۔

سید وقار الدین قادری سے تاریخی انٹرویو

''بیسویں صدی میں اردو روزناموں کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے کہ صبح اٹھتے ہی ساری دنیا کی خبر ایک جگہ مل جاتی ہے، لہٰذا اخبار کی اہمیت اس دور میں جتنی بڑھ گئی ہے شائد سابق میں کبھی نہیں تھی۔ ٹی وی، ریڈیو وغیرہ مقررہ وقت پر سن سکتے ہیں۔ ریڈیو پر کئی زبانوں کے پروگرام آتے ہیں۔ اخبار میں ایسا ہے جس زبان کا چاہے لیں پورا مواد اسی زبان میں مل جائے گا۔ اسپورٹس کی خبریں، مذہبی خبریں، سیاسی خبریں، ادبی خبریں جب کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بیک وقت ان تمام چیزوں کو نہیں سن سکتے اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔ آزادی سے قبل یہاں نظام کی حکومت تھی اور صحیح معنوں میں آزادی کا تصور تو تھا ہی نہیں، جہاں جہاں بادشاہت تھی یا راجا، رجواڑوں کی حکومت تھی پھر بھی بڑی حد تک تنقید و تبصرہ کرسکتے تھے۔ آزادی مکمل ہونے کے باوجود بھی عام مسائل پر تنقید و تبصرے پر حکومت کارروائی ضروری کرتی تھی اور بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ ہمارے اخبار کو جو اس وقت رہبر دکن کے نام نکلتا تھا، تو ہم نے نظام سرکار پر بھی سخت تنقیدیں کیں۔ اس وقت کی رضا کار تنظیم پر بھی سخت تنقیدیں کیں اور اس وقت بھی حکومت نے سخت رویہ اختیار کیا اور ضمانت طلب کی گئی۔ مگر اس کے باوجود بھی ہم حق بات لکھنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے اور صحیح معنوں میں اردو صحافت اگر دکن میں نام کمائی ہے تو روزنامہ رہبر دکن کی وجہ سے جو آزادی سے قبل بارہ تا چودہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور ہمارے نامہ نگار لندن، واشنگٹن، قاہرہ اور دلی میں ہوتے تھے۔ جس کو ہم اپنے اخبار میں 'تازہ ترین تار' کے نام سے شائع کرتے۔ اس دور کے مقابلے میں آج تمام روزناموں کو زیادہ سہولتیں تو حاصل ہیں آج بھی کوئی روزنامہ اتنے زیادہ صفحات پر شائع نہیں ہوتا جیسا کہ رہبر دکن شائع ہوا۔

میرے والد اور میرے چچا مرحوم سید سیف الدین اور مرحوم سید محی الدین احمد نے اس کی بنیاد ڈالی۔ میرے والد منیجر تھے اور چچا ایڈیٹر تھے۔ ایک شعبہ ادارت دیکھتے تھے اور دوسرے اخبار کے دوسرے انتظامات کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سنہ 1920 میں رہبر دکن کی ابتدا ہوئی۔ میرے دادا اول تعلقدار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میرے تایا مرحوم سید عارف الدین انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلے گئے اور ان کے دو چھوٹے بھائی میرے والد اور میرے چچا نے اس وقت اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ صحافت اور ادب تو ایک سکے کے دو حصے ہیں۔ ویسے میں ادبی آدمی تو نہیں ہوں۔ مگر اردو اخبارات میں خاص طور سے ادب ضروری ہوگیا ہے۔ لہٰذا ہر اردو روزنامہ کے جو ہفتے وار ایڈیشن ہوتے ہیں اس میں ادب تنقید و تبصرے کے لیے اچھی خاصی جگہ فراہم کی جارہی ہے۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اخبار پڑھنے والوں کو ادب سے کتنی دلچسپی ہے۔ آج کل ایک روزنامے میں خبروں کے علاوہ کئی چیزیں شامل ہورہی ہیں، جیسے مذہبی خبریں، فلمی صفحے، تبصرے، اسپورٹس وغیرہ۔ یہ مسابقت کا دور ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ خبروں کے علاوہ زیادہ سے زیادہ مواد دیں تاکہ اپنی اشاعت میں اضافہ ہوسکے لہٰذا ہر اخبار والا اس بات کی کوشش کرے گا کہ روز بروز اضافہ ہو اور یہ اضافہ اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ قارئین کو بہتر سے بہتر مواد پیش کرسکیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک بڑا طبقہ جو روزانہ خبریں دیکھتا ہے وہ ادب کی خبریں نہیں پڑھتا ہے مگر ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو ادب پر باریک نظر رکھتا ہے اور کئی ایک مواقع ایسے آئے ہیں کہ انھوں نے توجہ بھی دلائی ہے۔ مشورے بھی دیے ہیں تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طبقہ ایسا ہے جس کو ادب سے بہت دلچسپی ہے جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔ ہم نے شاعری کے لیے زیادہ جگہ رکھی ہے چونکہ اس کا ریسپانس بہت ہی اچھا ہے۔ ہر اخبار کو اپنے قارئین کی خواہش کے مطابق ہی مواد دینا ہوتا ہے لہٰذا ہمارے اخبار میں جتنا مواد ادب کے بارے میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ شعر و شاعری کی نذر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ عوام کی پسند ہے۔ ہم نے ترقی پسند تحریک اور نہ ہی جدیدیت بلکہ ہمارے معاشرے کو سدھانے کی تحریکوں کا ساتھ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں ایک اچھا مسلمان، ایک اچھا ہندو ہی معاشرے کے لیے سب سے بہتر ثابت ہوسکتا ہے اور ایسی دنیا میں جہاں فری سوسائٹی ہے۔ مذہب کے ڈر و خوف سے ہی ہم نوجوان نسل کو مجھیے کہ متنبہ کرسکتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک یا جدیدیت کے بجائے ہم نے سائنس، ٹکنالوجی وغیرہ اور دیگر ترقیاتی چیزوں کو بڑی ترقی دی ہے''۔6

امید ہے کہ روزنامہ رہنمائے دکن اپنے اس محسن کی وفات کے بعد بھی پوری آن بان کے ساتھ جاری رہے گا۔ ادارے کے ذمے داران نئے زمانے کے ساتھ بہتر تبدیلیاں لاتے ہوئے رہنما کو مسابقت کے دور میں مزید آگے بڑھا سکتے ہیں۔

حواشی

1 محمد اعجاز الدین حامد، حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات: ایک جائزہ، ص 61
2 سید ممتاز مہدی، حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات، ص 386
3 ایضاً، ص 43
4 ایضاً، ص 45
5 ڈاکٹر محمد محبوب فرید، صحافتی کہکشاں، ص 45
6 سید ممتاز مہدی، حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات، ص 389

■

Abdul Rahman Pasha
H.No:1-4-549/2/B,
Bakaram, Musheerabad
Hyderabad- 500020 (Telangana)
Mob.: 9014430815
Email.: mrpasha1994@gmail.com

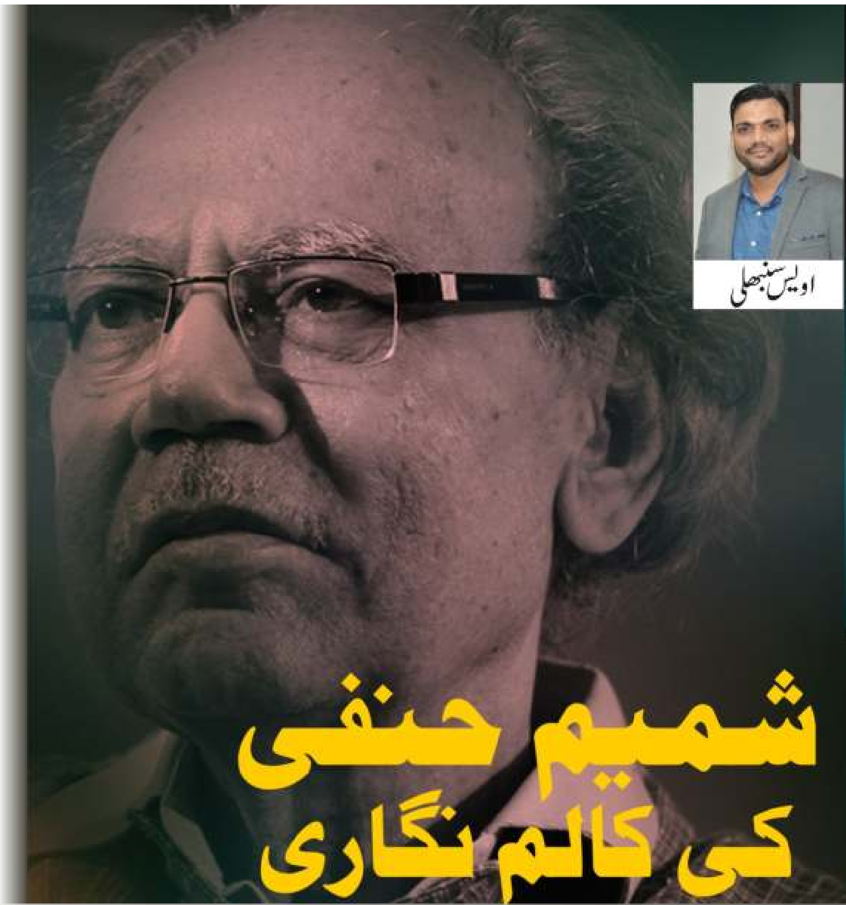

اویس سنبھلی

شمیم حنفی کی کالم نگاری

ماضی قریب میں اردو تنقید کو جن لوگوں نے اعتبار بخشا اور اس کے سبب اپنی شناخت مستحکم کی، ان میں شمس الرحمٰن فاروقی اور شمیم حنفی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ 25/دسمبر 2020 کو فاروقی صاحب وبائی مرض کورونا کا شکار بنے تو 6/مئی 2021 کو شمیم حنفی۔

شمیم حنفی (17/نومبر 1938–6/مئی 2021) ایک معروف نقاد، ڈراما نگار اور اردو ادب میں جدیدیت کے شارح و ترجمان تھے۔تنقید کے حوالے سے ان کا اہم کام،کہانی کے پانچ رنگ، اقبال کا حرف تمنا،قاری سے مُکالمہ، اردو کا تہذیبی تناظر، معاصر تہذیبی صورت حال، تاریخ،تہذیب،تخلیقی تجربہ،جدیدیت،نئی شاعری، اقبال اور عصرِ حاضر کا خرابہ،منٹو: حقیقت سے افسانے تک، میرا جی اور اُن کا نگارخانہ،ادب،ادیب اور معاشرتی تشدد اور خیال کی مسافت جیسی اہم کتابیں ہیں اور اسی میں جدیدیت سے متعلق ان کی کتابوں میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، جدیدیت اور نئی شاعری، اور نئی شعری روایت شامل ہیں۔شمیم صاحب نے ریڈیائی ڈرامے لکھے جو مٹی کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے اور بازار میں نیند کے نام سے شائع ہوئے۔تنقید، ڈرامہ کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے کالم بھی لکھے۔چونکہ شمیم حنفی اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی زبان و ادب پر بھی نظر رکھتے تھے، انھیں ادبیات کے علاوہ فنون لطیفہ سے بھی خاصا شغف تھا،اسی وجہ سے ان کے کالم محض حالات حاضرہ کے ترجمان نہیں ہوتے بلکہ ان کی حیثیت تہذیب و ثقافت کے آئینے کی بھی تھی۔

کالم نویسی کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔اداراتی صفحے پر کالموں کا سلسلہ مغرب میں شروع ہوا۔مشرق میں سجاد حسین کے رسالے 'اودھ پنچ' سے اس کی ابتدا ہوئی۔کالم نگار سیاست، سماجی مسائل، ادبی معاملات اور دیگر اہم موضوعات پر اپنا زاویہ نظر اختصار سے لکھتا ہے۔کالم کے ابتدائی دور میں اخبارات کم تعداد میں شائع ہوتے تھے،ان کے صفحات بھی کم ہوتے تھے۔لکھنے والے بھی کم ہی ہوا کرتے تھے۔اس وقت جید اور بلند پائے کے قلم کار ہی اخبار میں اہم موضوعات پر لکھتے تھے،جن میں بیشتر نے ادب کی دنیا سے کالم نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور اپنے پیچھے گراں قدر ادبی و علمی سرمایہ چھوڑ گئے۔وہ ہمیشہ ذمے داری سے لکھتے اور بُردباری کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ادبی کالم نگاری کا آغاز سجاد حسین کے رسالے 'اودھ پنچ' سے ہوا،جس میں مزاح نگاری اور لسانی لطافت سے بھی کام لیا گیا، کالم کے لیے لسانی چاشنی کی اہمیت ہوتی ہے۔اسی تناظر میں شمیم حنفی کی کالم نگاری کو دیکھا جاسکتا ہے، کہ انھوں نے اسے حالات اور واقعات کا منظرنامہ بنانے کے بجائے علوم وفنون کی دستاویز اور تہذیبی پیکر عطا کیا۔اپنی تنقیدی تحریروں کے علی الرغم کالموں میں صاف و شستہ زبان استعمال کی۔وہ اپنے کالموں کو کس انداز سے دیکھتے تھے؟ خود بیان کرتے ہیں:

"یہ کالم زندگی کے ادوار کی یادگار ہیں۔طالب علمی کے دور میں اس سلسلے کی شروعات ہوئی۔کئی اردو اور ہندی اخبارات سے بالواسطہ تعلق رہا۔گردوپیش کی دنیا میں جو صورت حال رونما ہوتی رہتی ہے، اس کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ اپنے ردعمل کو ظاہر کرنے کی ہوک بھی اُٹھتی رہتی ہے۔زندگی نہ تو میرے لیے خواب ہے، نہ صرف آرٹ اور ادب کے اسالیب کی گرفت میں آنے والی سچائی۔ادیب کے لیے صحافت کا میدان بھی کھلا ہوتا ہے، بقول جارج آرویل، ہنگامی حالات میں لکھا جانے والا ادب،سو یہ شغل بھی جاری رہنا چاہیے۔"

('یہ کس کا خواب تماشا ہے'مرتبہ خالد جاوید، عرشیہ پبلی کیشن، دہلی 2014،ص 13)

اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ کالم نگاری کے لیے صرف اس اضطراب کی ضرورت ہے، جو گردوپیش کے حالات سے ہوتا ہے۔ یہ ایک ہنگامی ادب بھی ہے، جو حالات کے پیش نظر پیدا ہوتا ہے اور سوچ کے دریچے وا کرتا ہے اور اس دریچے سے سوچ کو ردعمل کے طور پر الفاظ کا لبادہ پہنا کر قلبی اضطراب کو باہر نکالنے کا نام کالم نگاری ہے۔وہی ہوک اور اضطراب شمیم حنفی کے نوک قلم سے بھی کالم نویسی کی صورت میں نکلا، جسے خالد جاوید نے "یہ کس کا خواب تماشا ہے" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ان کالموں کے بارے میں وہ (خالد جاوید) لکھتے ہیں:

'یہ کس کا خواب تماشا ہے' کی تمام تحریروں کا تعلق انسان سے ہے اور ان کے بنیادی سروکار صرف انسانی ضمیر سے ہی وابستہ ہیں۔یہ کالم نہ تو محض سیاسی ہیں اور نہ ہی محض ادبی۔اگرچہ موضوعات کے اعتبار سے یہ سیاسی اور ادبی دونوں کہے جاسکتے ہیں، مگر ہمیں بخوبی یہ علم ہے کہ کالم میں ہمیشہ اپنے ذاتی خیال کا اظہار کیا جاتا ہے اور کوئی بھی خیال اپنے اظہار کے لیے بیان و الفاظ کا محتاج رہتا ہے۔اگر ان کالموں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اسلوب پر بھی بغور توجہ دی جائے تو ایک خصوصیت بہت واضح طور پر کھل کر سامنے آتی ہے اور وہ ہے بیانیہ میں پوشیدہ افسردگی اور ملال کی کیفیت۔افسردگی اور ملال بغیر انسان دوستی کے کبھی نہیں پیدا ہوتے، اگر کسی تحریر کے بنیادی سروکار "انسان" سے وابستہ نہیں ہیں تو اس میں شائستگی، شوخی، طنز و مزاح اور معنویت سب کچھ ہوسکتے ہیں مگر افسردگی یا اداسی نہیں۔شمیم حنفی کی زبان ایک زندہ وجودی تجربے کی بامعنی اور معتبر اداسی ہے جس کے بغیر انسان کا کوئی تعلق نہ تو کسی اخلاقی اقدار سے قائم ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کائنات سے جہاں دوسرے انسان بھی زندگی گزارتے ہیں اور بے جان اشیا بھی اپنا

مقام رکھتی ہیں۔'' (ایضاً ص 15)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ ان کے کالم سیاسی بھی ہوتے ہیں اور ادبی بھی۔ ان کے کالم وقت اور حالات کی نبض پر قلم بیانی تو کرتے ہی ہیں، زبان بھی شیریں اور جادو بیاں ہوتی ہے:

''اردو زبان اور رسم الخط کا مسئلہ تقریباً اتنا ہی اُلجھا ہوا ہے جتنا کہ بابری مسجد کا مسئلہ۔ اس سلسلے میں ایک طرح کی جارحانہ جذباتیت کا اظہار اردو رسم الخط کے حامیوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور اس کے مخالفوں کی طرف سے بھی۔ اردو رسم الخط کو پتہ نہیں جان بوجھ کر یا انجانے میں کچھ لوگ فارسی رسم الخط کہنے لگے ہیں۔ گویا کہ بات شروع اس نکتے سے کی جاتی ہے کہ اردو زبان چاہے دیسی ہو، اس کا رسم الخط بہرحال بدیسی ہے۔ راجندر یادو نے کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے مسئلے پر جو معروف اداریہ 'ہنس' میں لکھا تھا، اس میں اردو کا تذکرہ بھی تھا۔ اس طرح اردو کی فرقہ وارانہ حیثیت کی بالواسطہ طور پر تائید ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ موقف بھی درست نہ تھا، اسی لیے اس کے خلاف ردِ عمل بھی شدید ہوا۔ راجندر یادو کا کہنا یہ تھا کہ اس وقت سوال اُردو بھاشا کو بچانے کا ہے یا اُردو رسم الخط کو؟

اس ضمن میں ایک بات جو مجھے پریشان کرتی ہے، یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ مطالبہ صرف اردو ہی سے کیوں کیا جاتا ہے کہ وہ دیوناگری رسم الخط اپنا لے، اپنے بچاؤ کی خاطر۔ تو کیا صرف جان بچائی جاتی ہے، پہچان نہیں؟۔ تاج محل کا حسن اور دلآویزی کیا صرف اس کی بنائے تعمیر میں ہے، اس کی بناوٹ میں نہیں ہے؟ کیا کسی زبان کا وجود صرف اس کے مواد میں ہوتا ہے؟ اس کے بیرونی اسٹرکچر، اس کے روپ رنگ کا تصور کیا بے معنی ہے؟ رشید احمد صدیقی نے جب یہ کہا تھا کہ مغلوں نے ہندوستان کو تین تحفے دیے۔ اردو زبان، تاج محل اور دیوان غالب، تو کیا ان کے اس قول میں یہ رمز بھی شامل ہے کہ ان تینوں کی حقیقت کا ان کی ہیئت سے، ان کے بیرونی شناس نامے سے کچھ بھی تعلق نہیں؟ کیا کسی انسان کے وجود کی حفاظت اس کی کھال کھینچنے کے بعد بھی کی جاسکتی ہے؟'' (کالم 'اردو ہندی تنازعہ'، ص 347-346)

شمیم حنفی کی کالم نگاری میں فرد سے لے کر سماج تک نہ جانے کتنے کردار، کتنی چیزیں، کتنے رویے ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ان میں کتابوں کا ذکر ہے اور ان لوگوں کا بھی جن کی عمریں کتابوں میں بسر ہوئی ہیں۔ ہندستان کے بھرے پُرے سماج کی طرح اُردو کے علاوہ ادیبوں کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی مختلف النوع دلچسپیاں بھی، مثلاً کرکٹ، کپل دیو اور پروفیسر دیوراج، کتابوں کا کمبھ میلے۔ 'مشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر متذکرہ بالا دونوں کالموں کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں:

عجیب اتفاق ہے کہ اس سال عابد صاحب کی برسی کے روز بنگلور میں ہندوستان اور انگلینڈ کا کرکٹ میچ برپا تھا اور اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کی طرف سے غالب اکیڈمی میں اسی روز ڈاکٹر سید عابد حسین لیکچر کی تقریب تھی۔ عابد صاحب کو کھیلوں میں سب سے زیادہ شغف کرکٹ سے رہا۔ بیماری کے آخری زمانے میں بھی بستر پر لیٹے لیٹے کمنٹری سنتے رہتے تھے۔ جن دنوں وہ 'نئی روشنی' نکال رہے تھے، انھوں نے ہندوستان اور ایم سی سی کے درمیان ایک میچ پر معرکے کا انشائیہ لکھا تھا۔ اس کا ایک جملہ یاد آتا ہے: 'ہندوستانی کھلاڑیوں نے انگریزوں کو وکٹوں کے دوران اتنا دوڑایا، اتنا دوڑایا کہ وہ تھکن سے بے حال ہو گئے۔' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس میچ میں ہماری ٹیم کا کیا حال ہوا تھا۔ اس بار عابد حسین میموریل لیکچر کے لیے فلسفے کے مشہور عالم پروفیسر دیوراج مدعو کیے گئے تھے۔ جلسے کی صدارت بدرالدین طیب جی نے کی اور اس بات سے بہت بے مزہ ہوئے کہ کہاں کپل دیو کا چھکا اور کہاں فلسفے کے ایک استاد کی دھیمی دھیمی باتیں۔ طیب جی کمنٹری کا لطف چھوڑ کر جلسے میں آئے تھے اور بہت پچھتائے تھے کہ فلسفہ تو خیر کتابوں میں بھرا پڑا ہے مگر کمنٹری دہرائی نہ جائے گی۔ جلسے کے اختتام پر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے شکریے کی تقریب میں طیب جی سے معذرت کی کہ اپنی دلچسپی چھوڑ کے وہ ایک غیر دلچسپ تقریب میں آنکلے تھے۔ پھر فاروقی صاحب نے غالب کا ایک مصرعہ پڑھا:

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!''

(کالم 'کرکٹ، کپل دیوار پروفیسر دیوراج'، ص 167)

''الٰہ آباد کا کمبھ میلہ اور دلّی شہر میں کتابوں کا میلہ، کم سے کم ایک معاملہ میں دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کمبھ میلے کے دوران الٰہ آباد میں لاکھوں یاتریوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ ہوٹلوں، تفریح گاہوں، سنیما گھروں پر ایک مستقل یلغار۔ سنگم پر تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ کتابوں کے میلے میں آدم زادوں کی بھیڑ تو ہوتی ہی ہے، مگر اس سے کئی گنا زیادہ، کتابوں کی بھیڑ، ہزاروں چہرے اور لاکھوں کتابیں۔ بچے اور بڑے، نوجوان اور بوڑھے، عورتیں اور مرد جسے دیکھیے اسٹالوں پر پلا پڑ رہا ہے...''

(کالم 'کتابوں کا کمبھ میلہ'، ص 118)

اس کے علاوہ شمیم حنفی کے کالموں کا وہ قسط وار سلسلہ 'چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، جس سے ان کی سیاسی بصیرت اور ادبی منظرنامے پر غیر معمولی نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ 'چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے' دراصل سارک ممالک کی ادبی کانفرنس (منعقدہ لاہور) کا سفرنامہ ہے۔ اجیت کور ہر برس بڑی پابندی سے اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ چھ قسطوں پر مشتمل یہ تحریر کئی نسلوں کے دکھ اور سیاسی بے بسی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس تحریر کا آخری اقتباس پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شمیم حنفی کی زبان میں ایک چاشنی ہے۔ ان کی نثر تخلیقی ہے لیکن اس میں جو بصیرت ہے وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے:

''اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم پانچ دریاؤں کی سینچی ہوئی اس سنہری، درخشاں، محبتوں سے چھلکتی ہوئی سرزمین تک ایک چھٹے دریا کو پار کرکے پہنچے تھے۔ اس چھٹے دریا کا نام 1947، 1960، 1971، کشمیر اور کارگل ہے۔ ایک مشہور کہاوت ہے.... کوئی بھی ایک ندی میں دوبارہ نہیں نہاتا۔ کوئی لہر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ کاش یہ چھٹا دریا بھی آگے صرف سراب ثابت ہو!''

(کالم 'چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے' (چھٹی اور آخری قسط)، ص 400)

شمیم حنفی کے کالموں میں علم و فن کی ایک دنیا آباد ہے اور ہر کالم ایک نئے جہانِ معنی کی سیر کراتا ہے۔ اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور ادبی مسائل و معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ان کالموں کو پڑھنا ضروری ہے۔ جہاں سیاسی منظر نامہ ہے تو تہذیب و ثقافت کا حوالہ بھی ہے، ادب بھی ہے اور ادیب بھی۔ گویا کہ زندگی اور سماج کے جتنے اہم پہلو ہیں، ان میں سے بیشتر ہمیں شمیم حنفی کے کالموں کے مجموعے میں بیک وقت نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے کام کسی شخص کے وسیع مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان کالموں کو پڑھتے ہوئے یک گونہ مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ کیونکہ ان میں اپنے زمانے اور عصر سے باخبری کی متعدد جہتیں موجود ہیں۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ اس میں محض اردو زبان یا ادب کے حوالے نہیں ہیں بلکہ وہ تمام زبانیں اور فنون جن سے شمیم حنفی کا گہرا تعلق تھا ان کالموں میں موجزن ہیں۔ اس لیے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شمیم حنفی کی شناخت میں ایک اہم حصہ ان کی کالم نگاری بھی ہے۔

■

Mohammad Ovais Sambhli
178/157 Barood Khana, Near Lal Masjid,
Golaganj, Lucknow - 226 018 (U.P.)
Mobile: 7905636448
Email: ovais.sambhli@gmail.com

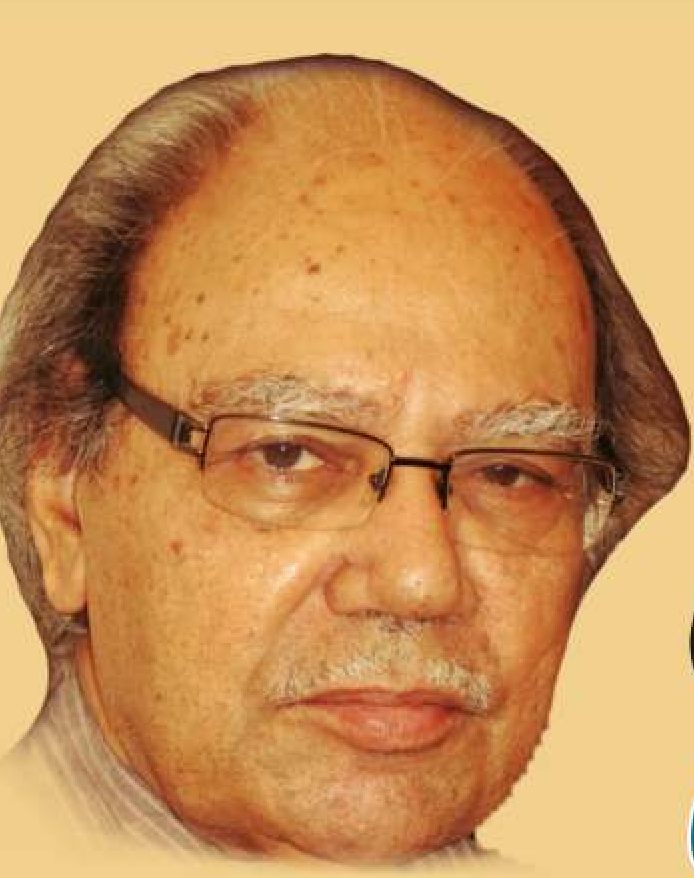

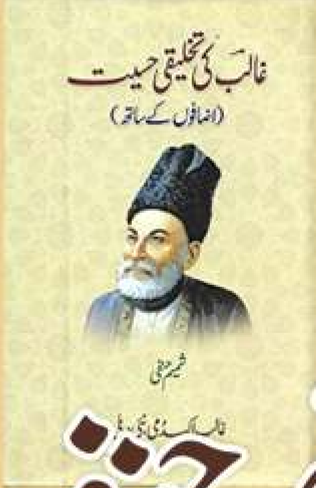

صالحہ عاصم

شمیم حنفی کی غالب شناسی

پروفیسر شمیم حنفی (17 نومبر 1938 – 6 مئی 2021) کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک معروف نقاد، ڈرامہ نگار، مترجم اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پوری اردو دنیا ان کی ادبی خدمات کی معترف ہے۔ شمیم حنفی کی تنقیدی کتابیں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، نئی شعری روایت، غزل کا نیا منظرنامہ، تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ، اقبال کا حرف تمنا، فراق دیار شب کا مسافر، غالب کی تخلیقی حسیت، انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی، قاری سے مکالمہ، اقبال عصر حاضر کا خرابہ، کہانی کے پانچ رنگ انھیں اپنے عہد کا ناقد اور مبصر ثابت کرتی ہیں۔ مٹی کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے، زندگی کی طرف ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ 'آخری پہر کی دستک' (2015 مرتب اشوک واجپائی) ان کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً 30 سے زائد ہے۔ لیکن شمیم حنفی کی ادبی شناخت کا سب سے مضبوط حوالہ تنقید ہی ہے۔ اور یہ تنقیدی سفر کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ کسی خاص صنف تک محدود نہیں ہے، بلکہ مختلف اصناف اور شخصیات سے متعلق ہیں۔ چونکہ آپ جدیدیت کے عہد کے پروردہ تھے اس لیے بیشتر تنقیدی تحریروں میں جدیدیت کی گتھیوں کو سلجھانے کی سعی نظر آتی ہے۔

شمیم حنفی نے اپنے ڈی لٹ کا مقالہ 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' میں جدیدیت کے رجحان کو اپنا موضوع تحقیق بنایا اور ادب پارے کی تفسیر و تعبیر کے لیے نئی مغربی اصطلاحات کے حوالے دیے۔ حوالہ ملاحظہ ہو:

''مغرب سے جو فلسفیانہ اصطلاحیں درآمد ہو رہی تھیں ان کی روشنی میں اردو کی شعری روایات یا فن کے آواں گارد میلانات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ یہ سب کے سب عدم تعین اور بے یقینی کے ایک عام احساس کی زد پر ہیں۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس اور نئی شعری روایت' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ص:76)

اس کے علاوہ آپ کی دو تنقیدی کتابیں 'غزل کا نیا منظرنامہ' اور 'نئی شعری روایت'، بقول کوثر مظہری اردو کے جدید شعری مزاج کو سمجھنے کا بامعنی اشاریہ کہی جا سکتی ہیں۔ تنقید کے تئیں ان کا رویہ ہمیشہ معتدل رہا ہے۔ شمیم حنفی نے کسی نظریے سے بندھ کر نہیں لکھا۔ گرچہ ان کی دلچسپی کا مرکز جدید اور معاصر ادب رہا ہے، لیکن انھوں نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اہم شعرا مثلاً سودا، نظیر، حالی، اکبر، میر و غالب پر اپنی تحریروں میں بھرپور بحث کی ہے۔ نیز بیسویں صدی کے تخلیقی فنکاروں مثلاً اقبال، ناصر کاظمی، مجروح سلطان پوری، انتظار حسین، جیلانی کامران، ن م راشد، اختر الایمان، فراق، فیض وغیرہ کی تعبیر و تشریح میں اپنی رائے قائم کرنے کا یکساں رویہ اختیار کیا ہے۔

شمیم حنفی کی تحقیق و تنقید کسی عہد یا کسی رجحان کی پابند نہیں ہے۔ وہ اپنی تنقید میں صرف اس تخلیق یا اس ادیب کو ہی نہیں، بلکہ پورے انسانی سیاق کو زیر بحث لاتے ہیں، جس میں تاریخ، تہذیب، سیاست بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اپنی کتاب 'انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''میں زندگی کی وحدت کے علاوہ تجربے کی وحدت میں بھی یقین رکھتا ہوں۔ چیزیں، لوگ اور صورتیں اپنے ماحول، پس منظر اور گرد و پیش کے بغیر مجھے ادھوری محسوس ہوتی ہیں۔ ذاتی واردات کے مفہوم تک میری رسائی بھی اکثر اجتماعی زندگی کی اساس مہیا کرنے والے تجربوں اور سچائیوں کے واسطے سے ہوتی ہے۔ انفرادی شعور میرے نزدیک اجتماعی زندگی کی ضد نہیں ہے۔ جس طرح میرا گھر ایک بھری پری بستی اور آبادی کا حصہ ہے۔ اسی طرح میرا اپنا شعور بھی اس بسیط روایت اور تاریخ کا پروردہ ہے۔ جس کی تعمیر میں ایک ساتھ بہت سے عناصر سرگرم رہے ہیں۔'' (انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی' شمیم حنفی پیش لفظ ص8)

چونکہ گفتگو کا موضوع خصوصاً شمیم حنفی کی غالب تنقید ہے۔ اس لیے اسی تناظر میں بات کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ غالب ایسا شاعر ہے جو انیسویں صدی سے اب تک اپنے مختصر کلام کے ذریعے زندہ و جاوید رہا ہے۔ غالب کی شخصیت، سوانح اور فن کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ اور اس فنکار کے فن کو عالمی سطح پر تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، عبد الرحمن

بجنوری، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر عبداللطیف، کلیم الدین احمد، شمس الرحمٰن فاروقی اور نیر مسعود غالب شناس مانے جاتے ہیں۔اسی فہرست میں شمیم حنفی کا بھی نام شامل ہے۔شمیم حنفی نے غالب پر جو کچھ لکھا وہ سب مضامین کی شکل میں ہیں۔ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔ غالب کی صدی محمد حسین آزاد اور نشاۃ ثانیہ کا مسئلہ، غالب اور غالب کی دِلّی، غالب شکست ذات کا افسانہ، تفہیم غالب کے مسائل اور ہمارا عہد، غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ، غالب، شعر، شہر اور شعور وغیرہ ان میں سے بیشتر مضامین ان کی ترتیب کردہ کتاب 'غالب کی تخلیقی حسیت' میں شامل ہیں۔اس کے علاوہ کچھ مضامین دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔شمیم حنفی نے غالب کو اپنا نقد نظر کیوں بنایا؟ یا نقد غالب کے لیے کیا چیزیں محرک بنیں؟اس حوالے سے اپنی کتاب 'غالب کی تخلیقی حسیت' کے پیشِ لفظ میں لکھتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

''غالب کے آفاقی وژن کے باوجود ان کی زندگی اور شاعری میرے لیے توانائی کے نجی ذخیرے اور ایک شخصی وسیلے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔عالمی معیاروں کے مطابق اردو کے عظیم شاعروں میر، غالب، اقبال میں تنہا غالب ہیں، جن کے آئینۂ ادراک میں مجھے اپنے عہد کے آشوب اور اپنی روح سے وابستہ سوالوں کا عکس سب سے زیادہ متحرک دکھائی دیتا ہے۔یہ شاعری میرے لیے فیضان کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔اس کے رموز کبھی ختم نہیں ہوتے۔ روزمرہ زندگی کی دھوپ چھاؤں، عام انسانوں کے دکھ سکھ، وقت اور کائنات کی بنیادی سچائیوں کا جتنا گہرا اور کھرا شعور ہمیں غالب کی شاعری میں موجزن نظر آتا ہے۔اس نے ہمارے لیے اس شاعری کو اپنی روحانی اور داخلی ضرورتوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔'' (غالب کی تخلیقی حسیت شمیم حنفی پیش لفظ ص 10)

شمیم حنفی نے غالب کی شخصیت، احوال، فن (شاعری اور نثر) سب پر گفتگو کی ہے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ: غالب کی تنقید احوال و شخصیت کے حوالے سے۔

دوسرا حصہ: شمیم حنفی کی غالب تنقید شاعری کے حوالے سے۔

تیسرا حصہ: شمیم حنفی کی غالب تنقید نثر کے حوالے سے۔

نیز ناقدین غالب پر شمیم حنفی کی رائے۔

لہٰذا شخصیت اور احوال سے متعلق میرے پیش نظر شمیم حنفی کا مضمون 'غالب شکست ذات کا افسانہ' ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب 'غزل کا نیا منظر نامہ' میں شامل ہے۔ اس مضمون میں شمیم صاحب نے غالب کی زندگی اور ان کے احوال کو پیش کرنے سے پہلے اس پورے عہد کا منظر نامہ پیش کیا ہے، جو غالب کے شعور میں رچا بسا تھا۔ ایک حساس اور تخلیقی ذہن کی زندگی صرف ذاتی نہیں ہوتی بلکہ پورا معاشرہ اور وہ عہد اس کی ذات کا حصہ ہوتا ہے۔یہی کچھ صورت حال غالب کے ساتھ پیش آئی ایک طرف غالب اپنی عائلی اور معاشی دشواریوں کا سامنا کر رہے تھے تو دوسری طرف عالمی اور ملکی سطح پر سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی انتشار کی دنیا آپ کے سامنے تھی۔ شمیم حنفی غالب کی شخصیت کو اس عہد کے شعرا مثلاً: ذوق، مومن، شاہ نصیر، صہبائی، آزردہ، وغیرہ سے موازنہ کرکے بتاتے ہیں کہ اس عہد کی سیاسی تبدیلیوں کو سب سے زیادہ غالب نے محسوس کیا کیونکہ وہ صاحب ادراک تھے اور انھوں نے اپنے ذہن کے دریچے کھول رکھے تھے۔چونکہ شمیم حنفی ہر چیز کو اس کے تہذیبی سیاق میں دیکھتے ہیں اس لیے ان کے یہاں شخصیت سازی کا مرحلہ بھی اسی سے مربوط ہوتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''انیسویں صدی کا یہ دور جس تہذیبی بحران سے دو چار ہوا اس نے غالب پر بہت گہرے اور دور رس اثرات ڈالے۔عملی زندگی کی ناکامیوں اور گرد و پیش کی دنیا کے مسلسل انتشار نے انھیں خارجی سطح پر بالکل پسپا کر دیا تھا۔دل شکستگی کے بہانے اسی وقت سے غالب کا تعاقب کر رہے تھے۔جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا۔ شب و روز کے تماشوں نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ دنیا بازیچۂ اطفال ہی نہیں آئینۂ آگہی بھی ہے جس میں غیرت و حیرت کی ہزار ہا تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ پینشن کی بحالی کے لیے جب انھوں نے کلکتے کا سفر کیا اور اہل کلکتہ نے ایک مہمان شاعر کی پذیرائی کے بجائے اس پر بے مہریوں کی یورش شروع کر دی تو غالب ایسے پریشان ہوئے کہ کچھ دیر کے لیے پاس وضع کا بھی انھیں خیال نہیں رہا اور آبا و اجداد کی شوکت و حشمت کی راگ الاپنے والے اور اپنی محرومیوں پر ظرافت اور بذلہ سنجی کا غلاف چڑھانے والے سپاہی نے خستہ حال اور بے سر و سامان شاعر کے مقابلے میں ہار مان لی۔انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو ہی موت کا شکار دیکھا۔''

(غزل کا نیا منظر نامہ مشمولہ مضمون 'غالب شکست ذات کا افسانہ از، شمیم حنفی ص:91)

اس مضمون میں شمیم حنفی نے غالب کی شخصیت اور ذات کی صلابت کی طرف اشارہ کیا ہے۔عموماً خارجی حالات، باطنی اثرات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، لیکن غالب کی باطنی تنظیم کی تربیت جن اصولوں پر ہوئی تھی اس نے انھیں ٹوٹنے سے بچا لیا۔اور یہی چیز ان کی عظمت اور انفرادیت کا سبب بنی۔ غالب نے کسی بھی شکست کو ذاتی طور پر قبول نہیں کیا بلکہ مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے اسے اپنی تعمیر ذات کا حصہ بنایا۔شمیم حنفی کی غالب شناسی کو سمجھنے کے لیے سب سے معاون کتاب 'غالب کی تخلیقی حسیت' ہے۔جس میں مشمولہ مضمون

'میر و غالب' میں غالب اور میر کی مماثلت اور انفرادیت مختلف مثالوں سے واضح کی ہے۔اور دوسرے ناقدین نے ان دونوں شاعروں کے حوالے سے جو رائے قائم کی ہے اس سے بحث کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ان دونوں کے زمانی تعین کی بنیاد پر حالی نے 'یادگار غالب' میں غالب کے واسطے سے میر کا ذکر کیا ہے۔شمیم حنفی حالی کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں اور اس کے اعتراض میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ پہلے حالی کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اردو شعر کہنا شروع کیا تھا قطع نظر اس کے کہ اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔اس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔خود مرزا کی زبانی سنا گیا کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائیگا۔ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''

(غالب کی تخلیقی حسیت، شمیم حنفی، ص:50)

غلام رسول مہر نے حالی کی اس حکایت کو دلیلوں کی بنیاد پر غلط کہا ہے۔اور مالک رام نے اسے قرین قیاس ٹھہرایا ہے۔اس سے الگ شمیم حنفی ان دونوں کی شاعری کے رنگ و آہنگ میں نمایاں فرق بتاتے ہوئے میر کو غالب پر فوقیت دیتے ہیں۔اور ان کا شعر بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

شمیم حنفی نے ان دونوں شاعروں کے یہاں تہذیبی اور سوانحی اختلافات کے باوجود ذہنی مراتب میں مماثلت تلاش کی ہے۔اور وہ مرتبے یہ ہیں کہ دونوں نے اردو اور فارسی کو ذریعۂ اظہار بنایا، دونوں نے شہر سے دربدر ہونے کا دکھ جھیلا، اپنے عہد کا ستم تقریباً دونوں پر ایک ہی جیسا گزرا، اور ایک سب سے اہم چیز یہ کہ تمام رنج کو برداشت کرتے ہوئے ان کے فن کی رمق اس عہد میں بھی روشن رہی اور آج بھی تابندہ ہے۔شمیم حنفی کے اس تقابل کے چند نکات یہ ہیں:

* جو کام میر نے اپنی جذباتی کیفیتوں سے لیا تھا غالب وہی کام اپنی آگہی اور ادراک سے لیتے ہیں۔
* دونوں میں یہ امتیاز مشترک ہے کہ ہمارے اپنے زمانے کی حسیت اور ہمارے تجربوں کی کائنات پر دونوں کا سایہ ایک جیسا طویل اور گہرا ہے۔

شمیم حنفی نے اپنے مضمون 'غالب اور عہد غالب کا تخلیقی ماحول' میں غالب کی غیر معمولی شخصیت کے انفرادی رویوں کا تجزیہ کیا ہے۔ بیرونی وداخلی اثرات سے ماورا اور نئی ایجادات و اختراعات سے مرعوبیت کے باوجود اپنے اقدار کی پاسداری ان کے ہم عصروں میں صرف غالب کا ہی خاصہ تھی۔ شمیم حنفی نے غالب کو عالمگیر قدروں کی بنیاد پر پرکھا ہے اور اس پرکھ میں کسی بھی ہندوستانی شاعر کو ان کا ہم پلہ نہیں بنایا۔ بلکہ فرانس میں شارل بودلیر (Charles -Baudelaire) اور جرمنی میں ہائنے (Johan Heinrich Heine)، امریکہ میں والٹ وائٹ مین (walt Whitman) اور انگلستان کے رومانی شعرا ولیم ورڈسورتھ، شیلے اور کیٹس کو ان کا ہمعصر بتاتے ہیں اور غالب کی حسیت کو ان شاعروں کے فن کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔

ہائنے نے کہا تھا۔ ''میں نے شعری کامرانیوں کے واسطے سے کسی بڑے نصب العین تک رسائی کو اپنا ہدف نہیں بنایا''۔

بقول غالب: ''کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے''۔

ہائنے: ''میرے نغمے کو سراہا جائے یا انھیں اعتراضات کا نشانہ بنایا جائے، مجھے اس سے زیادہ سروکار نہیں، مگر میرے تابوت پر ایک تلوار ضرور رکھ دینا کیونکہ میں انسانی آزادی کی جنگوں میں ایک اچھا سپاہی رہا ہوں''۔

غالب: ''سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری''

شمیم حنفی نے غالب کو تخیل، بصیرت، تجربے کی وسعت اور انسانی عروج وزوال کی تفہیم وتعبیر کے اعتبار سے انیسویں صدی کی دوسری تمام زبانوں میں سب سے عظیم شاعر، مشرقی روایت کا سب سے بڑا عارف اور ادبی روایت سے تعلق رکھنے والے شاعروں میں پہلا عالمی شہری مانا ہے۔

شمیم حنفی غالب کو پوری شعری روایت کے سیاق میں دیکھتے ہیں۔ 1947 میں سماجی شعور کی اصطلاح عام ہوئی۔ اس چلن میں کتنے شاعر حاشیے پر چلے گئے۔ غالب کی زندگی 1857 کے آس پاس اسی سے ملتے جلتے ماحول میں گذری، لیکن بطور فنکار غالب نے جس رویے کا مظاہرہ کیا وہ بصیرت افروز ہے۔ شمیم حنفی کی نظر میں غالب اس پورے منظر نامے میں براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ شریک رہے اور اپنی تخلیق میں اس عہد کی شکست اور باطنی اضطراب کی عکاسی جس طرح کی ہے اس میں حسرت کے ساتھ ساتھ رفعت کا عنصر بھی موجود ہے۔ شمیم حنفی نے اس تناظر میں غالب کے کئی اشعار کے نئے مفہوم اخذ کیے ہیں۔ مثال ملاحظہ کیجیے۔

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے ہیں
فقط اک شعر میں انداز رسا رکھتے ہیں
مرا شمول ہر اک دل کے پیچ وتاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

(اصل میں غالب نے 'پیچ وتاب دل' کو 'نصیب خاطر آگاہ' کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اور اس رمز سے وہ اچھی طرح واقف تھے کہ وقت کی کائنات میں ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ نیرنگیِ تمنا کے ایک تماشائی کی ہے۔ وہ ہر دل کے پیچ وتاب میں شامل تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی ہستی بس 'تپش نامہ تمنا' کے مدعا کی سی ہے۔ فقط ایک 'انداز رسا شعر میں' ان کے ہاتھ آیا ہے۔ باقی دنیا پر ان کا کچھ اختیار نہیں۔)

(حوالہ: غالب کی تخلیقی حسیت مشمولہ مضمون غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ از شمیم حنفی ص 148)

غالب کے خطوط کے حوالے سے حالی نے تین باتیں کہی تھی۔ ایک تو یہ کہ غالب تحریر میں لوازمات سے اجتناب کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ اپنی بات پہچانے کے لیے مکالماتی پیرایہ اختیار کرتے ہیں، تیسرے یہ کہ مکتوب الیہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شمیم حنفی کے خیال میں یہ صرف ان کی شخصیت اور خطوط نگاری کے حوالے ہیں نثر نگاری کے نہیں۔ شمیم حنفی کی نظر میں غالب کی شعری شخصیت نثر نگار غالب سے بہت مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نثر نگاری میں غالب کی دلچسپی انسانوں سے ہے اور ان کی پوری نثر میں ادبی اور فنی عنصر سے زیادہ انسانی عنصر نمایاں ہے۔ اس چیز کو بھی شمیم حنفی تہذیبی نظریے میں دیکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''غالب کی نثر ہندی مسلمانوں کے طرز احساس کا مرقع بن کر سامنے آئی ہے۔ غالب کے خطوط سے جو شخصیت ابھرتی ہے اور جو ماحول نمودار ہوتا ہے اس سے عام ہندو مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے منظریے مرتب ہوتے ہیں۔ اس منظریے میں امتیاز سے زیادہ امتزاج پر زور ہے۔''

(غالب کی تخلیقی حسیت، مشمولہ مضمون غالب کی اردو نثر از شمیم حنفی ص 156)

شمیم حنفی غالب کی نثر کا تقابل میر امن کی نثر سے کرتے ہیں کہ جس طرح ان کے یہاں زبان اور زندگی کے معمولات زمینی صداقتوں سے جڑے ہوئے ہیں وہی چیز غالب کے یہاں بھی ملتی ہے:

''غالب بیت السرور اور چشمۂ حیات کی ایک سوت'' (غالب اور رام پور) اس مضمون میں شمیم حنفی نے غالب کا جن شہروں سے تعلق رہا اور ان کی شاعری اور نثر میں ان شہروں اور تجربات کا آئینہ پیش کیا ہے۔ حنفی نے غالب کے خطوط سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

''غالب کو جتنی دلچسپی تصورات اور ذہنی تجربوں سے تھی اتنی ہی دلچسپی اشیا مقامات' اشخاص اور مظاہر سے بھی تھی۔'' (غالب اور رام پور ص 187)

شمیم حنفی رام پور سے غالب کے روابط کے ضمن میں غالب شناسی کی روایت کے تعارف کا سہرا امتیاز علی عرشی کو دیتے ہیں۔ شہروں سے وابستگی کے اس سلسلے کا ایک مضمون 'غالب، شعر، شہر اور شعور' بھی ہے۔ شمیم حنفی آگرہ شہر کو غالب کے شعور کو زمینی پس منظر مہیا کرنے کا حوالہ بتاتے ہیں۔ چونکہ غالب کا بچپن یہیں گزرا اس لیے انھیں اس شہر سے جذباتی وابستگی ہے۔ شمیم حنفی نے ان حقائق کو زیادہ تر غالب کے منشی شیو نرائن کے نام لکھے خطوط میں تلاش کیا ہے۔

ناقدین غالب کے بیچ غالب کئی حوالوں سے موضوع بحث رہے ہیں۔ کبھی انتہا پسند کہا گیا کبھی مہمل گو اور کبھی ان کی شاعری کو الہامی بتایا گیا۔ شمیم حنفی کے مطابق ناقدین نے غالب کو ان چیزوں میں الجھا کر ان کی شاعری کو معدوم کر دیا ہے۔ وارث علوی نے ناقدین غالب کے تنقیدی رویوں کا جائزہ لینے کے بعد جو نتیجہ پیش کیا ہے، شمیم حنفی اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ:

''اردو میں غالب پر اچھے مضامین بس دو ہی لکھے گیے۔ ایک حمید خاں کا مضمون 'غالب کی شاعری میں حسن و عشق' اور دوسرا ڈاکٹر آفتاب احمد کا مضمون 'غالب کا غم'

(غالب کی طرف ہمارے تنقیدی رویے چند وضاحتیں از شمیم حنفی، ص: 217)

شمیم حنفی غالب تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کے بیکراں فن کو کسی مختص تنقید میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تفہیم غالب کی پرتیں کھلتی جا رہی ہیں اور نئی جہتیں سامنے آ رہی ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

■

Saleha Asim
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9953116850

شمیم حنفی
اور جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

طاہر حسین

'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' پروفیسر شمیم حنفی کی وہ شاہکار کتاب ہے، جس سے انھیں اردو کے ادبی منظرنامے پر وقار و اعتبار حاصل ہوا۔ یہ کتاب دراصل ان کے ڈی لٹ کا تحقیقی مقالے ہے جو انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 1974 میں پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔ اس مقالے کا اصل عنوان 'بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، ہے۔ سات ابواب پر مشتمل یہ طویل مقالہ جب کتابی شکل میں شائع ہوا تو اسے دو نیم کر دیا گیا۔ ابتدائی چار ابواب جن میں مشرق و مغرب میں جدیدیت کی ارتقائی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کے فکری و فلسفیانہ مباحث کا نہایت تفصیلی اور معروضی تجزیہ کیا گیا ہے وہ 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' کے نام سے شائع ہوئی۔ آخری تین ابواب جن میں اردو کی جدید شاعری کا مطالعہ کر کے اس میں جدیدیت کے حوالوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ 'نئی شعری روایت' کے نام سے شائع ہوئی۔ ہندوستان میں یہ دونوں کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے بالترتیب 1976 اور 1978 میں شائع کی ہیں جب کہ پاکستان میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے انھیں ایک ہی کتاب کی صورت میں 'جدیدیت اور نئی شاعری' کے نام سے 2008 میں شائع کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں جدیدیت کے فکری اور نظریاتی مباحث کو سمجھنے میں نہ صرف یہ کہ بنیادی حوالہ کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ یہ اس سلسلے کی اولین کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ کتابیں اس وقت منظر عام پر آئیں جب جدیدیت کے مباحث ابھی بہت واضح نہیں تھے اور اردو میں اس پر بہت کچھ لکھا نہیں گیا تھا، بلکہ جدیدیت ابھی تشکیل کے مراحل سے ہی گزر رہی تھی اور لوگ اس کی مخالفت و موافقت میں برسرِ پیکار تھے۔ خود شمیم حنفی کے بقول:

''جن دنوں یہ مقالہ ترتیب دیا جا رہا تھا جدیدیت کا ہنگامہ زوروں پر تھا، کچھ عالم فاضل لوگ اسے خلاصۂ کائنات سمجھنے پر مصر تھے اور کچھ اسے یکسر مسترد کرنے پر بضد۔ میری حیرانی نے اکسایا کہ انتہا پسندانہ رایوں کے اس شور میں نئی حسیت کا معروضی تجزیہ کیا جائے اور ان عناصر کا سراغ لگایا جائے جو اسے فکری اساس فراہم کرتے ہیں۔'' (نئی شعری روایت: شمیم حنفی، ص 11)

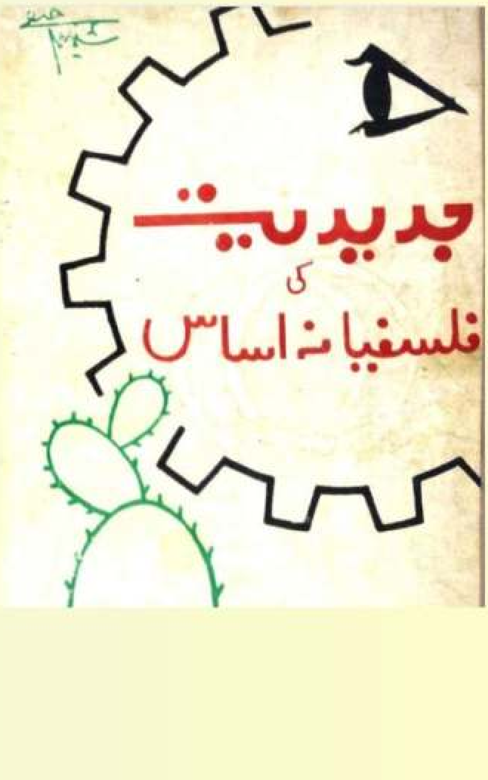

شمیم حنفی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے موافق اور مخالف دونوں طرح کے بیانات کا نہایت غیر جانبدارانہ اور معروضیت پر مبنی عالمانہ محاکمہ کر کے حقیقت اور سچائی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کی اہمیت و عظمت کے پیش نظر ہی شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں بیسویں صدی کے دوران چھپنے والی چند اہم کتابوں میں شمار کیا ہے اور ناصر عباس نیر نے جدیدیت کی فلسفیانہ اساس کو جدیدیت کا Megnum Opus قرار دیا ہے۔

جدیدیت گرچہ ایک عالمگیر رویہ تھا لیکن اس کے بنیاد گزار یا یوں کہیے کہ اس کے بنیادی مباحث کو قائم کرنے والے لوگ چونکہ مغربی مفکرین ہیں اس لیے شمیم حنفی نے اس موضوع سے متعلق مواد کی تلاش اور ترتیب میں اصل مفکرین کی آرا کو ہی بنیاد بنا کر تجزیہ کیا ہے۔اپنی گفتگو کو مدلل اور مستند بنانے کے لیے شمیم حنفی نے جگہ جگہ مغربی مفکرین کی آرا کو نقل کیا ہے اور حوالہ جات کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے جس کی وجہ سے بقول پروفیسر عتیق اللہ اور وارث علوی، کتاب اچھی خاصی گنجلک ہو گئی ہے۔

اس کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں شمیم حنفی نے جدیدیت پر باقاعدہ گفتگو سے پہلے مشرق و مغرب کے ان تمام فکری و فلسفیانہ افکار اور ان تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیا ہے جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر جدیدیت کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے اور اس کی ماحول سازی میں کسی نہ کسی طرح شریک ہو رہے تھے۔ اس کتاب میں انیسویں اور بیسویں صدی کے علمی، فکری، تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں کا تجزیہ کیا گیا ہے جو جدیدیت کی تشکیل کے پس منظر میں کارفرما رہے ہیں۔شمیم حنفی نے اس کتاب میں جدیدیت کی تعریف، جدیدیت اور تجدد میں فرق، جدیدیت کی تاریخ اور اس کے جواز سے متعلق نہایت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی میں بدلتے ہوئے مذہبی افکار و خیالات ہوں یا ترقی پسند مفکرین کے نظریات، ماہرین نفسیات ہوں یا تاریخیت و نو تاریخیت کے علمبردار، سیاسی مدبرین ہوں یا فنی مفکرین اس عہد کو متاثر کرنے والے ان تمام علمی و فلسفیانہ افکار کا جائزہ لے کر اس کتاب میں جدیدیت کی بنیادوں کو تلاش اور قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شمیم حنفی کے خیال میں جدیدیت کے اسباب تہذیبی، سماجی، معاشرتی، اور فکری و نفسیاتی بھی ہیں۔ بیسویں صدی کے ماحول نے زندگی سے متعلق کچھ نئے اور تازہ افکار کو جنم دیا جس کے نتیجے میں خود بخود فکر و فن کے ایسے معیار بھی سامنے آئے جن کی نوعیت و ماہیت عام فکری و فنی اور شعری رجحانات سے مختلف تھی۔ پھر جدیدیت کے جواز اور اس کے ایک ادبی ڈسکورس بننے کے بارے میں شمیم حنفی کا خیال ہے کہ دراصل انسانی زندگی اور کائنات کے تعلق سے کوئی بھی طرز نظر اس وقت تک معتبر نہیں ٹھہرتا اور عالمی سطح پر اس وقت تک اپنی اہمیت و مقبولیت کو قائم نہیں کر پاتا ہے جب تک کہ اس کی بنیادیں حقیقی اور سچی نہ ہوں۔ چنانچہ جدیدیت کے ایک عالمگیر ادبی و فلسفیانہ ڈسکورس کا حصہ بننے کے پیچھے بھی یہی عنصر کارفرما ہے کہ یہ ذات و کائنات کے ساتھ ایک مربوط اور منظم رشتہ رکھتی ہے اور اس کی تفہیم و تشریح کے کچھ نئے زاویے فراہم کرتی ہے جن سے سرمو روگردانی کرنا خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف عمل ہے۔

شمیم حنفی نے جدیدیت اور تجدد کے مابین اس فرق کی بھی وضاحت کی ہے جسے مدنظر نہ رکھنے کے سبب انھیں خلط ملط بھی کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں کئی غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں۔اردو دنیا کا ایک بڑا حلقہ ایسا بھی ہے جو جدیدیت کو محض قدامت کی ضد اور ہر پرانے خیال کے بالمقابل نئے خیال کو جدیدیت سمجھتا ہے۔چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کی نئی شاعری (نظم جدید) کی تحریک کو بھی کچھ لوگوں نے جدیدیت کے نام سے ہی موسوم کیا ہے۔لیکن شمیم حنفی کہتے ہیں کہ:

''جدیدیت جدید کے اس تصور سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جس کی اساس پر حالی اور آزاد کی جدید شاعری کا ایوان قائم کیا گیا تھا۔'' (ایضاً،ص16)

یہ ایک نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہے کہ شمیم حنفی نے کتاب کے پہلے ہی باب میں دوسرے ناقدین اور دانشوران کے برعکس جدیدیت کے لیے Modernity اور تجدد پرستی کے لیے Modernism کا لفظ استعمال کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ادب اور فنون لطیفہ کے تناظر میں جدیدیت ایک خاص قسم کا ذہنی اور تخلیقی رویہ ہے جبکہ تجدد پرستی کے مضمرات تاریخی اور مذہبی ہوتے ہیں۔تجدد پرستی کا تصور زمانی تقسیم اور وقت کے حوالوں کا محتاج ہوتا ہے اور ہر وہ نیا رویہ جو گزشتہ سے گریز اور انحراف کی صورت اختیار کرے وہ تجدد ہے۔گویا تجدد پرستی معاصریت کی ہم معنی ہوئی اور گزرے ہوئے زمانے کی وہ تمام حقیقتیں اور سچائیاں جن کو آج کا ذہن قبول کرنے سے گریز کرتا ہے وہ قدیم ٹھہرتی ہیں۔جدیدیت اس کے برخلاف وقت کی اس میکانیکی تقسیم کو قبول نہیں کرتی بقول شمیم حنفی:

''جدیدیت فی الاصل موجودہ عہد کے شعور اور وقت کے اس حصار میں گھرے ہوئے انسان کی عارضی اور ابدی الجھنوں اور اس کے تہذیبی رویوں اور تخلیقی میلانات کا ایک ناگزیر رخ ہے۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس:شمیم حنفی،ص12)

اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو اردو میں تجدد پرستی کی روایت سرسید، حالی اور آزاد سے لے کر آج تک ہر عہد میں ہوتی رہی ہے۔حالی اور آزاد نے روایتی شاعری سے بغاوت کرتے ہوئے جس نئے شعری منشور کی وکالت کی تھی اور جس کی ترجمان شاعری کو اس وقت جدید شاعری

شمیم حنفی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے موافق اور مخالف دونوں طرح کے بیانات کا نہایت غیر جانبدارانہ اور معروضیت پر مبنی عالمانہ محاکمہ کر کے حقیقت اور سچائی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ان کتابوں کی اہمیت و عظمت کے پیش نظر ہی شمس الرحمن فاروقی نے انھیں بیسویں صدی کے دوران چھپنے والی چند اہم کتابوں میں شمار کیا ہے اور ناصر عباس نیّر نے جدیدیت کی فلسفیانہ اساس کو جدیدیت کا Megnum Opus قرار دیا ہے۔

کہا گیا تھا آج وہ ہماری شعری روایت کا حصہ بن گئی ہے۔حالی اور آزاد کی شاعری ہو یا بعد کی ترقی پسند شاعری اس کے پس پشت ہمیشہ ایک سماجی، معاشرتی یا اخلاقی تصور کارفرما رہا ہے اور اس کا ایک واضح نصب العین بھی رہا ہے۔اس کے برخلاف جدیدیت کی ترجمان شاعری (جسے شمیم حنفی نئی شاعری کہتے ہیں) کے سامنے نہ کوئی سماجی و اخلاقی منصب ہے اور نہ ہی کوئی واضح دستور العمل جس کی پاسداری سے کوئی شاعر نیا یا جدید شاعر کہلایا جا سکے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جدید یا نئی شاعری کا کوئی فکری اور نظریاتی وجود نہیں ہے بلکہ بقول شمیم حنفی:

''فکری سطح پر جدیدیت کا منظر نامہ اتنا وسیع و بسیط ہے کہ متضاد عقائد و افکار اور ذہنی و جذباتی رویوں کے لیے بھی اس میں یکساں گنجائش نکل سکتی ہے اور فنی سطح پر نئی شعری جمالیات کی جہتیں اتنی کثیر ہیں کہ اظہار و بیان کی مختلف النوع ہیئتوں کو بیک وقت اس سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔'' (نئی شعری روایت،ص 16-17)

شمیم حنفی نے اگرچہ جدیدیت کی فلسفیانہ بنیادیں بیسویں صدی کے پورے علمی و ادبی ماحول میں تلاش کی ہیں اور مشرق و مغرب کے ان تمام حالات و حادثات کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے جدیدیت کی راہیں ہموار کی ہیں۔اس سلسلے میں جدیدیت کے دیگر مفکرین کے بالمقابل شمیم حنفی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کی مغربی فکر اور بالخصوص جدیدیت کے دھاروں کو مشرق

میں مہاتما گوتم بدھ کے افکار ونظریات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغربی افکار کی تشکیل میں زین بدھ مت کا کلیدی رول رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں وجودیت کا فلسفہ سب سے اہم اور قابل ذکر ہے جس نے جدیدیت کی تشکیل میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ شمیم حنفی کے مطابق وجودیت بیسویں صدی کا سب سے اہم، منظم، معنی خیز اور مؤثر فلسفہ ہے۔ اس لیے کہ اس فلسفے نے جہاں ایک طرف نئے عہد کے انسان اور اس کے وجود کی حقیقت کو سمجھنے کے کچھ نئے پیمانے فراہم کیے تو وہیں دوسری طرف انسان کے تخلیقی اظہار کی قوتوں کو بھی بے حد متاثر کیا۔ شمیم حنفی نے وجودی مفکرین خاص کر ہائڈیگر، کر کے گارڈ، سارتر، نطشے، کامیو، مارسل اور بوبر وغیرہ کے خیالات کا تفصیلی جائزہ لے کر ان میں مقامات افتراق واشتراک کی نشاندہی کی ہے۔ شمیم حنفی کے مطابق وجودی مفکرین میں بہت سارے معاملات میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن پر تمام وجودی مفکرین متفق نظر آتے ہیں ایک جوہر پر وجود کی فوقیت اور دوسرے فرد کی انفرادی آزادی۔ اس لیے کہ وجود پر جوہر کو فوقیت دینے سے انسان کچھ طے شدہ اقدار اور خصوصیات کا استعارہ بن جاتا ہے اور اپنا انفرادی وجود کھو دیتا ہے۔ چنانچہ جب انسان کا انفرادی وجود ثابت ہو جائے تو پھر انفرادی آزادی کے بغیر انسانی

فکری سطح پر جدیدیت کا منظرنامہ اتنا وسیع و بسیط ہے کہ متضاد عقائد و افکار اور ذہنی و جذباتی رویوں کے لیے بھی اس میں یکساں گنجائش نکل سکتی ہے اور فنی سطح پر نئی شعری جمالیات کی جہتیں اتنی کثیر ہیں کہ اظہار و بیان کی مختلف النوع ہیئتوں کو بیک وقت اس سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔

وجود کی تخلیقی توانائیوں کا بھر پور اظہار نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جدیدیت فرد کے وجود اور اس کی تخلیقی آزادی پر سب سے زیادہ زور دیتی ہے اور سماجی واجتماعی تجربات و مسائل کو انفرادی بنا کر پیش کرنے کی وکالت کرتی ہے تاکہ فن کی آزادانہ حیثیت اور خود مختاریت قائم ہو۔

جہاں تک جدیدیت کے نقطۂ آغاز کا سوال ہے تو شمیم حنفی کے مطابق مغربی شعر وادب میں نئی فکر اور نئی حسیت کے زاویوں کا احساس انیسویں صدی کے اواخر سے ہی ہونے لگا تھا لیکن جدیدیت کے باقاعدہ خد و خال مغربی شعرا کے یہاں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی سے نظر آجاتے ہیں۔ اردو شاعری میں جدیدیت کا باقاعدہ آغاز گرچہ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی سے ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں سے ہوتا ہے تاہم اس کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی اس سے پہلے کے شعرا یعنی علامہ اقبال، ن م راشد اور میراجی کے یہاں کی جا سکتی ہے۔

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس کا دوسرا حصہ جو نئی شعری روایت کے نام سے منظر عام پر آیا وہ اردو کی جدید شاعری کے تفصیلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے کن شاعروں کے یہاں جدیدیت کا رجحان پنپ رہا تھا اور ان کی شاعری کے وہ کون سے عناصر تھے جو اسے روایتی شاعری کے حصار سے نکال کر جدید شاعری کے زمرے میں رکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ اس ضمن میں شمیم حنفی نے یہ طریقہ کار اختیار کیا ہے کہ اردو کے جدید شعری سرمایے کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے ان نئے عناصر کی نشاندہی کی ہے جو روایتی شاعری سے ایک طرح کا انحراف ہیں اور ایک جہان تازہ کی خبر دیتے ہیں۔ بقول شمیم حنفی:

''اس مقالے میں دراصل نئی شاعری اور بیسویں صدی کے فلسفیانہ افکار کے مابین اسی رشتے یا مماثلت کے پہلوؤں کی دریافت کی جائے گی۔ مقصد یہ نہیں کہ نئی شاعری کے نمائندہ عناصر کو فلسفیانہ افکار کے کسی چوکھٹے میں کھینچ تان کر سمو دیا جائے اور نئی شاعری کو معاصر فلسفوں کا مترادف قرار دے دیا جائے، بلکہ یہ کہ نئی شاعری سے جو خصائص وابستہ کیے جا سکتے ہیں ان کی فلسفیانہ بنیادیں تلاش کی جائیں۔'' (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، ص70)

شمیم حنفی نے جدیدیت کے عناصر کی نشاندہی جدیدیت کے باقاعدہ آغاز سے قبل علامہ اقبال، میراجی اور ن م راشد کے یہاں بھی کی ہے۔ نئی شعری روایت میں اقبال اور جدیدیت کے مغربی مفکرین پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور شعر اقبال کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اقبال کی جدیدیت کے بارے میں شمیم حنفی کہتے ہیں کہ:

''یہاں اس سوال سے بھی بحث نہیں کہ اقبال نے وجودی مفکّروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا یا ان سے بالواسطہ طور پر متعارف ہوئے تھے۔ یہاں صرف یہ حقیقت مدنظر ہے کہ اقبال کی فکر میں ارادی یا غیر ارادی سطح پر وجودی فکر کے ان عناصر کی بازگشت ضرور سنائی دیتی ہے جن سے جدیدیت کا فکری خاکہ معمور دکھائی دیتا ہے۔'' (نئی شعری روایت، ص27)

شمیم حنفی نے جدیدیت کے عناصر کی نشاندھی جدیدیت کے باقاعدہ آغاز سے قبل علامہ اقبال، میراجی اور ن م راشد کے یہاں بھی کی ہے۔ نئی شعری روایت میں اقبال اور جدیدیت کے مغربی مفکرین پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور شعر اقبال کے ان پہلوؤں کی نشاندھی کی گئی ہے جن میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے۔

اسی طرح شمیم حنفی نے ن م راشد اور میراجی کی شاعری کا مطالعہ کر کے اس میں نئے تخلیقی تجربات اور نئے شعری احساس کی ترجمان شاعری کی نشاندہی کی ہے جو ایک طرف بالکل ایک نیا شعری منظرنامہ تخلیق کرتی ہے تو وہیں دوسری طرف یہ نئی جمالیات اور نئے انسانی اقدار سے بھی متعارف کراتی ہے۔

اس کے بعد شمیم حنفی نے جدید شاعروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی، عمیق حنفی، مغیب الرحمٰن، مختار صدیقی، افتخار جالب، شمس الرحمٰن فاروقی، ضیا جالندھری، محمد علوی، زاہد ڈار، انیس ناگی، ساقی فاروقی، شہریار، شکیب جلالی، کمار پاشی، سلیم الرحمٰن، محمود ایاز، منیر نیازی، باقر مہدی، احمد مشتاق، ظفر اقبال اور وحید اختر وغیرہ کی غزلوں اور نظموں کا باقاعدہ مطالعہ کر کے ان میں جدیدیت کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ شمیم حنفی کے خیال میں نئی شاعری میں فکری مماثلت کے باوجود زبان و بیان اور صیغۂ اظہار کی تعیین ہر شاعر کی انفرادی استعداد سے مشروط ہے۔ نئی شاعری نہ طے شدہ نتائج کی پابند ہے نہ کسی بیرونی ہدایت نامے کی پیروکار، بلکہ یہ شاعری جدید عہد کے انسان کی نفسیاتی اور داخلی الجھنوں کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سماجی اور تہذیبی بحران کا اعلامیہ ہے۔ بیسویں صدی کی دو عالمی جنگوں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، عقلیت پسندی، اشتراکی حقیقت نگاری اور پھر ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات نے جو خوف، بے چینی اور داخلی ہیجان کی کیفیت پیدا کر دی تھی، جدید شاعری ان تمام موضوعات و مسائل کے بیان سے عبارت ہے۔

■

Tahir Husain
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001
Mob.:8492026733
Mob.: tahirh123@yahoo.com

کہیں بھی کوئی تبدیلی کسی ایک فنکار کی وجہ سے نہیں آئی

رمیشا قمر

ریاست کرناٹک کو جس ادیب نے اپنے ادبی کام کے ساتھ ساتھ اپنے نام سے بھی مشہور کیا وہ حافظ کرناٹکی ہیں۔ حافظ کرناٹکی نے زمین شعر و سخن میں تو جھنڈے گاڑے ہی تعلیم و تدریس کے میدانوں میں بھی اپنے علم بلند کیے۔ مردانہ وار وہ اپنی پسندیدہ راہوں پر آگے بڑھتے رہے اور معرکے سر کرتے رہے۔ وہ ہر شعبے میں کامیاب رہے۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بنے۔ ایک عمدہ شاعر ثابت ہوئے۔ ایک کامیاب منتظم کے طور پر بھی مشہور ہوئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ شکاری پور میں اسکول کی بنیاد ڈالنا اور اپنی جہد مسلسل سے اس کو گریجویشن کی سطح تک پہنچانا ہے۔ اس تعلیمی ادارے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی انتظام و اہتمام کرتا ہے۔ جہاں بچوں کی شاعری کے رموز و اسرار بھی سکھائے جاتے ہیں۔ حافظ کرناٹکی تعلیم نسواں کے نہ صرف حامی رہے ہیں بلکہ انھوں نے اس کے لیے کئی اقدامات بھی کیے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی مختلف جہتوں میں سفر کرتی رہی ہے ہر صنف میں ان کے قلم نے جادو بکھیرا ہے۔ قلم کے ساتھ ساتھ زبان کا جادو بھی حافظ صاحب کو خوب آتا ہے۔ تو چلیں آج اس جادو سے بھی محظوظ ہوتے ہیں اور بات کر کے دیکھتے ہیں۔

رمیشا قمر: کسی فنکار اور اس کے فن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سے یہ جانا جائے کہ اس نے کب اور کیوں لکھنا شروع کیا تو آج کی گفتگو بھی اسی سوال سے شروع کرتی ہوں کہ آپ نے ادب لکھنا کب اور کیوں شروع کیا؟

حافظ کرناٹکی: میرا خیال ہے کہ کوئی بھی فنکار یہ تو بتا سکتا ہے کہ اس نے کب لکھنا شروع کیا، مگر یہ بتانا کہ کیوں لکھنا شروع کیا آسان نہیں ہے۔ بس پس منظر کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً میرے والدین مدرسین تھے۔ گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ ماں اور باپ دونوں کو ادب سے دلچسپی تھی۔ والد صاحب کو پرانے مذاق کے اساتذہ کی طرح فارسی اور اردو کے بہ کثرت اشعار یاد تھے۔ جنھیں وہ موقع بہ موقع پڑھا کرتے تھے۔ والدہ کو بھی نعتیں، مناجاتیں کہنے کا شوق تھا، وہ شاعرہ تو نہیں تھیں مگر موزوں طبع تھیں۔ شوقیہ کچھ کہہ لیتیں، گنگنایا کرتیں، والد صاحب بچوں کے ذوق کی تربیت کے بھی خواہاں تھے، اس لیے بچوں کے رسائل بھی منگواتے تھے۔ جنھیں میں شوق سے پڑھتا تھا۔ مجھے ابتدائی جماعت میں ہی چند ایسے اساتذہ ملے جنھیں ادب کا عمدہ ذوق تھا، امید ادیبی صاحب تو باضابطہ شاعر تھے۔ مولانا نیر ربانی کا بھی ذوق ادب بہت عمدہ تھا۔ اسی ماحول میں کسی موڈ میں میں نے بھی شاعری شروع کردی۔ میں جو نظمیں غزلیں کہتا اپنے دوستوں کو سناتا، وہ ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے میری تعریفیں کرتے اس طرح یہ شوق بڑھتا چلا گیا اور آہستہ آہستہ میں شاعر ہو گیا۔

ر ق: ماشاء اللہ!! ذاتی اور ادبی زندگی پر اہم باتیں معلوم ہوئیں شکریہ۔ یہ بتائیں ڈاکٹر صاحب کہ کن کن اصناف میں آپ کے قلم کا جادو چلا ہے اور کس صنف میں لکھتے ہوئے اطمینان قلب محسوس ہوتا ہے؟

ح ک: یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ کن اصناف میں میرے قلم کا جادو چلا ہے۔ ویسے میں نے شعری اصناف میں سے بیشتر پر طبع آزمائی کی ہے۔ نظمیں لکھی ہیں، غزلیں لکھی ہیں، مثنوی لکھی ہیں، قطعات لکھے ہیں۔ لوریاں لکھی ہیں، گیت لکھے ہیں، رباعیاں لکھی ہیں۔ ترانے اور مرثیے لکھے ہیں۔ شخصی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ نظم کے بھی کئی فارم میں طبع آزمائی کی ہے۔ بہ کثرت نعتیں اور حمدیں لکھی ہیں۔ بیت بازی بھی کی ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں نے حمدیں، نعتیں لکھنے اور سیرت کو منظوم کرنے میں اطمینان قلب محسوس کیا ہے۔

ر ق: زبردست!! موجودہ عہد کے ادب اطفال میں آپ کا بھی ایک نمایاں نام ہے، آپ کو 2021 کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ادب اطفال سے بھی نوازا گیا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ادب اطفال کی طرف آپ کے قدم کیسے بڑھے اور اس کا مقصد کیا ہے۔

ح ک: انسانی فطرت کے مطابق میں نے ابتدا میں جو شاعری کی اس میں غزلیں تو شامل تھیں مگر یہ بھی درست ہے کہ میں نے بچوں کے پسند کی نظمیں بھی خوب لکھی۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ابتدا ہی سے معلمی کے کام سے وابستہ ہو گیا اس لیے بچوں اور بچوں کی تدریس سے براہ راست میرا رابطہ ہو گیا۔ لہٰذا بچوں کی نصابی کتابوں میں نظمیں پڑھاتے ہوئے اکثر بدمزگی کا احساس ہوتا تو خود اسی موضوع پر نظمیں کہنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح ذہن کے جالے صاف ہوتے چلے گئے اور بچوں کی دلچسپی کے موضوعات پر بہت ساری نظمیں کہہ ڈالی۔ پھر جب مجھے بچوں کی نصابی کتاب کی تدوین کی کمیٹی میں شامل کیا گیا تو اکثر موضوعات پر اردو میں نظمیں نہ پا کر ایک طرح کی تشنگی کا احساس ہوا۔ اور میں نے متعلقہ موضوعات پر نظمیں کہنی شروع کردی اس طرح بچوں کے ادب سے میرا رشتہ شوقیہ سے ضرورت اور ضرورت سے محبت کا بن گیا جو اب تک برقرار ہے۔ رہی بات یہ کہ اس کے پیچھے میرا کیا مقصد ہے تو میں کوئی منصوبہ بنا کر تو آیا نہیں تھا کہ اس منصوبے کے تحت ادب اطفال سے فلاں مقصد حاصل کرنا ہے۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میرا کوئی مقصد نہیں تھا سوائے اس کے اردو ادب اطفال کو جہاں تک ممکن ہو سکے متنوع اور زرخیز بنایا جا سکے۔ بعد میں لوگ کہنے لگے کہ میں نے ادب اطفال میں صالح فکر اور غیر متوقع موضوعات پر نظمیں کہہ کر اس شعبے کو وسعت دی ہے۔

ر ق: بہت خوب! بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل ہے ان کی ذہنی سطح تک پہنچنا ان کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر قلم اٹھانا واقعی بہت دشوار کام ہے اور آپ اس فن میں ماہر ہیں۔ آپ نے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی لکھا مگر ادب اطفال میں شہرت زیادہ ملی، آپ کی نگاہ میں اس کی کوئی خاص وجہ؟

ح ک: قاعدے کے مطابق تو اس کی وجہ ادب کے ناقدوں کو بتانا چاہیے۔ اور ان لوگوں کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حافظ کرناٹکی کا ادب پڑھ چکے ہیں۔ کیونکہ میں نے بچوں کے لیے جتنا لکھا ہے بڑوں کے لیے اس سے کم نہیں لکھا ہے۔ میری اکثر کتابیں بچوں اور بڑوں کے لیے یکساں مفید اور دلچسپ ہیں۔ بلکہ بیشتر کتابیں تو بچوں سے زیادہ

بڑوں کے ذوق مطالعہ کی تکمیل بہتر طور پر کرتی ہیں۔ ویسے میرا ماننا ہے کہ اردو والوں کی آنکھوں پر ایک بار جو عینک چڑھ جاتی ہے وہ جلد نہیں اترتی ہے۔ لوگوں نے مجھے ایک بار بچوں کا شاعر اور ادیب مان لیا ہے تو اب وہ اس لکیر سے ہٹ کر سوچنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس طرح مولوی اسماعیل میرٹھی کو لوگوں نے بچوں کا شاعر مان لیا تو پھر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ مولوی صاحب نے اردو نظم کی ترقی میں کیا کیا کارنامے انجام دیے اور بڑوں کے ادب کو کس کس سطح پر متاثر کیا۔

ر ق: آپ نے درست فرمایا دوسروں کی عینک سے دیکھنے کا رواج ہمارے ادب کی روایت کا حصہ بن چکا ہے۔ ماہر ادب اطفال ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی نظر اپنے ادب کے علاوہ باقی ادبی سرمائے پر بھی ہوگی کیا آپ بچوں کی معاصر ادبی تخلیقات سے مطمئن ہیں؟

ح ک: آپ کا سوال واضح نہیں ہے۔ بہر حال عرض کردوں کہ میں معاصر ادبی تخلیقات سے مطمئن ہوں۔ کیونکہ آج بچوں کے لیے لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بڑی تخلیق پیش کرنے والے فنکاروں کی بھرمار نہیں ہے۔ یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ پہلے زمانے کی طرح ادب اطفال سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ نہیں رہ گیا ہے۔ اسی لیے آج کے عہد میں کوئی کرشن چندر، عظیم بیگ چغتائی، سراج انور، اور اسماعیل میرٹھی کی طرح ابھر کر سامنے نہیں آپا رہا ہے۔ نہیں تو یہ حقیقت ہے کہ بچوں کے لیے اچھا ادب لکھنے والوں کی آج کوئی کمی نہیں ہے۔

ر ق: حافظ صاحب یقیناً آج لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا ہے۔ اگر آپ کو موقع ملے تو ادب اطفال میں کیا تبدیلیاں کرنا چاہیں گے؟

ح ک: مجھے کیا کسی بھی زبان کے بڑے سے بڑے فنکار کو بھی یہ کہہ کر موقع دیا جائے کہ جایئے آپ ادب میں تبدیلیاں پیدا کرکے دکھایئے تو وہ کچھ بھی نہیں کرپائے گا۔ دنیا کا کوئی بھی ایک فنکار چاہے وہ کتنا ہی جینیس کیوں نہ ہو ادب میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتا۔ زبان و ادب میں تبدیلی بہت خاموشی سے اجتماعی طور پر خاص مشن کے ساتھ آتی ہے وہ بھی بہت منظم شکل میں۔ ایک اکیلے ادیب یا شاعر کی بدولت نہیں۔ پورے اردو ادب بلکہ پورے عالمی ادب پر نظر ڈال لیجیے کہیں بھی کوئی تبدیلی کسی ایک فنکار کی وجہ سے نہیں آئی۔ اس کے پیچھے ایک پوری لابی اور مشنری اور فلاسفی کام کرتی ہوئی نظر آئے گی۔

ر ق: ہاں یہ بات درست ہے کہ ایک اکیلا شخص کیا کرسکتا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ کچھ تبدیلی بھلے نہ ہو پھر بھی ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے اپنے حصے کا دیا جلانا چاہیے... ابتدائی درجات کے نصابات میں زیادہ تر ان ادبی نگارشات کو شامل کیا جاتا ہے جن کا تعلق بچوں سے ہوتا ہے کیا آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متن کے انتخاب میں بچوں کی نفسیات اور ذہنی سطح کا خیال رکھا گیا؟

ح ک: جی ہاں، مجھے لگتا ہے کہ نصابات کی تیاری میں ساری باریکیوں کا خیال رکھا جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کہیں سے تو احتجاج کی آواز اٹھتی۔

ر ق: سائنس وتکنالوجی کا یہ دور کتابوں سے دوری اور موبائیل سے نزدیکی کا دور ہے بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ کتابوں کی آخری صدی ہے کیا ایسا واقعی ہے اگر ہے تو اس سے معاشرے کو کتنا اور کس طرح کا نقصان پہنچنے والا ہے۔

ح ک: یہ سب خام خیالی کی باتیں ہیں۔ سائنس اور تکنالوجی جن قوموں نے ایجاد کیا۔ موبائیل، کمپیوٹر، اور انٹرنیٹ جن قوموں نے دنیا کو دیا کیا ان کے بچوں نے کتابیں پڑھنی چھوڑ دی۔ یا ان کے معاشرے میں بگاڑ اور فساد پھوٹ پڑا؟ اور وہ زندگی کے میدان میں پچھڑ گئے، اور جو لوگ خیرات کی سائنس اور تکنالوجی پر جی رہے ہیں وہ ان سے آگے نکل گئے یا جنھوں نے سائنس اور تکنالوجی اور موبائیل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا وہ قومیں ترقی کی معراج پر پہنچ گئیں۔ نہیں نا، یہ سب وقتی ابال ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ر ق: کیا سوشل میڈیا اور دیگر ترغیبات نے ادب کے متبادل کے طور پر جگہ حاصل کرلی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ادیب کا کیا طریقہ کار رہنا چاہیے؟

ح ک: دیکھیے جب پہلے پہل فلمیں بننی شروع ہوئی تھی تو لوگوں کو لگا تھا کہ اب معاشرہ بکھر جائے گا پھر جب ٹی وی، سے ترقی کرکے دنیا نے کمپیوٹر کی ڈگر پر قدم رکھا اور سوشل میڈیا کا جال پھیل گیا تو لوگوں کو لگنے لگا کہ اب لائبریریوں اور یونیورسٹیوں میں تالا لگ جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ ہر نئی چیز ہنگامہ خیز اور پرکشش ہوتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ پرانی چیزیں اور قدریں یکسر فنا ہوجائیں گی۔ اور ایسا ہوتا بھی نہیں ہے۔ سوشل میڈیا کا جو لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں انہیں ضرور اٹھانا چاہیے مگر اس خوف میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے ادب کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔

ر ق: بالکل !امید پر دنیا قائم ہے!! دور حاضر کے کن شعرا کا کلام آپ کو پسند ہے اور اپنی پسند کی وجہ بھی بتانے کی زحمت گوارہ کریں؟

ح ک: عہد حاضر کے کئی شعرا کا کلام مجھے پسند ہے۔ کیونکہ ان کے کلام میں زمانے کی روح کے لمس کا احساس پایا جاتا ہے۔ آج ہر فنکار زیادہ باخبری کے ساتھ لکھتا ہے۔ اس لیے اس کے یہاں زیادہ تنوع پایا جاتا ہے۔

ر ق: نئی نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ح ک: نئی نسل سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی مادری زبان کی قدر اپنی ماں کی طرح کریں ماں اگر بوڑھی، کمزور، اور بیمار ہو تو اور بھی زیادہ توجہ اور محبت کی حقدار ہوتی ہے۔ اس حال میں جو بچے ماں کو نظر انداز کردیتے ہیں وہ زمانے کی نظر میں نالائق ٹھہرتے ہیں، اور ان کی کوئی عزت نہیں رہ جاتی ہے۔

ر ق: آپ نے مادری زبان کی اہمیت کی خوب وضاحت کی ہے کیونکہ یہ ہماری تہذیبی شخصیت کی تکمیل کرتی ہے اس سے محبت اور اس کے تشخص وفروغ کی ذمہ داری ہم سب کی ہے۔ ..ادب میں اقرباپروری کا رجحان پہلے سے رہا ہے مگر ان دنوں یہ کہا جارہا ہے کہ کسی بھی انعام واعزاز کا فیصلہ آپ کے تعلقات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟

ح ک: ادب میں ہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں اقرباپروری کا رجحان شروع سے رہا ہے، اس کے باوجود کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی تھی۔ مگر آج کل انصاف پر حرف آتا نظر آجاتا ہے اسی لیے لوگوں کی شکایتیں بڑھتی جارہی ہیں۔

ر ق: سچائیوں اور روشنی کے احساس کی بات خوب کہی آپ نے... اب آخری سوال آپ کی میری اور ہم سب کی پیاری اردو زبان کے حوالے سے ہے۔ آج اردو تعلیم افسوس ناک حد تک زوال کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے اس کی ترویج وبقا کے لیے کیا موثر اقدامات کرنے چاہئیں؟

ح ک: اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے زوال کے ذمے دار ہم اردو والے خود ہیں۔ ہم میں سے جس کسی کو اتفاقاً کوئی عہدہ مل جاتا ہے تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے شعبے میں ہم سے زیادہ ذہین افراد واشخاص نہ آئیں تا کہ ہماری شخصیت کا فریب یونہی قائم ہے۔ یہی کام اس کے بعد آنے والے لوگ کرتے ہیں۔ اس طرح ذہین لوگ کنارے لگتے چلے جاتے ہیں اور دوسری زبانوں کے لوگوں کو لگنے لگتا ہے کہ سارے اردو والے ایک ہی جیسے چکنے گھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح جہاں اردو برادری کی عزت دوسری زبانوں کی برادری کے سامنے دوکوڑی کی رہ جاتی ہے وہیں ذہین لوگ مایوس ہوکر اس ماحول میں تعفن پھیلانے کو اپنا حق سمجھ لیتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی زبان کو اس آزمائش سے نکال کر سربلندی عطا کرنی ہے تو ہمیں ایماندار، حق گو اور انصاف پسند بننا پڑے گا۔

ر ق: آپ سے بات کرکے اور آپ کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی... شکریہ!

■

Dr. Ramisha Qamer
H.No: 2-907/120/189
Near Mahindra Showroom
Sedam Road
Kalaburagi -585105(KS)
Mob.: 7259673569

منتظر قائمی

ستیہ جیت رے اور ان کی فلمیں

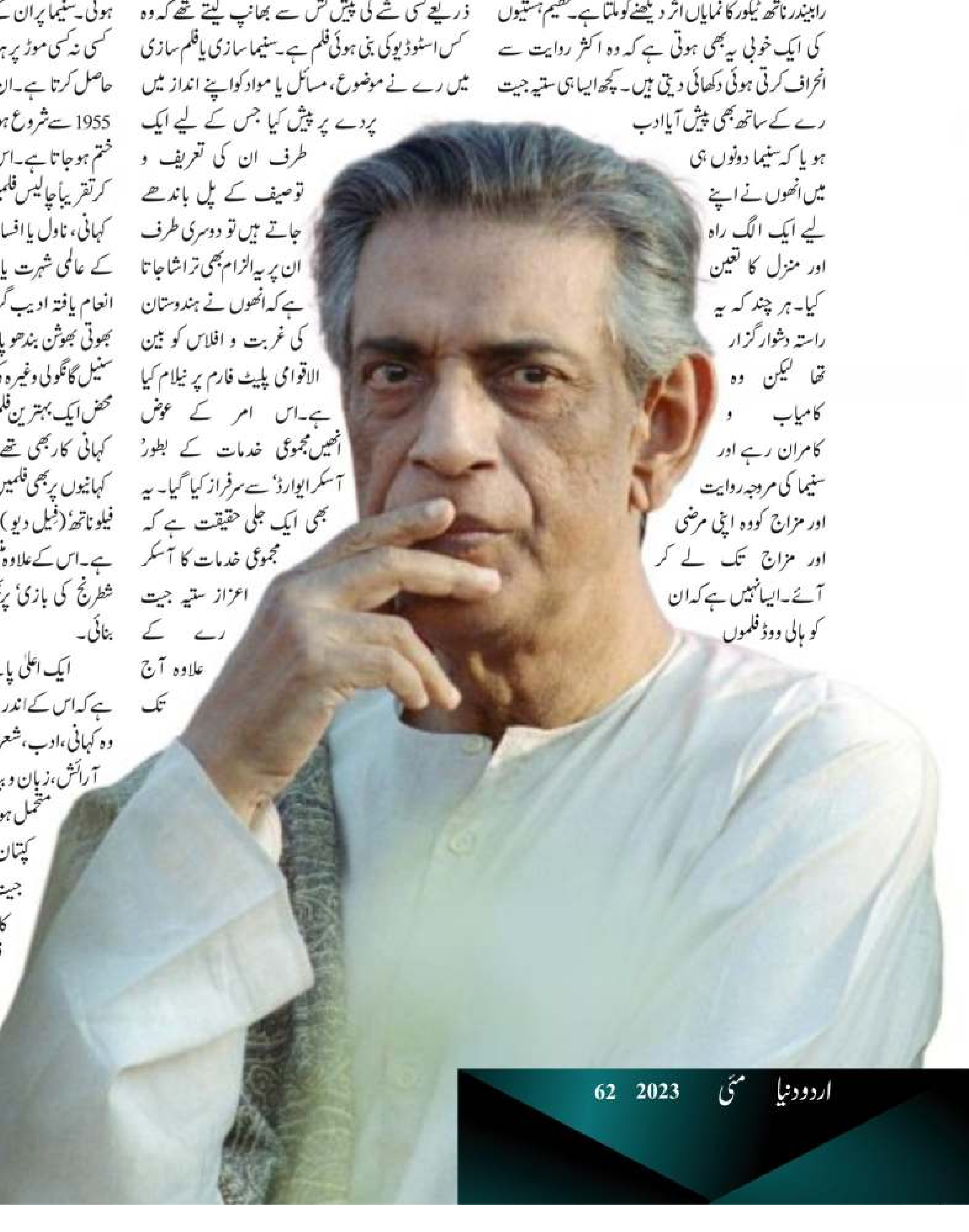

ستیہ جیت رے ایک فلم ساز ہی نہیں تھے بلکہ ایک اعلیٰ پائے کے مصور، خاکہ نگار (اسکیچر)، قلم کار، ڈیزائنر اور موسیقار تھے جن کی شخصیت اور فن دونوں پر گرودیو رابیندر ناتھ ٹیگور کا نمایاں اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ عظیم ہستیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اکثر روایت سے انحراف کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی ستیہ جیت رے کے ساتھ بھی پیش آیا ادب ہو یا کہ سنیما دونوں ہی میں انھوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ اور منزل کا تعین کیا۔ ہر چند کہ یہ راستہ دشوار گزار تھا لیکن وہ کامیاب و کامران رہے اور سنیما کی مروجہ روایت اور مزاج کو وہ اپنی مرضی اور مزاج تک لے کر آئے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کو ہالی ووڈ فلموں کے اسٹائل، مواد، مضمون اور مزاج سے ناواقفیت تھی بلکہ انھوں نے ہالی ووڈ فلموں کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ وہ کیمرے کے ذریعے کسی شے کی پیش کش سے بھانپ لیتے تھے کہ وہ کس اسٹوڈیو کی بنی ہوئی فلم ہے۔ سنیما سازی یا فلم سازی میں رے نے موضوع، مسائل یا مواد کو اپنے انداز میں پردے پر پیش کیا جس کے لیے ایک طرف ان کی تعریف و توصیف کے پل باندھے جاتے ہیں تو دوسری طرف ان پر یہ الزام بھی تراشا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی غربت و افلاس کو بین الاقوامی پلیٹ فارم پر نیلام کیا ہے۔ اس امر کے عوض انھیں مجموعی خدمات کے بطور 'آسکر ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ بھی ایک جلی حقیقت ہے کہ مجموعی خدمات کا آسکر اعزاز ستیہ جیت رے کے علاوہ آج تک کسی دوسرے ہدایت کار کے حصے میں نہیں آیا۔

ستیہ جیت رے کی پیدائش 2 مئی 1921 کو کولکاتا (کلکتہ) میں ہوئی اور 23 اپریل 1992 کو ان کی رحلت ہوئی۔ سنیما پر ان کے نقوش اتنے گہرے اور دیرپا ہیں کہ کسی نہ کسی موڑ پر ہر ہدایت کار ان کی فلموں سے فیضان حاصل کرتا ہے۔ ان کا فلمی سفر 'پاتھیر پانچالی' (نغمۂ راہ) 1955 سے شروع ہوتا ہے اور 'آگنتک' (اجنبی) 1991 پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس دوران انھوں نے چھوٹی بڑی کل ملا کر تقریباً چالیس فلمیں بنائیں جس میں بیش تر کسی نہ کسی کہانی، ناول یا افسانے پر مبنی ہے۔ انھوں نے بنگلہ زبان کے عالمی شہرت یافتہ اور ہندوستان کے اکلوتے نوبل انعام یافتہ ادیب گرو جی ربیندر ناتھ ٹیگور سے لے کر بی بھوتی بھوشن بندھو پادھیائے، تاراشنکر بندو پادھیائے اور سنیل گانگولی وغیرہ کی کہانیوں پر فلم بنائی۔ ستیہ جیت رے محض ایک بہترین فلم ساز ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہترین کہانی کار بھی تھے اس لیے انھوں نے اپنی لکھی ہوئی کہانیوں پر بھی فلمیں بنائیں جن میں ان کا ناول 'جے بابا فیلو ناتھ' (فیل دیو) اور 'سونار کیلا' (سنہرا جنگل) بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ منشی پریم چند کے دو افسانے 'سدگتی' اور 'شطرنج کی بازی' پر بھی ستیہ جیت رے نے بہترین فلم بنائی۔

ایک اعلیٰ پائے کے ہدایت کار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر بہ یک وقت کئی خوبیاں ہونی چاہیے۔ وہ کہانی، ادب، شعر و شاعری، رقص و موسیقی، زیبائش و آرائش، زبان و بیان اور تخلیقی وجدان جیسی صلاحیتوں کا متحمل ہو اسی لیے اسے بعض معنوں میں جہاز کا کپتان یا کسی ٹیم کا لیڈر کہا جاتا ہے۔ ستیہ جیت رے میں یہ خوبیاں تھیں وہ کہانی کار اور موسیقار دونوں ہی تھے جو اپنی فلموں کے لیے اکثر کہانی بھی لکھ لیتے تھے اور خود ہی میوزک کمپوز کر لیتے

تھے اس کے علاوہ کرداروں کا لباس، پوشاک اور سیٹ بھی اپنے خاکوں کے ذریعے بنا لیتے تھے پھر ان کو اپنی وضع کردہ وضع قطع میں سلوا کر کرداروں کو زیب تن کراتے تھے۔ کسی بھی سین، میوزک، سیٹ، لوکیشن اور کاسٹیوم کو لے کر کبھی وہ پریشان نہیں ہوتے تھے۔ فلم سازی کا ہر پہلو ان کے دماغ میں بہت واضح رہتا تھا جس سے وہ کسی بھی قسم کے اشکال کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ ایک فن کار یا آرٹسٹ سے وہ کیسی ایکٹنگ کے طلبگار رہتے تھے وہ اداکار یا کردار کے اندر سے نکلوا لیتے تھے۔ کہیں بھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے معیار میں بہترین کا قائل ہوتے تھے۔ وہ کوئی کمرشیل فلم ساز بھی نہیں تھے کہ فلموں کو ذریعہ معاش سمجھ کر اس کاروبارِ سود و زیاں میں اپنی قسمت آزما رہے ہوں۔ ایسی فلمیں جنھیں عرفِ عام میں مصالحہ دار اور کمرشیل کہا جاتا ہے اور جن میں میلوڈرامائی کیفیت ہو وہ نہیں بناتے تھے اس لیے ان کی فلموں کے ناظرین بھی عام اور سوقیانہ قسم کے ناظرین نہیں ہوتے تھے۔ ان کی زیادہ تر فلمیں باکس آفس پر سنیمائی ناظرین کو متاثر نہیں کرتی تھیں البتہ ان کی فلموں کو ہمیشہ سنجیدہ ناظرین کی تلاش رہا کرتی تھی۔ عام ناظرین فلم میں تفریح کے متلاشی ہوتے ہیں لہٰذا ان کو اگر زندگی کی حقیقتوں سے روبرو کرایا جائے تو ان کی طبیعت اُچاٹ ہونے لگتی ہے کیونکہ ان کی اپنی زندگی خود ہی بہت سی مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار رہتی ہے۔ 'پاتھیر پانچالی' اور 'اپراجیتو' دونوں ہی فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں کیونکہ ان میں زندگی کا تلخ حقیقتوں سے سامنا تھا لیکن غیر ملکی فلمی میلوں یا نمائشوں میں ان فلموں کو اعزازات سے نوازا گیا۔

زمیندارانہ نظام یا جاگیردارانہ نظام کے خاتمے نے اس طبقے کو بہت کسمپرسی اور دشواریوں میں ڈال دیا۔ اس طبقے میں جہاں اور بہت سی خرابیاں رائج تھیں وہیں کچھ خوبیاں یہ تھیں کہ انھوں نے کچھ فنی روایات اور وراثت کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا مگر جب خود کے جینے کے لالے پڑ گئے تو مجملہ فنون کا کیا خیال رکھتے۔ 'جلسہ گھر' (موسیقی خانہ) 1958 میں وہ بنگالی زمیندارانہ طبقے کی زوال آمادگی کا ماتم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں جاگیردار طبقہ اپنی روایت اور وراثت کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وقت، حالات اور زمانے کی تبدیلی نے ان کی شان و شوکت اور جاہ وحشم چھین لیا ہے۔ معاشی حالات کافی بگڑ چکے ہیں مگر وہ اب بھی جاگیردارانہ جاہ وحشم اور دیرینہ تزک و احتشام میں سانس لے رہے ہیں اور احساس برتری میں مبتلا ہیں۔ ان کے مشاغل، سامانِ تفریح اور فنون لطیفہ بھی اسی زوال آمادگی کا شکار ہو گئے۔ 'شطرنج کے کھلاڑی' ایک ایسی فلم ہے جس کے ذریعے ستیہ جیت رے نے پہلی مرتبہ بنگالی تہذیب وتمدن سے الگ ہٹ کر کسی دوسرے تمدن کی عکس بندی کی اور اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ تہذیب وتمدن، ثقافت، معاشرہ اور اس کے عروج و زوال کو دیکھنے اور سمجھنے کا ان کا طریقہ تاریخ نویسوں سے بالکل الگ ہے۔ وہ کسی ایک خاص فریم میں بندھے ہوئے انسان نہیں تھے بلکہ ان کی فلموں کی کہانیوں پر غور کرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ ویسے تو ستیہ جیت رے کی فلموں میں موسیقی کا بہت اہم رول ہے اور وہ فلم کی کہانی کے موڈ اور مزاج کے لحاظ سے بیک گراؤنڈ یا فورگراؤنڈ یعنی پس منظر یا پیش منظر کے لیے موسیقی کا انتخاب کرتے ہیں۔

دوردرشن کو دیے ایک انٹرویو سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ دیہی یا گاؤں کی کہانی میں فوک میوزک کا استعمال کرتے ہیں جس میں ہندوستانی طرز کے موسیقی کے آلات استعمال کرتے ہیں جیسے ستار، سرود، مردنگ، طبلہ، بانسری، شہنائی وغیرہ جبکہ کہانی اگر قصباتی، شہری یا عروس البلادی ہے تو اس میں شہری میوزک کا استعمال ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں میں شہری پس منظر کی کہانیوں میں اول تو بہت مختصر میوزک کا استعمال کرتا ہوں یا اگر کرتا بھی ہوں تو اصل ساؤنڈ، صوت یا آہنگ کا استعمال کرتا ہوں جس سے پس منظر کی موسیقی کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

'پاتھیر پانچالی' (1955) یعنی چھوٹی سڑک کا نغمہ فلم سے انھوں نے اپنی سنیمائی زندگی کے سفر کا آغاز کیا جس کی کہانی بنگلہ زبان کے معروف ناول نگار بی بھوتی بھوشن بندھوپادھیائے کے ناول 'پاتھیر پانچالی' پر مبنی ہے۔ اس فلم سے متعلق ستیہ جیت رے کا کہنا ہے کہ انھوں نے جب اس فلم کی اسکرپٹ پر کام کیا تو انھیں بہت زیادہ زحمت نہیں ہوئی کیونکہ ناول کی زبان ہی ایسی تھی جس کو فلمی میڈیم میں کہانی سنانے کے لیے بہت زیادہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کہانی بنگال کی دیہی زندگی کے غربت و افلاس کا بڑا ہی دردناک منظر پیش کرتی ہے جہاں اونچی ذات کے کسان ہری ہر کو معاشی تنگی کے سبب کنبے کی پرورش میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ فلم میں ہری ہر کی بیٹی درگا کے انتقال کے بعد یہ کنبہ بنارس کوچ کر جاتا ہے۔ اسی طرح 'اپراجیتو' (1956) بھی معروف ناول نگار بی بھوتی بھوشن بندھوپادھیائے کے ناول پر مبنی ہے جو کہ پاتھیر پانچالی کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ فلم بھی بنگال کی دیہی زندگی کا منظرنامہ پیش کرتی ہے۔ یہاں بھی وہی معاشی تنگی پیش کی گئی ہے جس میں ہری ہر کا بھی انتقال ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی یعنی سار باجیا اپنے بیٹے اپّو کو لے کر واپس بنگال کے ایک گاؤں آ جاتی ہے۔ اس سلسلے کی تیسری کڑی 'اپور سنسار' یعنی اپّو کی دنیا ہے جو کہ ناول 'اپراجیتو' کے بقیہ نصف حصے پر مبنی ہے جہاں اپو ایک قلم کار بننے کے فراق میں ہے۔

ستیہ جیت کا خاندان بڑا ہی تخلیقی اور فنی ذہن رکھتا ہے ان کے دادا ایک ماہر موسیقی داں تھے حالانکہ جب وہ محض ڈھائی برس کے تھے اسی وقت دادا جان کا انتقال ہو گیا اور ان کے والد کا بھی بچپن کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ ستیہ جیت رے کے دادا بچوں کے لیے رسالہ نکالتے تھے اور ان کا پرنٹنگ پریس کا کاروبار تھا جس کو انھیں والد کے انتقال کے بعد چھوڑنا پڑا کیونکہ اس وقت ان کا کنبہ بھوانی پور میں رہ رہا تھا مگر والد کے انتقال کے بعد ماں کے ساتھ وہ اپنے ماموں کے یہاں مقیم ہوئے جہاں ان کی ماں کو بڑی مشقت کرنی پڑتی تھی۔ ماں کڑھائی، دستکاری کے ذریعے ستیہ جیت کی پرورش کرتی تھیں لیکن وہ کئی خوبیوں کی مالک تھیں وہ موسیقی کے فن میں بھی طاق تھیں۔ ستیہ جیت رے کی چچی ایک مقبول گلوکارہ تھیں جن کے ذریعے رے کی کئی میوزک اسٹوڈیو تک رسائی ہوئی جن میں ایچ ایم وی اور کولمبیا جیسی میوزک کمپنیاں شامل ہیں۔ رے بچپن سے ہی ڈرائنگ (Drawing) اور

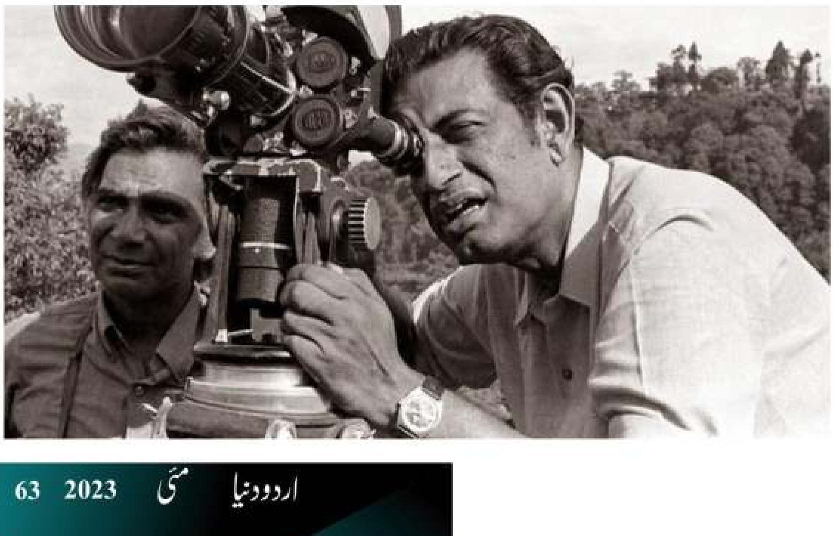

اسکیچنگ (Sketching) کرنے لگے تھے جو آگے چل کر ان کی فلمی زندگی میں بڑے ہی معاون فن ثابت ہوئے۔ ستیہ جیت رے پینٹنگ یا مصوری میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے حالانکہ انھوں نے اس کے لیے کہیں کوئی ٹریننگ یا تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ ستیہ جیت رے ایک بہترین تخلیق کار بھی تھے انھوں نے فکشن کے تحت بہت سی کہانیاں لکھیں اور بچوں کی میگزین کے لیے بھی کہانیاں لکھتے تھے جس کو بعد میں متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ ان کی مصوری میں ٹیگور کے شانتی نیکیتن کا رول رہا ہے جہاں ان کو مصوری، اسکیچنگ اور ڈرائنگ کے لیے ایک معقول اور سازگار فضا میسر ہوئی اور ان کا فن باریکیوں کی بلندی پر پہنچ گیا۔

وہ ایک خود ساختہ مصور اور خاکہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک خود ساختہ فلم ہدایت کار بھی تھے۔ فلم سازی کی تربیت کے لیے بھی انھوں نے کسی اسکول یا فلمی ادارے کا رخ نہیں کیا بلکہ امریکی فلمیں دیکھ کر انھوں نے فلم سازی کا کرافٹ یعنی اس کی بُنت یا تانا بانا سیکھا۔ ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ستیہ جیت رے اتنے ماہر تھے کہ وہ فلم کو دیکھ کر یہ بتا دیتے تھے کہ فلم کو کس اسٹوڈیو نے بنایا ہے کیونکہ انھوں نے نامی گرامی اسٹوڈیو کے خصائص اور باریکیوں تک رسائی حاصل کر لی تھی جن سے فلموں کو پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کو لوگ پیار سے مانک دا پکارتے تھے۔ سر رچرڈ نے مانک دا کے متعلق بیان کیا ہے کہ ستیہ جیت رے کے متعلق ایک بات جو امتیازی ہے وہ یہ ہے کہ فلم میکنگ کے اتنے سارے کام خود انجام دیتے ہیں جسے الگ الگ شعبہ ہائے فن کے ماہرین انجام دیتے ہیں۔ وہ خود ہی اسکرین پلے لکھتے ہیں، خود ہی میوزک کمپوز کرتے ہیں اور خود ہی ہدایتکاری بھی کر دیتے ہیں اور کیمرہ بھی خود ہی آپریٹ کر لیتے ہیں۔ سیٹ پر روشنی کیسی ہوگی اس میں بھی ان کا اہم رول ہوگا۔ چارلی چیپلن کی طرح وہ خود ہی اپنی فلم کو ایڈٹ بھی کر لیتے تھے۔

بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ ستیہ جیت رے ایک کہانی کار بھی تھے اور انھوں نے کہانیاں بھی خوب لکھیں۔ وہ ایک ایسے قلم کار تھے جو اپنے چہار جانب ہونے والے زمیندارانہ، سیاسی، سماجی اور مذہبی ناانصافیوں سے بخوبی واقف تھے جس کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا بلکہ فلموں میں بھی اس قسم کے موضوعات کو برتا جس کے لیے ان کو معتوب بھی ٹھہرایا گیا مگر وہ ان سے ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ وہ بڑی مضبوطی سے اپنے موقف پر قائم رہے۔ سنیما میں وہ ادب کے مانند استعارے اور علامتوں کا بخوبی استعمال کرتے تھے۔ فلم 'اِنر آئی' جو کہ شانتی نیکیتن میں آرٹ کے پروفیسر بینود بہاری مکھوپادھیایائے کی سوانح پر مبنی ہے۔ بینود بہاری ایک نابینا شخص ہیں جن کی ایک آنکھ پیدائش سے ہی خراب تھی البتہ دوسری آنکھ ترپن برس کی عمر میں موتیا بند کے سبب خراب ہوگئی مگر آرٹ نے ان کی زندگی میں روشنی برقرار رکھی۔ یہ فلم ہمیں انگریزی زبان کے شاعر جان ملٹن کی یاد دلاتی ہے جنھیں اپنی آنکھوں کی بینائی سے محرومی نے بڑی ہی مایوسی میں ڈال دیا تھا لیکن ملٹن نے اپنے دل یا روح کی آنکھ کے ذریعے دنیا کے سربستہ راز کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کچھ اسی قسم کا پیغام ہم ستیہ جیت رے کی اس فلم میں بھی محسوس کرتے ہیں۔

گرودیو رابیندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت سے متاثر ہو کر انھوں نے 'رابیندر ناتھ ٹیگور' پر ایک فلم بنا کر ایک عظیم علمی اور عبقری شخصیت کو بڑے ہی موثر انداز میں ادبی خراج پیش کیا ہے۔ بہت سے لوگوں کی طرح ستیہ جیت رے بھی ان کے پرستاروں میں شامل ہیں۔ فلم میں ان کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلوؤں کی طرف اشارے اور وضاحت کی گئی ہے جن کو ستیہ جیت رے اگر نہ اجاگر کرتے تو دنیا کو ٹیگور کی عظمت کے نقوش کا پتہ ہی نہ چلتا۔ ٹیگور کی پیدائش کے سو برس مکمل ہونے کے موقعے پر 'تین کنیا' (تین بیٹیاں، 1961) فلم بنائی جو رابیندر ناتھ ٹیگور کے افسانے 'پوسٹ ماسٹر'، 'مونی ہارا' (گمشدہ زیور) اور 'سماپتی' (اختتام) پر مبنی ہے۔ ان تینوں کہانیوں کے متعلق ستیہ جیت رے نے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ وہ گرودیو کی شخصیت اور ان کی تخلیقات سے بے حد متاثر تھے اس لیے انھوں نے ٹیگور نام سے فلم بنانے کے ساتھ 'تین کنیا' بنا کر ان کو اپنی جانب سے ذاتی طور پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ادب، تہذیب اور ثقافت کا مطالعہ کرنے والوں کو ستیہ جیت رے کی فلمیں تاریخ، جاگیرداری، ترقی پسندی اور جمہوریت کا علامتی بیانیہ معلوم ہوگا۔ 'جلسہ گھر' سے لے کر 'شطرنج کے کھلاڑی' تک میں جاگیردارانہ تہذیب اور اس کے اجڑنے اور مٹنے کا ایک بڑا ہی دل سوز منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں طبقہء اشرافیہ اپنے زوال پذیر اقدار سے لپٹے رہنا چاہتا ہے جبکہ تبدیلی یا انقلاب ان کی دہلیز پر دستک دے رہا ہے جس سے اشرافیہ طبقے کے نبرد آزما ہونے کی سکت معدوم ہو چلی ہے۔ 'جلسہ گھر' (موسیقی خانہ) بنگلہ زبان کے معروف کہانی کار تارا شنکر بندھو پادھیائے کے افسانے پر مبنی ہے جو کہ اسی نام سے بنگلہ زبان میں مشہور ہے جبکہ 'شطرنج کے کھلاڑی' پریم چند کے معروف افسانے 'شطرنج کی بازی' پر مبنی ہے اور دونوں کے موضوعات میں ایک نقطے پر یکسانیت معلوم ہوتی ہے۔ دونوں ہی فلموں میں تاریخ اور سیاست کی زیریں لہریں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں جن پر سوال کیا گیا ہے اور دونوں ہی ہمیں کہیں نہ کہیں غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ بدلتے ہوئے حالات میں آخر وقت کی نبض پر ہمارا بس نہیں تھا۔ Satyajit Ray: The Inner Eye کے مصنف اینڈریو رابنسن (Andrew Robinson) نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ ستیہ جیت رے کی فلمیں سنیما کا بیش قیمتی خزانہ ہیں جنھیں ہر کوئی بڑی دلچسپی سے دیکھتا ہے۔ سومترا چٹوپادھیائے جنھوں نے ستیہ جیت رے کی تقریباً چودہ بڑی فلموں میں اداکاری کی ہے ان کا کہنا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ ستیہ جیت رے کی فلمیں نئی روشنی یا نئے سیاق میں دیکھیں گے اور آپ کو ان کی فلموں میں انسانی اقدار کی فتح مندی نظر آئے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ رے کا کوئی سیاسی موقف نہیں تھا بلکہ وہ اپنا ایک سیاسی اور سماجی موقف رکھتے تھے البتہ انھوں نے اپنے سیاسی موقف کو فن یا آرٹ پر ترجیح نہیں دی۔

پنڈت روی شنکر نے ان کی بہت سی فلموں کے لیے سین اور سچوئیشن کے لحاظ سے میوزک کمپوز کیا جن میں 'پاتھیر پانچالی'، 'اپراجیتو'، 'پارش پاتھر' اور 'اپور سنسار' جیسی فلمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ استاد اکبر علی خان، ولایت خان جیسے مایہ ناز موسیقاروں سے بھی اپنی فلموں کے لیے میوزک کمپوز کرائی۔ موسیقی میں ستیہ جیت کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کنچن جنگا، ابھیجان، مہانگر، چارولتا، کاپُروش و مہاپُروش، نائک، چڑیا خانہ، پرتی دوندی، گوپی گینے باگا بینے، سکم، بالا، شطرنج کے کھلاڑی، جئے بابا فیلو ناتھ، سدگتی، گھر بائرے، گن شترو اور آخری فلم 'آگنتُک' تک میں انھوں نے خود ہی میوزک کمپوز کیا۔ ان کی اس مہارت پر پنڈت روی شنکر نے ایک جگہ انٹرویو میں کہا کہ ستیہ جیت رے کو ہندوستانی کلاسکی موسیقی کی سمجھ اتنی ہی تھی جتنا کہ وہ مغربی کلاسکی موسیقی سے خاطر خواہ آگاہی رکھتے تھے اور وہ ایک ایسے ہدایت کار تھے جو کسی بھی حال میں سمجھوتہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی مجھے اپنی کمپوزیشن سے باہر جانے دیتے تھے۔

■

Dr. Muntazir Qaimi
Dept of Urdu
FAA Govt. PG College
Mahmudabad (Awadh)
Sitapur- 261203 (UP)
Mob.:8127934734

محمد فیصل خان

قاضی عبدالستار

شخصیت اور فن

قاضی عبدالستار وہ اہم نام ہے جس نے اپنے تاریخی، سماجی ناولوں اور افسانوں کے ذریعے اردو فکشن میں ممتاز اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ قاضی عبدالستار صرف فکشن نگار کی حیثیت سے ہی نہیں پہچانے جاتے بلکہ وہ اردو ادب کے ایک بلند پایہ استاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالستار ایک بے باک انسان، خوش بیاں مقرر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ہندی کے مشہور ادیب 'بابا ناگارجن' نے ان کو اردو ادب کا دوسرا پریم چند کہا ہے۔ قاضی عبدالستار نے اس وقت قلم اٹھایا جب ترقی پسند تحریک کا جادو اردو ادب کی دنیا میں سر چڑھ کو بول رہا تھا اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ بڑے بڑے نامور ادیب، نقاد اور فکشن نگار اردو ادب کی دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ ایسے میں قاضی عبدالستار نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے اپنے لکھے کی داد ان نامور اور شہرت یافتہ ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں سے اس طرح حاصل کی جیسے خراج وصول کیا جاتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے اپنے تخلیقی کارناموں کی عظمت و انفرادیت کا پرچم اس طرح لہرایا جسے اردو ادب کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ قاضی عبدالستار کی تخلیقات اردو ادب کے دیوانوں اور متوالوں کے لیے ہمیشہ مسرت و بصیرت کا سامان فراہم کرتی رہیں گی۔

ڈاکٹر عبدالغفور رقم طراز ہیں:

''اردو ادب کے ناول نگاروں میں ان کی شخصیت اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ انھوں نے اودھ کی سماجی زندگی کے علاوہ تاریخی شخصیات و حقائق کو فنی پیرائے میں اپنے منفرد اسلوب و نگارش کے ذریعے پیش کر کے نہ صرف اردو ادب کے قارئین کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے بلکہ حقائق و تاریخ کو بھی پکی روشنائی سے بقائے دوام بخشا ہے۔ اس کارِ نمایاں سے اُنہیں بھی فیض حاصل ہوا۔ انھیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ اور دورِ حاضر کے ناول نگاروں میں روشنی کے مینار کہلائے۔''

(قاضی عبدالستار : بحیثیت ناول نگار، مرتب ڈاکٹر عبدالغفور: دانش کدہ، دریاپور، سبزی باغ پٹنہ 2016، ص 291)

قاضی عبدالستار کی پیدائش 9 فروری 1933 کو ضلع سیتاپور کے ایک گاؤں مچھریٹہ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی، گھر میں چھبن کے نام سے جانے جاتے تھے۔ والد کا نام 'قاضی عبدالعلی' عرف ننھے میاں اور والدہ کا نام 'عالمہ خاتون' تھا۔ والد صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا وہ مہینوں مہینوں شکار کی مہم سے گھر واپس نہیں آتے تھے، ان کے اس شوق کو خود قاضی صاحب نے جنون سے تعبیر کیا ہے۔

قاضی صاحب نے ہائی اسکول 1948 میں راجہ رگھو ویر دیال انٹر کالج (آر آر ڈی) سے اور انٹر میڈیٹ بھی اسی کالج سے 1950 میں پاس کیا، 1952 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) اول نمبر سے پاس کیا، اور 1954 میں ایم اے کی ڈگری فرسٹ پوزیشن کے ساتھ حاصل کی جس پر انھیں بہادر شنکر دیال گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 'پروفیسر رشید احمد صدیقی' کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ 'اردو شاعری میں قنوطیت' کے موضوع پر لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری 1957 میں حاصل کی، قاضی عبدالستار کی ملازمت کا سلسلہ 1956 سے شروع ہوتا ہے۔ 1956 میں بحیثیت عارضی لکچرر قاضی عبدالستار کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تقرر ہوا اور اس کے بعد 62-1961 میں یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مستقل طور پر لکچرر مقرر ہوگئے۔ 1967 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر ہوئے۔ 1980 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے۔ 1988 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1993 میں اپنی طویل خدمات انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

قاضی عبدالستار کی شخصیت پہلو دار تھی۔ ان کی زندگی میں کئی رنگ دیکھے جا سکتے ہیں، جیسے یہ بات بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ یہ وہم پرست انسان تھے۔ نجومیوں، پنڈتوں، سجادہ نشینوں اور ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والوں کی باتوں پر یقین رکھتے تھے، جن، بھوت، پری، جادو، ٹونا، ٹوٹکا وغیرہ سے خوف زدہ رہتے تھے۔ میرے استاد محترم پروفیسر ابوبکر عباد اپنے مضمون 'قاضی عبدالستار: شخص، فن اور اسرار' میں لکھتے ہیں:

''مختلف قسم کے اوہام میں مبتلا ہو جانا ان (قاضی عبدالستار) کی نفسیاتی کمزوری تھی، چنانچہ وہ ستاروں کی

چال، ہاتھوں کی لکیر، جوگی کی پیشین گوئی اور دوسرے شگون وغیرہ پر یقین رکھتے اور جن، بھوت، چڑیل سے ڈرتے تھے۔'' ('ایوان اردو' دہلی اکتوبر 2019، ص 22)

قاضی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے 1947 میں شروع کیا اور صہبا تخلص اختیار کیا۔ یہ تخلص ان کے دادا کے دوست 'بابو گرچرن لال شیدا نبی نگری' نے دیا تھا جو شاعری میں ان کے استاد بھی تھے، لیکن جلد ہی قاضی صاحب نے شاعری ترک کر دی، اس کی کئی وجوہات بتائی گئی ہیں۔

شاعری سے دست برداری کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے دادا کے دوست 'شہزاد لکھنوی' قاضی صاحب کو مشاعروں میں لے جاتے اور انھیں اپنی غزل دے کر زبردستی اسٹیج پر کھڑا کر دیتے اور جب قاضی صاحب مصرعہ غلط پڑھتے تو وہ محفل میں ہی ترمیم کر کے درست کر دیتے جس سے لوگ یہ سمجھ جاتے کہ یہ غزل قاضی صاحب کی نہیں بلکہ شہزاد لکھنوی کی ہے اس سے آپ کو رسوائی محسوس ہوتی۔ شاعری کو چھوڑنے کی ایک اور وجہ بھی ملتی ہے کہ قاضی صاحب اپنی غزلوں پر بابو گرچرن لال شیدا نبی نگری سے اصلاح لیتے تھے اور وہ شراب کے گھونٹ اور سگریٹ کے کش کے ساتھ ایسی اصلاح کرتے کہ دس منٹ میں قاضی صاحب کی غزل ان کی ہو جاتی۔ شاعری ترک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ 1956 میں قاضی صاحب مشاعرے کے لیے بارہ بنکی گئے جہاں ایک واقعہ پیش آیا جس کے بعد تو شاعری سے نفرت ہی ہوگئی۔ قاضی عبدالستار کے چہیتے شاگرد اور میرے استاد پروفیسر ابن کنول کی زبانی اس واقعہ کو خود پڑھ لیں:

''ہوا یہ کہ بارہ بنکی کے مشاعرے میں گئے وہاں ایک رئیس کے مہمان خانہ میں آرام کر رہے تھے کہ کچھ لڑکیاں ادھر کو آتی ہوئی دکھائی دیں لیکن فوراً ہی پیچھے سے ان کی ماں دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں ''اے لڑکیو! ادھر مت جانا ادھر وہ شاعر ٹھہرا ہوا ہے۔'' قاضی صاحب نے سوچا شاعر ایسی چیز ہے کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو بھی اس کے سامنے جانے سے روکتے ہیں اور شاعری بالکل چھوڑ دی۔''

('نذر قاضی عبدالستار' مرتب پروفیسر محمد غیاث الدین۔ مشمولہ 'منفرد فنکار: قاضی عبدالستار' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2006، ص 258)

قاضی صاحب کی طبیعت فکشن کے لیے بہت موزوں تھی جس کو انھوں نے بہت جلد ہی پہچان لیا اور متعدد تاریخی، سماجی، رومانی اور سوانحی ناول اور افسانے لکھ کر اردو ادب میں اپنی ایک منفرد جگہ بنائی۔ قاضی صاحب کا پہلا افسانہ 'اندھا 1946' ہے جو لکھنؤ کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے 1962 تک افسانے نہیں لکھے بلکہ باقاعدہ افسانے کا آغاز 1964 میں 'پیتل کا گھنٹہ' سے ہوتا ہے۔ جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ قاضی صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ 'پیتل کا گھنٹہ' ہے جس میں تین افسانے اور ایک ناولٹ شامل ہیں۔ بعد میں قاضی صاحب کے عزیز شاگرد پروفیسر محمد غیاث الدین نے 1995 'آئینۂ ایام' کے نام سے قاضی صاحب کے 28 افسانوں کو مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

قاضی عبدالستار صرف فکشن نگار کی حیثیت سے ہی نہیں پہچانے جاتے بلکہ وہ اردو ادب کے ایک بلند پایہ استاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالستار ایک بے باک انسان، خوش بیان مقرر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ہندی کے مشہور ادیب 'بابا ناگارجن' نے ان کو اردو ادب کا دوسرا پریم چند کہا ہے۔

قاضی عبدالستار کے ابتدائی افسانوں میں اودھ کے علاقے میں رہنے والے زمین داروں کے زوال پذیر معاشرے کے ساتھ ہمدردی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے ساتھ روایتی سلوک نہیں برتا جو خصوصاً ترقی پسندوں نے کیا کہ ان کی نظر میں ہمیشہ جاگیر دار طبقہ ہی ظالم ہوتا ہے۔ بلکہ قاضی عبدالستار درمیانی راستے کا انتخاب کرتے ہیں اور انصاف کے ساتھ دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک بڑی خوبی ان کا استدلالی اندازِ بیان ہے وہ ہر کہانی کو کسی نہ کسی سچے واقعے سے جوڑ دیتے ہیں اور اس کا تعلق اکثر و بیشتر سیتاپور کے زمین دار گھرانوں سے ہوتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے تعلقہ داروں کی زندگی کا تجربہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کا بچپن انھیں کے درمیان میں گزرا اور وہ پروان بھی انھیں کی سرپرستی میں چڑھے۔ لہٰذا جس باریکی اور گہرائی سے قاضی صاحب نے اس تہذیب کو دیکھا، سمجھا اور اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا وہ بس انھیں ہی کا حصہ تھا جس میں وہ پوری طرح سے کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں میں مختلف موضوعات کی پیش کش دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان میں زمین دار طبقے کا عروج وزوال، جاگیرداری کا خاتمہ، نئی تہذیب کی آمد اور پرانی تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش، دولت مندوں کی عیش پرستی، عیاشی اور بے جا اسراف، غریبوں اور بے کسوں کا استحصال، تعلقہ داروں سے ہمدردی اور ان کی کمیوں کی نشان دہی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی برائیاں، اخلاقی پستی، اعلیٰ اور اوسط طبقے کی عورتوں کے جنسی مسائل، قتل وغارت گری، اغوا، بلیک میلنگ، آبروریزی، روایتی قدروں کی بقا کے لیے خوں ریزی، مزدوروں اور کسانوں کے حالاتِ زندگی، تقسیم ہند اور ہجرت کے مسائل، فرقہ وارانہ فسادات، مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت اور اس عہد کی عکاسی جیسے بے شمار موضوعات شامل ہیں جس کو قاضی عبدالستار نے اپنے قلم کی زینت بنایا۔ لہٰذا قاضی صاحب کے بیالیس افسانوں کو موضوعات کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1 دیہاتی موضوعات سے متعلق افسانے: پیتل کا گھنٹہ، مالکن، روپا، لالہ امام بخش، وراثت، رضو باجی، پرچھائیاں، نازو، واپسی، دیوالی، ٹھاکر دوارہ، سالمی، ایک کہانی، میراث، نومی، سینگ، کھاکھا، قد آدم مشعل، مجری، دھندلے آئینے، گرم لہو میں غلطاں اور سایہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

2 شہری موضوعات سے متعلق افسانے: سوچ، ماڈل ٹاؤن، پہلی موت، جنگل، مشین، ایک دن، داغ، تحریک، کتابیں، آڑے ترچھے آئینے وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

3 تاریخی موضوعات سے متعلق افسانے: آنکھیں، نیا قانون، سات سلام، بھولے بسرے وغیرہ اہمیت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ قاضی صاحب کے چند افسانے اور بھی ہیں جیسے: حرفوں کے صلیب، گھسو، مموا لالہ اور بلا عنوان وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

قاضی صاحب کا پہلا ناول 'شکست کی آواز' ہے جو 1954 میں شائع ہوا، اسی ناول کو ہندی میں 'پہلا اور آخری خط' کے نام سے 1962 میں الہ آباد سے شائع کیا گیا، یہی ناول پاکستان میں 'دود چراغ محفل' کے نام سے 1961 میں رسالہ نقوش میں لاہور سے شائع کیا گیا، اسی ناول کو مجروح سلطانپوری 60-1958 کے درمیان ممبئی لے کر گئے اور کسی بڑے رسالے میں شائع کرایا۔ قاضی صاحب کے ناولوں کو سماجی، رومانی، سوانحی اور تاریخی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

قاضی صاحب کے سماجی ناولوں میں شب گزیدہ (1960)، مجو بھیا (1963)، بادل (1965)، غبار شب

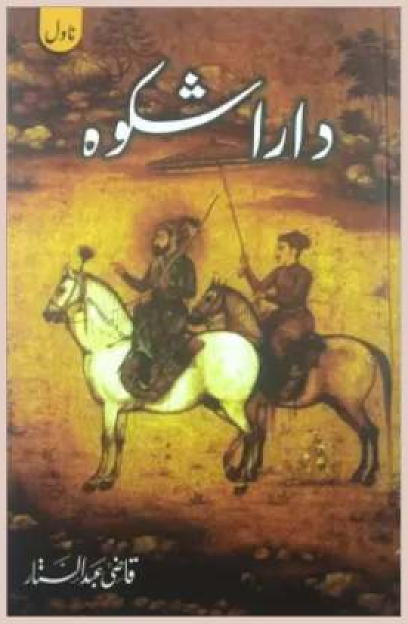

(1966)، حضرت جان (1990) کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کے دو ناول تاجم سلطان (2005) اور آخری کہانی (2015) ہے۔ جن کا شمار رومانی اور سوانحی دونوں زمروں ہوتا ہے۔

قاضی صاحب کے تاریخی ناولوں میں بڑی جان ہے، وہ فن اور تاریخ دونوں کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا، یہی وجہ ہے کی قاضی صاحب کو تاریخ جیسے اہم موضوع کو فن پارے کی شکل دینے والوں میں ایک بلند مقام حاصل ہے اور یہی ان کی شہرت اور عظمت کا سب سے بڑا سبب ہے، قاضی صاحب کے مشہور تاریخی ناولوں میں صلاح الدین ایوبی (1964)، داراشکوہ (1967) اور خالد بن ولید (1995) کا شمار ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے تاریخی ناولوں کے ذریعے اردو ادب میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے، قاضی صاحب نے تاریخی ناولوں کے ذریعے اس روایت کو پروان چڑھایا جس کی بنیاد 'عبدالحلیم شرر' نے رکھی تھی، اس کے بعد تاریخ کو موضوع بناکر ادب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کئی ادیبوں نے کی جیسے : عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور اور قاضی عبدالستار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، مگر ان میں جو شہرت اور بلندی تاریخی ناولوں کے بنا پر قاضی صاحب کے حصے میں آئی وہ قابل غور بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔ بقول ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے اپنے مخصوص اسٹائل اور دلفریب اندازِ بیان سے تاریخی ناولوں میں ایک ایسے گوہر کا اضافہ کیا ہے جس کی آب و تاب کبھی ماند نہیں پڑے گی۔''

(اردو ناول پریم چند کے بعد، مرتب ڈاکٹر ہارون ایوب: اردو پبلشرز تلک مارگ لکھنؤ 1978، ص 236)

ان سب کے علاوہ قاضی عبدالستار کی دو تنقیدی کتابیں بھی ہیں ان میں پہلی 'اردو شاعری میں قنوطیت' ہے یہ ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس کو انھوں نے 1957 میں مکمل کرلیا تھا جو 1963 میں پہلی بار منظر عام پر آئی۔ اور دوسری کتاب 'جمالیات اور ہندوستانی جمالیات' ہے جو 1973 میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ انھوں نے دو درجن کے آس پاس تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان میں نثر کا عہد، مجاز کا لکھنؤ، سرسید کا اسلوب، فن افسانہ نگاری، رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ، سوانح خوانی کے آداب، ملکہ ترنم نور جہاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قاضی عبدالستار کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھیں علمی و ادبی کاوشوں کے سلسلے میں متعدد اعزازات وانعامات سے بھی نوازا گیا۔ ہندی کے مشہور ادیب 'بابا ناگارجن' نے 1962 میں قاضی عبدالستار کو الہ آباد بلایا اور 'الکا' ہوٹل میں 'تامپتر ایوارڈ' سے نوازا، شال اوڑھائی اور تقریب میں قاضی عبدالستار کے لیے کچھ تاریخی جملے کہے۔

1 ''قاضی عبدالستار کے روپ میں دوسرا پریم چند پیدا ہوا''

2 ''ہندی ادب کے جس شخص کو دیہات پر لکھنا ہو وہ قاضی عبدالستار کو ٹیکسٹ بک کی طرح پڑھے''

3 ''قاضی عبدالستار Prose کا بادشاہ ہے''

قاضی عبدالستار کو 'صلاح الدین ایوبی' لکھنے پر اس وقت کے صدر جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد کے ہاتھوں اردو فکشن کا پہلا 'غالب ایوارڈ' 1973 میں دیا گیا۔ 1974 میں 'پدم شری' سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کو 'اعزاز میر' 1977، 'یوپی اردو اکادمی' 1978، 'عالمی فکشن ایوارڈ' 1987، 'قومی اردو ایوارڈ' 1988، 'مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی گیانیشور ایوارڈ' 1988، 'پہلا نشانِ سرسید ایوارڈ' 1988، 'پہلا سد بھاؤنا کمیٹی سرسید ایوارڈ' 1996، 'بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' 2002، 'عالمی اردو ایوارڈ' 2005، مدھیہ پردیش کی جانب سے دیا جانے والا ایوارڈ 'اقبال سمان' 2006، 'پہلا یونیورسٹی اردو ٹیچر ایوارڈ' 2008، 'پہلا یوپی ہندی سنستھان ایوارڈ' 2011 جیسے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

اس طرح اردو فکشن کا ایک بلند پایہ شخص جس نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے نام کو حیاتِ جاودانی تو عطا کردی۔ مگر 'کل نفس ذائقۃ الموت' کی حقیقت سے خود کو محفوظ نہ کرسکا اور داغِ مفارقت دیتا ہوا اس دارِ فانی سے رخصت ہوگیا۔ اس واقعے کو 'ڈاکٹر پریم کمار' کی زبانی جس کا ترجمہ 'ڈاکٹر نثار کوثر' نے کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''وہاں (مچھریٹہ میں) 23 ستمبر کو اچانک طبیعت بگڑی، جلدی جلدی کر کے سرگنگا رام ہسپتال دہلی لے جایا گیا دو مہینے ہسپتال کے آئی سی یو میں رہنے کے درمیان کئی مرتبہ صحت میں کمی آئی۔ کئی مرتبہ حالت سنورتی دکھائی دی لیکن 29 اکتوبر 2018 کو رات 2:30 (ڈھائی بجے) اپنے صاحب زادے شاہ ویز کے گھر پر انھوں نے آخری سانس لی۔ اسی دن دوپہر میں انھیں علی گڑھ لایا گیا۔ جہاں شام پانچ بجے اے ایم یو کے قبرستان (منٹوئی) میں دفن کیا گیا۔''

(مضمون 'تنہائی کے عاشق اور قلم کے جادوگر: قاضی عبدالستار' سہ ماہی فکرونظر علی گڑھ دسمبر 2021، ص 70-69)

قاضی عبدالستار کی جو شہرت اور عظمت ہے اس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اور قوی امید ہے کہ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ اس میں ایسے روشن موتی جگمگائیں گے جس کی روشنی کبھی کم نہ ہوگی۔ قاضی صاحب کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے 'محسن نقوی' کا یہ شعر موقع اور مناسبت کے لحاظ سے بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔

یاد آؤں گا تجھے ذہن کی ہر منزل پر
حرفِ سادہ تو نہیں ہوں کہ بھلایا جاؤں

کتابیات

1 اردو ناول پریم چند کے بعد: مرتب ڈاکٹر ہارون ایوب، اردو پبلشرز، تلک مارگ لکھنؤ 1978
2 قاضی عبدالستار: فکرفن اور فنکار، ڈاکٹر احمد خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2005
3 قاضی عبدالستار: اسرار وگفتار، راشد انور راشد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 2014
4 قاضی عبدالستار: بحیثیت ناول نگار: مرتب ڈاکٹر عبدالغفور، دانش کدہ دریاپور، سبزی باغ پٹنہ 2016
5 نذر قاضی عبدالستار، مرتب پروفیسر محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی پہلا اڈیشن 2006
6 فکرونظر (سہ ماہی) علی گڑھ دسمبر 2021
7 ایوانِ اردو (ماہنامہ) اپریل 2019

Mo Faisal Khan
Research Scholar Delhi University
Delhi-110007
Mob.:9918998144
Email.: fk.nadwa123@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

انیس کے مرثیے

نام مرتب: صالحہ عابد حسین (جلد اول و دوم)
صفحات: 504+612=1116
قیمت: جلد اول، 250، دوم 275 روپے، تیسری اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عبدالرحمٰن، F-209/16، شاہین باغ، نئی دہلی 25

مرثیہ ایک شعری صنف ہے جس میں مرنے والے کے محاسن وفضائل کو بیان کر کے رنج وغم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کے شعری نقوش دنیا کی قدیم زبانوں خصوصاً عربی اور فارسی میں موجود ہیں۔ اردو زبان میں یہ روایت فارسی زبان سے مستعار ہے۔ فارسی میں مرثیے کی اولین روایت رودکی کے یہاں نظر آتی ہے۔ جس میں اس نے اپنے دوست کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ علاوہ ازیں فردوسی کے مرثیے 'سہراب' کو فارسی مراثی میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو میں غالب کا 'مرثیۂ عارف' اور حالی کا 'مرثیۂ غالب' اور اقبال کا مرثیہ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اسی نوعیت کے مراثی ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی چہیتے کی وفات پر شعری پیرایہ بیان میں مرنے والے کی اچھائیوں کو یاد کرنے اور اس پر آنسو بہانے کو مرثیہ کہتے ہیں۔ جب کہ اردو ادب میں مرثیہ ایسی شاعری ہے جس میں اہل بیت کی شہادت اور ان پر ڈھائے گئے مظالم کی داستان منظوم ہو۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''جب ہم صرف لفظ 'مرثیہ' بولتے ہیں تو ذہن فوراً شہادت حسین اور واقعات کربلا سے متعلق کہی گئی نظموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور اب اردو میں مجرد لفظ 'مرثیہ' اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔'' (دیباچۂ کتاب، ص 18)

حالانکہ کربلائی واقعات پر مبنی شاعری اور اہل بیت پر مظالم کی شعری داستان کی روایت بہت قدیم نہیں ہے۔ اس نوعیت کی نظم سب سے پہلے فارسی شاعر محتشم کاشی کے یہاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اہل بیت سے محبت کے اظہار اور اخروی کامیابی وکامرانی کی غرض سے کربلائی واقعات کو موضوع سخن بنایا جسے لوگوں نے پسند کیا، لیکن حکومت کی سختیوں کے سبب اس صنف کو فارسی زبان میں وہ جگہ نہ مل سکی جو اردو میں نصیب ہوئی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کی دکنی سلطنتوں میں احمد شریف گجراتی، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، عبداللہ قطب شاہ، قطبی، عابد، فائز محب، لطیف، شاہی اور شمالی ہند میں قائم دہلوی، شاہ حاتم، میر محمد، قائم، آبرو، سعادت، یک رنگ اور عاصی وغیرہ نے اس صنف میں کھل کر طبع آزمائی کی اور عوام میں اسے مقبولیت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں دہلی میں کربلائی مرثیہ گوؤں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ مسکین، سکندر، سودا، میر گھاسی، رند، ندیم، مصحفی، جرأت اور اشرف وغیرہ کا نام اس عہد کے مرثیہ نگاروں میں قابل ذکر ہے۔

میر تقی میر اور سودا کے زمانے تک دہلی میں مرثیہ گوئی کا عام رواج رہا لیکن دہلی کی آب وہوا میں وہ ترقی نہ مل سکی جو لکھنوی آب وہوا میں حاصل ہوئی۔ ضمیر، دلگیر، خلیق، افسردہ، ناظم، گدا، عشق، آتش، مونس، دبیر اور انیس نے اپنی فنی چابکدستی سے اس صنف سخن کو مقبول ترین بنا دیا۔ کربلائی مراثی کی اسی ترقی نے مرثیہ کے مجازی معنی کو حقیقی معنی کا لبادہ پہنایا ہے۔

زیر نظر کتاب 'انیس کے مرثیے' میر ببر علی انیس کے مراثی پر مبنی تالیف ہے۔ جسے صالحہ عابد حسین نے دو جلدوں میں ترتیب دیا ہے۔ اسے پہلی بار 1980 عیسوی میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ اس کی تیسری اشاعت ہے۔ پہلی جلد کل 504 صفحات پر مشتمل ہے جس میں یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر، جس دن یزید شام میں مسند نشیں ہوا، فرزند پیمبر کا مدینہ سے سفر ہے، سبط نبی سے منزل مقصد قریب ہے، جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا، بخدا فارس میدان تہور تھا حر، طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح، کیا فوج حسینی کے جوانان حسیں تھے، جب حر کو ملا خلعت پرخون شہادت، جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی، جب حضرت زینب کے پسر مر گئے دونوں، پھولا شفق سے چرخ پر جب لالہ زار صبح، آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی، جاتا ہے شیر بیشہ حیدر فرات پر، جب آب رواں بند ہوا فوج خدا پر، جب بادبان کشتی شاہ امم گرا، دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر اور کیا غازیان فوج خدا نام کر گئے شامل ہیں۔

دوسری جلد کل 612 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 27 مراثی دشت وغا میں نور خدا کا ظہور ہے، کیا بحر ہے وہ بحر کنارہ نہیں جس کا، جب رن میں سربلند علی کا علم ہوا، حضرت سے جب برادر خوش خو جدا ہوا، دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ، جب رن میں حسین، اصغر بے شیر کو لائے، ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں، شمشاد بوستان رسالت حسین ہے، جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا، جب خیمے میں رخصت کو شہ بحر و بر آئے، نکلی جو

رن میں تیغ حسینی غلاف سے، جب تیغ یداللہ کھنچی دست وغا میں، جب آخری رخصت کو حسین آئے حرم میں، اب شمع قلم روشنی طور دکھادے، جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے، آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے، جب کہ خاموش ہوئی شمع امامت رن میں، جب غرق بحر خوں ہوئی کشتی نجات کی، اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر، آمد آمد حرم شاہ کی دربار میں ہے، جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی، جب طوق وسلاسل میں مسلسل ہوئے عابد، دربار میں زنداں سے طلب ہوتے ہیں قیدی، دن گزرے بہت قید میں جب اہل حرم کو، نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری اور جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا کو شامل کیا گیا ہے۔

انیس کے ان مراثی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ صرف ماتم ونوحے کا بیانیہ نہیں ہے بلکہ کربلائی واقعے کے پس منظر میں ظلم وتشدد کے خلاف آخری سانس تک مقابلہ کرنے اور ظالم کے سامنے ہار نہ ماننے کا ایک استعارہ بھی ہے۔ مراثی کو پڑھتے ہوئے واقعۂ کربلا ہمارے لاشعور میں گردش کرتا ہے۔ لیکن اس میں موجود کرداروں کے ظلم، ظالموں کے خلاف نبردآزما بچوں اور عورتوں کی بہادری پر غور کریں تو اس میں ایک دنیا اور زندگی کے معمے کا حل موجود ہے۔

واقعہ کربلا اور اہل بیت سے محبت وانسیت کے علاوہ اس کے ادبی اور فنی پہلو پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انیس لفظوں کے شعبدہ باز ہیں جہاں جس طرح چاہتے ہیں وہاں وہ ایسی منظر کشی کرتے ہیں گویا اس کا مقام ہی وہی تھا۔ لفظوں کی ترتیب سے نکلتے ہوئے سورج اور ڈھلتی ہوئی شام کو محض ایک مصرعے میں باندھنے پر اس طرح قادر نظر آتے ہیں گویا ان سے بہتر کوئی اور ترتیب نہیں ہوسکتی تھی۔ قاری کے ذہن میں سورج کا ابھرتا ہوا منظر اور چند مصرعے بعد ہی اس کے غروب کی کیفیت ذہن میں اسی طرح کروٹ لیتی ہے جس طرح انیس دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ نازک سے نازک تر اور مشکل سے مشکل ترین واقعات کی منظر کشی ایک ماہر نقاش کی طرح کرنے پر قادر ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس کے مرثیوں کا رنگ وروغن عام ہے لیکن منظر کشی کا طریقہ نہایت خاص بلکہ ان کا ذاتی ہے۔ ان کا شعری بیانیہ سامع کو کب اور کس طرح سامع کو اپنے رنگ میں رنگتا ہے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جزئیات نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر کشی کا یہی امتیازی پہلو انیس کے مراثی کی شناخت ہے۔ انیس صنائع وبدائع کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور بیان کی نزاکت قاری وسامع کے لیے ایک چٹخارہ ہے۔

کتاب کے شروع میں صالحہ عابد حسین کا 56 صفحات پر محیط دیباچہ 'مراثی کا پس منظر — کربلا کا المیہ، میر انیس اور کلام انیس کی چند خصوصیات' کے ذیلی عنوان کے تحت مرثیہ، کربلائی مرثیہ اور انیس کی مرثیہ نگاری کی تفہیم کے ضمن میں ایک شفاف آئینہ ہے جس سے انیس فہمی کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ دونوں جلدوں کے آخر میں فرہنگ اور متعدد نسخوں میں اختلافات کی توضیح سے اصل متن تک رسائی اور اس کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔ فرہنگ میں درج الفاظ ومعانی سے اصل مفہوم تک رسائی میں مدد ملتی ہے۔ امید ہے کہ کتاب قارئین میں پسند کی جائے گی۔

تاریخ طب یونانی (جلد اول)

ادارہ

صفحات : 448، قیمت: 220 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: عبدالرحمٰن شافی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو زبان اور یونانی طب کے رشتے کی تاریخ تقریباً پونے دو صدی پر محیط ہے۔ اس رشتے کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اردو زبان میں یونانی طب کی درسیات کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ یونانی طب کی علمی وفنی تاریخ درسیات کا ایک اہم عنوان ہے۔ یہ یونانی طب کا ایک اساسی موضوع ہے، اس سے واقفیت کے بغیر فنی تخصصات سے کماحقہ آگہی حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ تاریخ طب سے اس وقت عالمی سطح پر بڑی دلچسپی لی جارہی ہے اور دنیا کے تقریباً ہر ملک میں تلاش وتحقیق اور بنیادی ماخذ کی روشنی میں اس کا مطالعہ کیا جارہا ہے۔ گزشتہ صدی تک تاریخ کا مفہوم صرف مشاہیر کی سوانح عمری اور ان کے حالات جاننے سے تھا۔ یہ تاریخ کا بڑا نقص اور غیر علمی انداز تھا۔ کسی بھی علم وفن کی تاریخ میں دراصل اس کی عہد بہ عہد رفتار ترقی کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ یہ بات سامنے آنی چاہیے کہ مختلف ادوار میں اس میں کیا کام انجام پایا اور محققین نے اس کے نظریات کو آگے بڑھانے اور انھیں فروغ دینے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح مطالعے سے نہ صرف ماضی کے کام کا جائزہ سامنے آتا ہے، بلکہ اس سے آئندہ رہنمائی میں مدد ملتی ہے۔ کسی فن کی تاریخ پر کام کرنے کا یہی اصل اور علمی انداز ہے۔ پہلے تاریخ طب کے عنوان کے تحت 'تاریخ فلاسفہ' اور 'تاریخ حکما' قسم کی کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ وہ متعلقہ علوم کے ماہرین کے سوانحی حالات پر مشتمل ہوتی تھیں اور ان میں اس فن کی تاریخ پر زیادہ تفصیلات نہیں ملتی تھیں۔ یورپ میں ادھر تاریخی علوم پر کافی کام ہوا ہے۔ مغربی زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی میں متعدد اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اردو میں 'تاریخ علم تشریح' کے علاوہ عمومی حیثیت سے تاریخ طب یا اس سے متعلقہ موضوعات پر کوئی اعلی پایے کا کام سامنے نہیں آیا ہے۔

کسی بھی علم کی تاریخ کا مطالعہ اس علم کی عہد بہ عہد ترقی، نئے نظریات کی شمولیت، سائنسی نہج اور اس کے ارتقا کا ایسا منظر نامہ پیش کرتا ہے، جس سے ہر سطح پر رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ وہ محض ماضی کی داستان نہیں سناتا، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ اور مستقبل کا لائحۂ عمل طے پاتا ہے اور گزشتہ صدیوں میں پیش آمدہ طبی واقعات کے اظہار اور اس کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ نیز اس وسیع المشربی، انسان دوستی اور فلاح وبہبود کا نشان ملتا ہے، جو ہمارے لیے تحریک وترغیب کے ساز وسامان فراہم کرتا ہے۔ تاریخ طب کا مطالعہ اتنا ہمہ گیر اور اتنا وسیع ہے کہ اسے ایک جلد یا چند جلدوں میں اسے نہیں سمیٹا جاسکتا۔

تاریخ طب کی اس قدر موضوعاتی اہمیت کے باوجود محض درسی لوازموں کی کمی کے باعث اس مضمون کی تعلیم رسمی طور پر ہورہی ہے۔ مگر قومی اردو کونسل نے جس طرز پر طب کی تاریخ کو مرتب کرنے کا خاکہ وضع کیا ہے، وہ نہایت جامع ہے۔ اس میں طب کے آغاز سے لے کر، عہد حاضر تک کی تاریخ مرتب کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس منصوبے کے روبہ عمل آجانے کے بعد اب اس مضمون کی تدریس میں حائل رکاوٹیں دور ہوں گی اور اس جامع کتاب کی دستیابی کے بعد اس کی تعلیم کے روایتی انداز میں سنجیدہ بدلاؤ آئے گا اور تاریخ طب کی تعلیم ایک نئی جہت سے روشناس ہوگی، اس طرح یونانی طب کی جدید نسل اپنے فن کے قدیم مابہ الامتیاز تشخصات سے واقف ہوسکے گی۔

تاریخ طب کا پیش نظر مجموعہ پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن، حکیم فخر عالم، پروفیسر حکیم اشہر قدیر، حکیم سید محمد حسان نگرامی، حکیم عبدالباری، حکیم رضی الاسلام ندوی، حکیم احمد سعید، حکیم معراج الحق، اور دیگر بڑے حکما کے مقالوں پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا کتاب کو نو ابواب میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے:

1 قدیم طبی تہذیبیں (مصر، عراق قدیم، اسرائل، ایران، ہندستان)
2 طب عہد ماقبل بقراط (بقراط تا جالینوس)
3 طب چھٹی صدی عیسوی سے آٹھویں صدی عیسوی تک

4 طب یونانی نویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک (دور تراجم)
5 طب یونانی نویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی تک (طبع زاد تصانیف)
6 طب یونانی تیرہویں تا پندرہویں صدی عیسوی
7 طب اندلس میں
8 یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد
9 طب آزاد ہندستان میں

زیر نظر کتاب 'تاریخ طب یونانی حصہ اول' میں طب کے آغاز سے لے کر، عہد حاضر تک کی تاریخ موجود ہے۔ قدیم زمانے میں مرض کو گناہ کی علامت اور سزا کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ طاعون اور جذام جیسے امراض میں مبتلا شخص کو چھونے کی ممانعت ہوتی تھی یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مریض کو کسی گناہ کی سزا دی جارہی ہے اور اسے چھونے سے ہم بھی گناہ گار ہو جائیں گے۔ جو دوائیں استعمال کی جاتی تھیں ان میں شراب، شہد، انجیر، پیاز، لہسن، لوبان اور سیسہ خاص طور قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب میں قدیم طبی تاریخ اور تہذیبیں (مصر، عراق، اسرائل، ایران، ہندستان) اور طب کے تمام ضروری ادوار موجود ہیں جس سے تاریخ طب کی تعلیم ایک نئی جہت سے روشناس ہوگی۔ خاص طور پر طب یونانی یا آیورویدمیں 'شریر یعنی 'بدن' کے عنوان سے منافع اعضا اور علم تشریح کی ایک ساتھ بحث کی گئی ہے، نیز ہندی طب میں علاج کے طریقوں سے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہے۔ علم طب سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ اور طلبا کے لیے یہ بہت اہم کتاب ہے۔ امید ہے کہ طبی حلقے میں یہ کتاب پذیرائی حاصل کرے گی اور طلبہ و اساتذہ کے درمیان مقبولیت پائے گی۔ طبی درسیات کے اس منصوبے کے تحت منافع الاعضا، تشریح اور حفظان صحت کی کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔ توقع ہے کہ جلد ہی اس منصوبے کی باقی کتابیں بھی منصۂ شہود پر آجائیں گی اور ان کے ذریعے اردو میں علم طب کو مزید فروغ ملے گا۔

اصول طب

مصنف: سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی
صفحات: 508 قیمت: 160 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عبدالباری قاسمی، C-145/1 گراؤنڈ فلور، طیب لین شاہین باغ، نئی دہلی

علم طب میں کسی بھی جاندار کے صحت و مرض سے متعلق بحث کی جاتی ہے، اگر کوئی صحت مند اور تندرست ہے تو اس کی حفاظت ضروری ہے اور اگر کسی کو کوئی بیماری لاحق ہے تو اسے بھی دور کر کے صحت مند اور تندرست بنانا لازم ہے۔ اصول طب سے مراد طب کے عام بنیادی اصول ہوتے ہیں انھیں طب کی اصطلاح میں 'کلیات طب' کہا جاتا ہے۔

کلیات طب یا اصول طب کو طب میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اسے جانے اور سمجھے بغیر نہ معالج علاج کر سکتا ہے اور نہ ہی طب کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بوعلی حسین بن عبداللہ سینا کی مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب 'القانون فی الطب' اسی موضوع پر ہے۔ ابتدا میں عربی میں القانون فی الطب کے متعدد شروحات لکھے گئے اس کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھتے ہوئے فارسی اور پھر اردو میں منتقل ہوا۔ علم طب کی اہم کتابوں میں اصول طب (کلیات طب) کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: کلیات امور طبیعیہ، کلیات اسباب و امراض و اغراض، کلیات نبض بول و براز، کلیات ادویہ اور کلیات علاج یا اصول علاج۔

جہاں بھی طب کی تعلیم ہوتی ہے اسے باضابطہ پڑھایا جاتا ہے اس موضوع پر متعدد حکما اور ماہرین کی تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں اسی کی ایک کڑی حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی کی کتاب 'اصول طب' ہے۔

پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی کا شمار ماہر اور باکمال حکما میں ہوتا ہے، طب کے تقریبا تمام ہی موضوعات پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں، طبی جغرافیہ، فہرست قرابادین معدن تجربات، اشراح، تشریح ہمدانی، تشریح عرفانی، تشریح الاحشاء، تذکرہ اطبائے اودھ وغیرہ ناموں سے اہم کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'اصول طب' چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب کلیات امور طبیہ کے نام سے ہے، اس باب میں کلیات امور طبیہ، علم طب، امور طبیعیہ، طبیعت، مزاج، اخلاط، اعضا، اعضاء مفردہ، مرکبہ، ارواح قوی اور حواس وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس کے علاوہ ہر موضوع کو سمجھانے کے لیے شجرہ اور نقشہ کا بھی سہارا لیا گیا ہے اس سے طب کے طلبا اور اساتذہ موضوع کو بہ سہولت سمجھ سکتے ہیں۔

دوسرا باب 'کلیات امراض و اسباب و اغراض' ہے۔ اس باب میں احوال بدن، اسباب مرض اور اعراض و امراض کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہیت امراض کو سمجھنے کے لیے یہ باب بہت اہم ہے۔ مصنف نے جغرافیائی نظریات پر بھی سہل انداز سے روشنی ڈالی ہے اسی گتھی کو سلجھا لینے کے بعد ماہیت امراض کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ تیسرا باب 'کلیات نبض و بول و براز' ہے۔ اس باب میں ماہیت نبض، وزن، احوال امراض اور ان کی نبضیں، ماہیت بول، احوال و امراض، بدن اور ان کے ابوال اور ماہیت براز کو بیان کیا گیا ہے۔ تشخیص مرض طبیب کے لیے سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے تشخیص کو سمجھنے کے لیے یہ باب بہت اہم ہے اس میں نبض و بول و براز کے اصول کو سہل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

چوتھا باب 'کلیات ادویہ' ہے۔ اس کے شروع میں مفردات اور مرکبات ادویہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کے بعد دوا کی تعریف، درجات ادویہ، دوا کی شناخت، قیاس و تجزیہ، تاثیرات ادویہ بلحاظ اعضا، ادویہ کی تاثیرات اعضائے نفسانیہ پر، ادویہ کی تاثیر بدنی تغیرات و استحالات، اشکال ادویہ، مسالک ادویہ، نقل الدم، ادویہ کا حصول، ادویہ کا تحفظ، اعمار ادویہ، ابدال ادویہ، مضر و مصلح، متناقض ادویہ اور تناقض اور ادویہ کی ترتیب و آمیزش وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

پانچواں باب 'کلیات علاج یا اصول علاج' ہے۔ اس میں علاج کے طریقے کو بیان کیا گیا ہے۔ علاج کے بنیادی طور پر تین طریقے ہوتے ہیں: علاج بالتدبیر و بالتغذیہ، علاج بالادویہ اور علاج بالید۔ حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی نے تمام طریقوں کی قسموں، احکامات اور طریقہ کار کو آسان زبان میں بیان کیا ہے۔

اس کتاب کا آخری اور چھٹا باب ہے 'اصول نسخہ نویسی' اس باب میں امراض اعضائے نفسانیہ، امراض چشم، امراض بینی، امراض اعضائے حیوانیہ اور امراض اعضائے طبعیہ وغیرہ عنوانات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ تشخیص مرض کے بعد سب سے اہم مرحلہ نسخہ نویسی ہی کا ہوتا ہے۔ مصنف نے بیماری کے اعتبار سے علاحدہ علاحدہ نسخہ نویسی کے اصول بتائے ہیں کس مرض میں کس طرح کے ادویہ کا استعمال کرانا چاہیے اور کن کن چیزوں سے پرہیز کرانا چاہیے۔

سید کمال الدین حسین ہمدانی نے بہت آسان انداز میں اس کتاب میں اصول طب کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اردو میڈیم طلبا اور اساتذہ کے لیے اصول طب کو سمجھنے کے لیے بہت ہی کارآمد اور مفید کتاب ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اسے شائع کر کے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ امید ہے کہ طب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات استفادہ کریں گے۔

تحقیق و تنقید

امیر خسرو شخصیت، فکر و فن اور تصوف

مصنف: ذاکر حسین ذاکر

صفحات: 404، قیمت: 599 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: کاویہ پبلی کیشنز، بھوپال

مبصر: حقانی القاسمی، نئی دہلی

طوطیِ ہند امیر خسرو پر مختلف زاویوں سے تحقیقی اور تنقیدی مطالعات منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کی شخصیت کے تنوعات پر تحقیق کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ذاکر حسین ذاکر کی کتاب 'امیر خسرو شخصیت، فکر وفن اور تصوف' اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور امیر خسرو کے مختلف زاویوں کی تلاش اور جستجو سے عبارت ہے۔ انھوں نے بنیادی کام یہ کیا ہے کہ امیر خسرو کے مکمل ہندوی کلام کو اس کتاب میں شامل کیا ہے اور اسے 'جواہر خسروی' کی اگلی کڑی قرار دیا ہے جو 1918 میں شائع ہوئی تھی، اس کے مرتبین مولانا امین عباسی چریاکوٹی اور مولانا رشید احمد سالم تھے۔ 'جواہر خسروی' کی اشاعت کے بعد امیر خسرو کے ہندوی کلام پر تحقیق ہوتی رہی۔ اردو کے علاوہ ہندی حلقے میں بھی امیر خسرو کے ہندوی کلام کے تعلق سے دلچسپی پیدا ہوئی تو ناگری پرچارنی پتریکا کے سکریٹری بابو برج رتن داس کاشی والے نے امیر خسرو کی ہندوی کویتا پر ایک مقدمہ لکھا اور جواہر خسروی کے ہندوی کلام کو اس میں شامل کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری نے اپنی کتاب 'امیر خسرو اور ان کا ہندی ساہتیہ' کے عنوان سے ہندوی کلام کا انتخاب پیش کیا۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ (امیر خسرو اور ان کا ہندوی کلام)، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری) اور صفدر آہ (امیر خسرو کی ہندی شاعری) کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کو الحاقی بھی قرار دیا گیا، لیکن ذاکر حسین نے اس کا دفاع کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ امیر خسرو کی زبان ہندوی تھی جس کی تفصیل انھوں نے مثنوی 'نہ سپہر' میں بھی بیان کی ہے۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ:

چو من طوطیِ ہندم ار راست پرسی　　زمن ہندوی پرس تا نغز گویم

''سچ پوچھو تو میں طوطیِ ہند ہوں۔ مجھ سے ہندوی میں بات کرو تو میں تمھاری بات کا بہترین جواب دوں گا۔''

ذاکر حسین ذاکر نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو کے ہندوی کلام کو حقیر سمجھا گیا جس کی وجہ سے ہندوی معدوم ہوتی گئی۔ انھوں نے اس پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ خسرو نے اپنی ہندوی شاعری میں 'چشم' کی جگہ 'نین'، 'شب' کی جگہ 'رین' اور 'محبوب' کو 'ساجن' لکھا ہے اور یہی بات لسانی طہارت پسندوں کو ناگوار گزری ہے۔

انھوں نے امیر خسرو کی ہندوی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اس تعلق سے اسپرنگر، گارسین دتاسی، گل کرسٹ جیسے مستشرقین کا بھی حوالہ دیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ خسرو ہندوی زبان سے مکمل طور پر واقف تھے اور ان کی ہندوی شاعری بہت اہمیت کی حامل ہے کہ یہ عوامی زبان میں تھی، اس پر بھی انھوں نے گفتگو کی ہے کہ خسرو کی ہندوی شاعری اصل ہے یا نہیں؟ اور اس حوالے سے ہندوی اور فارسی کی لفظیات پر بھی مکمل بحث ہے۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے تعلق سے بہت سے تحفظات اور تعصبات بھی رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے انتظار حسین کا حوالہ بھی دیا ہے کہ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ جو ہندوی رائج تھی اسے اردو سے خارج کرنے کی کوششیں ہوئیں اور بقول انتظار حسین ''اردو سے رات غائب ہونے لگی اور اس کی جگہ خالص شب تار نے لے لی۔''

ذاکر حسین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی تعصب کا اثر رہا کہ اردو شاعری سے چھوبی بی غائب ہونے لگیں اور اس کی جگہ رند اور ناصح آگئے۔ یہ وہی چھوبائی ہیں جس کے بارے میں امیر خسرو نے لکھا تھا:

اوروں کی چوپہری باجے چھو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جس میں ناہیں توسل
اوروں کے جہاں سینک سماوے چھو کے واں موسل

ادب سے چھوبائی کی گمشدگی بہت بڑا المیہ ہے کہ یہ عوامی جذبہ و احساس کی زبان ہندوی سے جڑی ہوئی تھیں اور اس ہندوی کے خاتمے سے زبان کی خوبصورتی کے علاوہ اردو زبان پر بھی منفی اثر پڑا جسے شاید اردو والے اچھی طرح محسوس نہیں کر پائے۔

ذاکر حسین ذاکر نے اپنی اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت امیر خسرو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ امیر خسرو ایک نابغہ تھے اور ان کی شاعری میں جہاں ایرانی تہذیب وتمدن ہے وہیں ہندوستانی تہذیب و معاشرت بھی۔

ذاکر حسین ذاکر نے امیر خسرو کا شاہکار خالق باری پر روشنی ڈالی ہے اور اس کتاب کے تعلق سے مختلف محققین کے خیالات پر بھی گفتگو کی ہے۔ دراصل یہ خالق باری ایک منظوم لغت ہے جس میں عربی، فارسی ترکی اور ہندوی کے الفاظ ہیں۔ مگر اس کتاب کے بارے میں بھی محققین کی الگ الگ رائیں ہیں۔ انھوں نے اس ذیل میں بہت سے قدیم لغات (فرہنگ قواس، صحاح الفرس، دستور الافاضل، زفان گویا، بحر الفضائل، شرف نامہ منیری، مطبوع الصبیان، واحد باری، مثل خالق باری) کا بھی ذکر کیا ہے۔ 'خالق باری' امیر خسرو کی تصنیف ہے یا نہیں اس پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔

'امیر خسرو اور تصوف کی تفہیم' کے عنوان سے ذاکر حسین نے بہت تفصیلی گفتگو کی ہے۔ تصوف کی تعریف، تفہیم اور اس سلسلے سے جڑے ہوئے بہت سے صوفیائے کرام کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''خسرو نہ تو پوری طرح درباری شاعر تھے اور نہ صوفی شاعر۔ ان کی شاعری بطور خاص ہندوی شاعری عوام کی میراث ہے۔'' ذاکر حسین نے 'امیر خسرو کے نگہدار ممدوح سلطان، وزیر اور صوبے دار' پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے ملک علاؤالدین محمد کشلی خاں عرف ملک چھجو، ناصرالدین الدین بغرا خاں، سلطان محمد، امیر علی سرجاندار عرف حاتم خاں، معزالدین کیقباد، جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، ناصرالدین محمد عرف خسرو خاں، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق وغیرہ کا ذکر کیا ہے جن کے دربار سے خسرو کی وابستگی رہی ہے۔

موسیقی کے فروغ میں بھی امیر خسرو کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ ذاکر حسین نے اس تعلق سے بھی گفتگو کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ امیر خسرو نے بہت سے راگ تخلیق کیے جن میں راگ مجیر، راگ سازگیری، راگ ایمن کلیان، راگ عشاق، راگ موافق، راگ غنم، راگ زیلف-ترانہ، راگ زیلف-خیال، راگ سرپردہ-خیال، راگ باغرو-خیال، راگ زنگولہ-خیال، راگ زنگولہ-دھرپد قابل ذکر ہیں۔ ذاکر حسین نے 'امیر خسرو کا سپاہیانہ جوہر' کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو امیر خسرو کی شخصیت سے جڑے ہوئے بیشتر زاویوں پر انھوں نے مفصل اور مبسوط روشنی ڈالی ہے۔

ذاکر حسین نے 'عشق ہندوستان' کے نام سے وہ کلام شامل کیا ہے جس میں امیر خسرو

نے ہندوستان سے اپنی محبت اور شیفتگی کا والہانہ ذکر کیا ہے اور اپنے وطن عزیز ہندوستان پر فخر کا اظہار بھی کیا ہے۔ امیر خسرو کہتے ہیں۔

آنست یکے کیں زمیں از دور زمن　　　　ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن
دیں ز رسول آمدہ کاے زمرۂ دیں　　　　حب الوطن ہست ز ایماں بہ یقین

''یہ ملک زمانہ قدیم سے دنیا میں موجود ہے۔ میں اس سے اس لیے محبت کرتا ہوں کہ یہ میری پیدائش کی جگہ ہے اور میرا گھر ہے، اور میرا مادر وطن ہے۔ رسول اللہ کا کہنا ہے کہ مادر وطن سے محبت سچے دین کی نشانی ہے یعنی 'حب الوطن من الایمان'۔ اس لیے یہ ان کے دین کا ایک بنیادی مادہ ہے۔''

اسی طرح ایک جگہ انھوں نے مریادہ پرشوتم رام کا بھی ذکر کیا ہے۔

شوخی ہندو بہ بیں کودیں ببرداز خاص وعام　　　　رام من ہرگز نہ شد ہر چند گفتم 'رام رام'

''ہر انسان یہ جان لے کہ ہندوستان میں رام ایک شاندار اور عظیم انسان ہیں۔ رام تو میرے دل میں بسے ہیں۔ وہ مجھ سے ہرگز الگ نہیں ہوں گے۔ میں جب بھی بولوں گا تو رام ہی بولوں گا۔''

ایک جگہ اور کہتے ہیں۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند　　　　آرے آرے می کنم بہ خلق ودنیا کار نیست

''دنیا کہتی ہے کہ خسرو بت پرستی کرتا ہے۔ ہاں ہاں میں بت پرست ہوں میرا دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

ذاکر حسین نے امیر خسرو کی ہندوی غزلیں، دوہے، نظمیں و گیت، قوالی، ڈھکوسلہ، پہیلیاں اور دیگر کلام کو اس میں شامل کیا ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی ہے۔ لفظیات خسرو کی فرہنگ کے علاوہ شخصیات اور مقامات کے اشاریے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ذاکر حسین ذاکر نے جامع الصفات امیر خسرو کے حوالے سے جو اہم نکات اور اشارات درج کیے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے امیر خسرو کے تعلق سے کچھ اور نئی طرفیں کھلیں گی اور تحقیق کے نئے باب وا ہوں گے۔

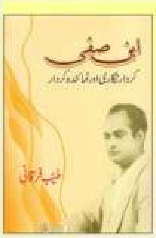

ابن صفی :کردار نگاری اور نمائندہ کردار

مصنف/ ناشر: طیب فرقانی

صفحات: 496، قیمت: 372، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: محمد منظر حسین، G-339/2، تیسری منزل

مہر منزل روڈ گارڈن ریچ، کولکاتا 700024 (مغربی بنگال)

ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد ہے لیکن اردو ادب میں وہ اپنے قلمی نام سے اس قدر مشہور ہوئے کہ ان کا اصل نام ہی پردۂ خفا میں چلا گیا۔ ابن صفی اردو زبان کے ایک ایسے ناول نگار ہیں جو سب سے زیادہ پڑھے جانے کے باوجود ہمیشہ معتوب رہے۔ ناقدین ادب نے کبھی بھی انہیں منہ لگانا پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود انھیں اردو ناول میں وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن ایک معتبر تخلیق کار کو زیادہ دنوں تک گمنامی کے پردے میں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ انھیں اعتبار حاصل ہو رہا ہے۔ ابن صفی کے فن پر مختلف موضوعات پر کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ طیب فرقانی کی کتاب 'ابن صفی: کردار نگاری اور نمائندہ کردار' ابن صفی فہمی میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہوگی۔

زیر نظر کتاب 'ابن صفی: کردار نگاری اور نمائندہ کردار' دراصل طیب فرقانی کے ایم فل امتحانیہ کا مقالہ ہے جسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

طیب فرقانی مغربی بنگال کے ضلع اتر دیناج پور کے ایک اسکول میں تقریباً دس برسوں سے درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتاب کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'ابن صفی: شخصیت و سوانح' ہے۔ اس باب میں ابن صفی کی پیدائش سے لے کر موت تک کی تمام تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں صاحب کتاب نے کردار اور کردار نگاری کے تعلق سے بہت ہی اہم معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کے درمیان فرق کو بھی مثالوں کے ساتھ واضح کیا۔ اس طرح کردار اور کردار نگاری کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

کتاب کا تیسرا باب بعنوان 'ابن صفی: کردار نگاری اور نمائندہ کردار' ہے۔ یہ باب کتاب کا سب سے اہم باب ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ 'ابن صفی کی کردار نگاری' ہے۔ اس حصے میں ابن صفی کی کردار نگاری کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ ابن صفی اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنے کرداروں کا اس طرح سے مرقع کھینچتے ہیں کہ اس کی تصویر ابھر کر قارئین کے سامنے آ جاتی ہے۔ کردار کے حرکات و سکنات سے قارئین پر واضح ہونے لگتا ہے کہ اب کون کردار آنے والا ہے۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ابن صفی کے کردار لافانی ہو گئے ہیں۔ اس باب کے دوسرے حصے کو 'ابن صفی کے نمائندہ کردار' کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں ابن صفی کے ناولوں میں پیش کیے گئے نمائندہ کرداروں کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا گیا۔ ان کرداروں کی اہم خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریوں کو بھی احاطہ تحریر میں لا گیا ہے۔ ان میں انھی کرداروں کو پیش کیا گیا جو نسوانی کرداروں کے علاوہ ہیں جیسے احمد کمال فریدی، ساجد حمید، علی عمران، سارجنٹ ناشاد، تنویر اشرف، صفدر سعید، بلیک زیرو، جوزف مگونڈا، انور سعید، قاسم رضا وغیرہ۔ اس میں کل اٹھارہ کرداروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب کا چوتھا اور آخری باب 'ابن صفی کے نمائندہ نسوانی کردار' ہے جو ضخامت کے اعتبار سے سب سے بڑا باب ہے۔ اس میں کل 47، نسوانی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں لیڈی بہرام، لیڈی پرکاش، پرنسز تارا، مادام تاریہ، لیڈی تنویر، تھریسا بمل بی آف بوہیمیا، جولیانا فٹنر واٹر، لیڈی جہانگیر، رانی آف ساجد نگر وغیرہ اہم نام ہیں۔

مجموعی میں طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب اور خاص طور پر اردو فکشن میں اس کتاب کی اہمیت اضافے کی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں ابن صفی کے ناولوں اور ان کرداروں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ایک ایسا ناول نگار جسے ناقدین ادب مختلف نام دے کر ادبی حیثیت سے انکار کرتے رہے ہیں۔ اب یقیناً اس انکار میں بہت حد تک کمی آ جائے گی اور اس کتاب کے ذریعہ ابن صفی کی تحقیق میں ایک نیا در کھلے گا۔ چونکہ کتاب مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے اس لیے ضخامت کے اعتبار سے اس کی قیمت بھی بہت کم ہے۔ نفیس کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے اور طباعت بھی شاندار ہے۔ اس لیے ابن صفی کے شائقین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مضامین

نقوش آگہی

مصنف: وارث ریاضی

صفحات: 332، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شہلا پروین، ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی

زیر تبصرہ کتاب 'نقوش آگہی' وارث ریاضی کی کتاب ہے۔ اس سے پہلے مصنف

کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان کی پہلی کتاب 'حرف آرزو' 2012 میں منظر عام پر آئی اور دوسری کتاب 'نقوش افکار' کی اشاعت 2016 میں ہوئی۔ 'نقوش آگہی' ان کے مقالات ومکتوبات کا مجموعہ ہے۔ کتاب کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔حصہ اول میں ان کے علمی و ادبی مقالات ہیں۔ہر مقالہ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے منفرد ہے۔حصہ اول کا پہلا مقالہ 'حضرت جگر مرادآبادی کی شاگردی کا مسئلہ حقیقت کے آئینے میں' کے عنوان سے درج ہے۔یہ مقالہ دراصل تحقیقی نوعیت کا ہے جس میں مختلف ادیبوں کی تحریروں سے واضح کیا گیا ہے کہ جگر صاحب سیماب اکبرآبادی کے شاگرد نہیں تھے۔ مقالہ نگار نے ان واقعات کا بھی اظہار کیا کہ یہ دونوں شاعر ایک دوسرے کے کلام کو دیکھتے تھے اور تبادلہ خیال کیا کرتے تھے مگر یہ سلسلہ طویل نہیں رہا، لیکن سیماب کو اپنے شاگردوں کی فہرست میں اضافہ کرنا فطری طور سے پسند تھا اس لیے جگر جیسے عظیم شاعر کو بھی اپنے شاگردوں کی فہرست میں شامل کرلیا تاہم اردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے کہ سیماب سے بہتر شاعر جگر کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے اور شاگردی کا یہ قصہ بالکل حقیقت کے برعکس ہے۔کتاب میں شامل ایک مقالہ بعنوان 'مولانا سید نظام الدین کی شاعری ایک تجزیاتی مطالعہ' ہے مولانا سید نظام الدین تاحیات آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔مولانا نے جہاں دینی فلاح و بہبود کے لیے متعدد خدمات پیش کیں وہیں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی عوام میں معروف ہوئے ان کی شاعری میں اسلامی موضوعات کی بھرمار ہے۔مقالے میں ان کے نمونہ کلام کو شامل کر کے ان کے شاعرانہ کمالات سے قارئین کو آگاہ کرایا گیا ہے۔مصنف نے اپنی تنقیدی آرا کو پیش کر کے ان کے کلام کی عظمت کے اہم اسرار و رموز کھولے ہیں۔کتاب میں شامل دیگر مقالات کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں: 'بہار کی ایک قدیم دینی درس گاہ' درست گفت محدث کہ قوم از وطن است 'استدراک' وغیرہ۔'بہار کی ایک قدیم دینی درسگاہ' میں جہاں علم حاصل کرنے کی فضیلت کو مختلف قولوں سے بیان کیا گیا وہیں مدارس کے علمی ماحول کی بات بھی کی گئی ہے۔یہ مضمون بچوں کے اندر علمی صلاحیت پیدا کرنے کے حوالے سے بھی اپنی خاص اہمیت و معنویت رکھتا ہے۔ وارث ریاضی اسلام کے حوالے سے عمدہ معلومات رکھتے ہیں، اور ان معلومات کا اظہار اپنے علمی نوعیت مقالوں میں بڑے خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔کتاب میں ایک مضمون 'استدراک' کے عنوان سے شامل ہے۔یہ مضمون ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں آزادی کے وقت جو ہندو مسلم اتحاد رہا اس پر بھی روشنی ڈالی گئی نیز مختلف علما اور سیاسی رہنماؤں کے وہ بیانات درج ہیں جن سے ہندو مسلم اتحاد واتفاق کی ضرورت و اہمیت سامنے آتی ہے۔وارث ریاضی کے مقالوں میں مذہب کی عظمت اور وطن ہندی کے حوالے سے مفصل گفتگو ملتی ہے۔دراصل آپ ایک پختہ شعور رکھتے ہیں اور اپنی بات کو دلیلوں کے ذریعے ثابت کرنے کی عمدہ کوشش کرتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'مکاتیب بنام مشاہیر علم و ادب' کے عنوان سے ہے اس میں مصنف کے افکار، خیالات، مذہبی نظریات، سماجی ترجیحات وغیرہ جیسے شخصی پہلوؤں کو خطوط کے آئینے میں سامنے لایا گیا ہے۔ان خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد مصنف کی ذات وکائنات سے قاری پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔ان خطوط میں ان شخصیات کی چند شخصی خوبیوں کو جامع انداز بیان میں ظاہر کیا گیا ہے جن کے نام یہ لکھے گئے ہیں۔ان خطوط کے مطالعے کے بعد قاری مصنف کے نظریات، خیالات، تجربات، افکار اور ترجیحات سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔

اس طرح مجموعی طور پر زیر تبصرہ کتاب کی بات کی جائے تو یہ مختلف اور متنوع موضوعات رکھتی ہے جو مقالات اور مختلف خطوط کے آئینے میں سامنے آئے ہیں۔ مصنف نے متعدد دینی مسائل کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی موضوعات پر بھی بات کی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری وارث ریاضی کے اسلوب بیان اور طرز ادا سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ان کے یہاں سادہ، سلیس اور شگفتہ انداز بیان کو ہی ترجیح دی گئی ہے۔مشکل وہ دقیق الفاظ کا بہت کم استعمال کرتے ہیں۔اکثر جگہ جامع اسلوب میں ہی اپنی بات کرتے ہیں لیکن بعض جگہ جزئیات کی تفصیل بھی بیان کرتے ہے۔وارث ریاضی جہاں حب وطن پہ بات کرتے ہیں وہیں اتحاد واتفاق اور آپسی بھائی چارہ کی بھی اہمیت ومعنویت سے روشناس کراتے ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ جو 'شحات نقد ونظر' کے نام سے ہے۔اس میں مختلف مبصرین کے تبصرے ہیں جو انھوں نے مصنف کی دوسری کتاب 'نقوش افکار' پر لکھے ہیں۔ان تبصروں کے مطالعے سے جہاں 'نقوش افکار' کی اہمیت ومعنویت سامنے آتی ہے وہیں وارث ریاضی کی ادبی عظمت بھی واضح ہوتی ہے۔مختصراً زیر تبصرہ کتاب 'نقوش آگہی' کئی پہلوؤں سے ادب میں اپنی شناخت اور پہچان رکھتی ہے۔

سوانح/ شخصیات

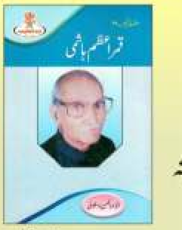

قمر اعظم ہاشمی

مصنف: انوار الحسن وسطوی

صفحات: 134، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

مبصر: قمر اعظم صدیقی

مونوگراف 'قمر اعظم ہاشمی' کے مصنف انوار الحسن وسطوی ہیں۔مصنف نے قمر اعظم ہاشمی جیسی نابغۂ روزگار ادبی شخصیت پر کتاب لکھ کر اردو والوں کو ایک بہت قیمتی تحفہ عنایت کیا ہے۔موصوف نے اس کتاب میں قمر اعظم ہاشمی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو روشناس کرانے کی بہترین کوشش کی ہے، اس کتاب کے مطالعے سے قاری قمر اعظم ہاشمی کی پیدائش سے لے کر وفات تک اور درمیان میں ان کے تعلیمی سفر سے لے کر ان کی ملازمت، اردو تحریک سے وابستگی، ان کی اردو دوستی، ان کی صحافتی زندگی، تعلیمی میدان میں کارکردگی، ان کی تصنیفات وتالیفات ان تمام چیزوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔

انوار الحسن وسطوی نے اس کتاب میں جن موضوعات کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

''قمر اعظم ہاشمی: ایک نظر میں، قمر اعظم ہاشمی: شخصیت اور سوانح، قمر اعظم ہاشمی: بحیثیت استاد، قمر اعظم ہاشمی: بحیثیت تنقید نگار، قمر اعظم ہاشمی: بحیثیت صحافی، قمر اعظم ہاشمی اور اردو تحریک، قمر اعظم ہاشمی کی منتخب کتابیں: ایک مطالعہ، قمر اعظم ہاشمی کی منتخب تحریریں، قمر اعظم ہاشمی ادیبوں اور نقادوں کی نظر میں'' اور اس کتاب کا سب سے آخری حصہ کتابیات ہے۔

ابتدائیہ کو پڑھنے کے بعد اس بات سے بخوبی واقفیت حاصل ہوتی ہے کہ انوار الحسن وسطوی کو قمر اعظم ہاشمی سے بے پناہ محبت تھی اور قمر اعظم ہاشمی بھی آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

قمر اعظم ہاشمی کے تعلق سے جناب وسطوی لکھتے ہیں کہ ''اردو کے ایسے بہت کم استاد رہے ہیں جنھوں نے زبان اور ادب دونوں کے فروغ کے لیے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔پروفیسر قمر اعظم ہاشمی ان ہی چند جیالوں میں ایک تھے۔''

'قمراعظم ہاشمی: شخصیت اور سوانح' اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ کا جسمانی قد وقامت، پیدائش اور خاندانی پس منظر، تعلیمی تفصیلات، ادبی زندگی کی شروعات، صحافت کی داستان، تحریک اردو سے وابستگی، تدریسی خدمات، تنقید نگاری، مہمان نوازی، قناعت پسندی، شان بے نیازی، حق گوئی اور بے باکی، مذہبیت، اعتراف خدمات، انعامات واعزازات، انتقال وتدفین، ذکر قمراعظم ہاشمی بعد از مرگ جیسے تمام گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں آپ کی صحافتی زندگی کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ کو 1963 میں ہی رسالہ 'فکر وفن' کا اڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اور اسی سال تعلیم سے فراغت کے بعد جب دربھنگہ واپس ہوئے تو آپ کو پندرہ روزہ 'قومی تنظیم' کی ادارت کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ (ص 20)

مصنف نے قمراعظم ہاشمی کی قناعت پسندی اور کسب حلال کے تعلق سے ان کے چھوٹے بیٹے اطہر شاہین ہاشمی کے جملے کو یوں نقل کیا ہے:

''جب میں نے دہلی میں نوکری شروع کی 1996 میں تب انھوں نے (قمراعظم ہاشمی) کہا کہ بیٹے تم جو بھی کام کرو اس میں ہنر پیدا کرو۔ حتی کہ اگر گھاس بھی چھیلو تو اس میں بھی ہنر ہو۔ کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا بس حلال ہونا چاہیے۔'' (ص 25)

قمراعظم ہاشمی کتنے مخلص ہر دل عزیز اور شفیق استاد تھے اس بات کا اندازہ 'قمراعظم ہاشمی بحیثیت استاذ' عنوان سے لکھی تحریر کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ مصنف نے ان کے چھوٹے بیٹے اطہر شاہین ہاشمی کی تحریر 'میرے ابی: میرے استاذ' کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک بار ابی ایسے ہی معمول کے مطابق دروازہ کھول کر باہر بیٹھے تھے کہ اچانک زور زور سے رونے لگے۔ عباس چچا (پڑوسی) فوراً آئے کہ کیا ہوا سر؟ ابی نے بتایا کہ بچوں کی یاد آگئی ہے۔ ان کے بچے صرف ہم ہی نہیں تھے بلکہ ان کے سارے شاگرد تھے۔'' (ص 39)

''قمراعظم بحیثیت صحافی' کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے 1965 میں اپنا ایک ہفت روزہ اخبار 'کوہکن' جاری کیا اور اس اخبار کو حکومت کی جانب سے اشتہار کی منظوری بھی مل گئی تھی۔ لیکن 1969 میں پٹنہ چھوڑتے وقت 'کوہکن' کو اپنے ایک دوست شمس الہدی استھانوی (والد گرامی ڈاکٹر انوار الہدی) کے حوالے کر دیا۔ اس تحریر میں آگے اس بات کا بھی ذکر موجود ہے کہ آپ نے نہ صرف قومی تنظیم، سنگم اور 'کوہکن' میں کام کیا بلکہ ہفت روزہ 'پندار' اور 'ندائے عوام' سے بھی وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ ایم شمیم جرنلسٹ مرحوم کی ادارت میں مظفر پور سے نکلنے والے 'آئین نو' کی اشاعت میں بھی ہاشمی صاحب نے اہم رول ادا کیا۔ اس طرح اس زمانے کے تقریباً تمام اہم اردو اخبارات ورسائل میں ہاشمی صاحب کے مضامین اور ان کی نگارشات شائع ہوتی تھیں اور دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ (ص 69)

مصنف نے سہ ماہی 'تمثیل نو' دربھنگہ کے حوالے سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جناب قمراعظم ہاشمی خود ہی لکھتے ہیں کہ 1961 سے انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں میں میں شامل رہا۔ جبکہ اس وقت انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا قوم دشمنی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن باضابطہ انجمن ترقی اردو سے وابستگی 1963 سے ہوئی۔ (ص 73)

ویسے ان کی اردو تحریک کے کاموں کی مکمل داستان 'قمراعظم ہاشمی اور اردو تحریک' کے عنوان سے صفحہ 72 سے صفحہ 90 تک میں درج ہے جسے پڑھ کر ان کی اردو دوستی کا علم ہوتا ہے۔

مصنف نے 'قمراعظم ہاشمی کی منتخب کتابیں: ایک مطالعہ' کے عنوان سے بہت ہی تفصیلی اور جامع تحریر قلمبند کی ہے جو صفحہ 91 سے 105 تک موجود ہے۔ مصنف نے آپ کی کتاب کے حوالے سے کچھ یوں لکھا ہے:

''قمراعظم ہاشمی کی جملہ تصنیفات وتالیفات کی تعداد 18 ہے، ان کتابوں کے علاوہ بہت سارے مضامین رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ جنھیں یکجا کیا جائے تو چند کتابیں اور تیار ہو سکتی ہیں۔ کتابوں کی یہ فہرست تعداد کے اعتبار سے مختصر ضرور ہے لیکن معیار، مواد، موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے گراں قدر ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے قمراعظم ہاشمی کے وسعت مطالعہ اور وسیع النظری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ (ص 91)

'قمراعظم ہاشمی کی منتخب تحریریں' کے باب میں پانچ تحریریں درج کی گئی ہیں جن کے عنوان ہیں: ادب اور شعور، شعر وادب میں طنز وظرافت کے عناصر، سید شاہ مشتاق احمد-ایک شخصی تاثر، سمندر پار اور آخری تحریر۔

صفحہ 124 سے 132 تک 'قمراعظم ہاشمی ادیبوں اور ناقدوں کی نظر میں' کے عنوان سے ہے۔ جن اہم شخصیات کو اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے ان کے اسمائے گرامی ہیں:

پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر نجم الہدی، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر ثوبان فاروقی، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، پروفیسر منظر اعجاز، پروفیسر سید حسن عباس، پروفیسر توقیر عالم، پروفیسر ابوذر کمال الدین، ڈاکٹر طاہر حسین شمشاد، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر اسلم جاوداں، ڈاکٹر ریحان غنی، ڈاکٹر بدر محمدی، ڈاکٹر ابوبکر رضوی اور ڈاکٹر عارف حسن وسطوی۔ ان تمام لوگوں کے تاثرات کسی نہ کسی اخبار یا رسالے سے ماخوذ ہیں جنھیں اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کا سب سے آخری حصہ کتابیات ہے جس میں ان تمام کتابوں کا ذکر موجود ہے، جن سے اس کتاب کی اشاعت میں مدد لی گئی ہے۔

یہ کتاب اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ نے شائع کی ہے۔ کتاب کا سرورق بھی کافی دلکش ہے، جس پر قمراعظم ہاشمی کی ایک تصویر ہے، جبکہ ادارے کی جانب سے بیک کور پر قمراعظم ہاشمی اور مصنف انوار الحسن وسطوی کے حوالے سے چند سطور رقم ہیں۔

انوار الحسن وسطوی کی یہ کتاب قمراعظم ہاشمی کی شخصیت پر ایک معیاری، معلوماتی اور دستاویزی حیثیت کی حامل ہے، جو نئی نسل اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بہترین نمونہ اور رہنما ثابت ہوگی۔ اس کتاب سے دور حاضر کے اردو ادب کے قارئین تو استفادہ کر ہی سکتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب بہت ہی کارآمد ثابت ہوگی۔

ترتیب

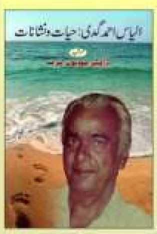

الیاس احمد گدی: حیات و نشانات

مرتب: ڈاکٹر ہمایوں اشرف

صفحات: 944، قیمت: 1200، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: احمد کفیل، سنٹرل یونیورسٹی آف ساؤتھ بہار، گیا

زیر تبصرہ کتاب 'الیاس احمد گدی: حیات ونشانات' اردو کے معروف فکشن نگار الیاس احمد گدی کی شخصیت اور کارناموں پر ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا ایک دستاویزی کام ہے۔ یہ کتاب قومی اردو کونسل، دہلی کے مالی تعاون سے شایع کی گئی ہے۔ مرتب موصوف نے اس کتاب میں الیاس احمد گدی کے ادبی وسوانحی کوائف، انٹرویوز، افسانہ نگاری، ناول نگاری، سفرنامے اور ترجمہ نگاری پر اپنے اور دیگر اہم ناقدین کے علمی ومعلوماتی مضامین اپنے طویل مقدمے کے ساتھ یکجا کیے ہیں۔ اس سے قبل ہندوستانی ادب کے

معمار سیریز کے تحت 'الیاس احمد گدی' (مونوگراف) کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا اختصاص یہ ہے کہ ترتیب وتدوین اور تالیف کے ساتھ تحقیق اور تنقید کا کام بہت محنت اور یکسوئی کے ساتھ کرتے ہیں اسی محنت اور لگن کا ثمرہ ہے کہ اب تک جو کتابیں انھوں نے مرتب کی ہیں ان میں منظر نامہ، (منظر کاظمی کے فن اور شخصیت کا جائزہ)، غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار، رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ، زکی انور: جائزے اور افسانے، نکتہ نکتہ تعارف (وہاب اشرفی کے تبصرے اور تقاریظ)، شناخت اور ادراک معنی (وہاب اشرفی کے تبصرے اور تقاریظ)، کلیات سعادت حسن منٹو (سات ضخیم جلدیں مع مقدمہ)، اردو صحافت: مسائل اور امکانات، وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور، سعادت حسن منٹو: ایک لجنڈ، عبد الصمد: عکس در عکس، کافر بھی ہوئے سجدہ بھی کیا (وہاب اشرفی کے افسانے مع مقدمہ)، در پس آئینہ (شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے خطوط وہاب اشرفی کے نام)، اور حیرت فرخ آبادی: فن اور فنکار سب کی سب موصوف کی فکر و تفہیم کی اساس بن گئی ہیں۔

اردو فکشن کی دنیا میں الیاس احمد گدی محتاج تعارف نہیں اور ان کا فن بقول قمر رئیس فنکار سے دو قدم آگے ہے۔ الیاس احمد گدی کے ناول 'فائر ایریا' کو جو شہرت ملی اور انجام کار 1996 میں اس ناول کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تو مختلف اداروں اور ادبی شخصیات نے اس ناول پر مذاکرے کیے، اس کا اجرا کیا، تنقیدی مضامین لکھے اور اس ناول کے موضوعات، فن اور اسلوب کو اجالا۔ الیاس احمد گدی کو کسی نے فرانسیسی ناول نگار زولا کے مدمقابل رکھا تو کسی نے انگریزی کے معروف ناول نگار نارمن ملر اور ہارڈی ویکس سے بھی آگے کا فنکار قرار دیا۔ ناقدین نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جس طرح 'گودان' اور 'امراؤ جان' نے اردو ناول میں ایک پیٹرن قائم کیا 'فائر ایریا' نے بھی اردو ناول کی پیٹرن سازی میں ہفت خواں طے کیا ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے 'الیاس احمد گدی: حیات ونشانات' میں مشمولات کی جو ترتیب قائم کی ہے اس میں 'استقبال' کے عنوان سے دو صفحات میں پروفیسر علیم اللہ حالی کی رایوں کے بعد ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے خود 'پیش نامہ'، 'الیاس نامہ (سوانحی وادبی کوائف)' اور 'نگار خانہ (تصاویر)' میں اپنی تحقیقی کاوشیں جمع کی ہیں۔ ان میں 'پیش نامہ' دراصل 62 صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں الیاس احمد گدی کے فن اور مشمولہ مضامین پر اپنی تحقیقی وتنقیدی آرا پیش کی ہیں۔ موصوف کی یہ تحریر کتاب کی معنوی وسعتوں کا انکشاف کرتی ہے۔ اس کے بعد 'حیات الیاس' میں 81 صفحہ سے 237 تک بارہ مضامین ومقالات ہیں۔ ان میں پرکاش فکری، ظہیر غازی پوری، محمد منصور عالم، انور پاشا، رونق شہری، راشد انور راشد، نٹ کھٹ عظیم آبادی، محمد ساجد حسین، شاذیہ عمیر، محمد غالب نشتر، حسن نظامی اور احسن امام احسن قابل ذکر ہیں۔ کتاب کے مشمولات کا یہ پہلا باب الیاس احمد گدی کی شخصیت، ان کی کارکردگی، فکر اور تخلیقی سفر کی داستان پیش کرتا ہے۔ دوسرا باب 'گفتار الیاس' (ص 242 سے 270) میں الیاس احمد گدی کے تین انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ اس باب میں بالترتیب راشد انور راشد، شہاب اختر، اور فیروز عالم نے روبرو گفتگو کے ذریعے فنکار کے خیالات ونظریات کو اجالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ تیسرے باب 'فسانۂ الیاس' (صفحہ 280 سے 426) میں الیاس احمد گدی کی اردو افسانہ نگاری میں مقام ومرتبہ طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں وارث علوی، محمد محفوظ الحسن، عبد القیوم ابدالی، ہمایوں اشرف، احمد صغیر، اختر آزاد، رضوانہ پروین، محمد منیر الدین اور مہتاب پیکر اعظمی کے مضامین ہیں۔ مطالعات فکشن کے اس باب میں ناقدین نے الیاس کے افسانوں کا دائرہ طے کیا ہے۔ زندگی کے عام اور معمولی مسائل، زبان واسلوب، ان کی سادگی وسہل پسندی جوان کے افسانوں کو انسانی نفسیات کی معنویت سے قریب تر کرتی ہیں، کا دلچسپ احاطہ کیا ہے۔ اس باب کے مضامین، الیاس کے دونوں افسانوی مجموعوں 'آدمی' اور 'تھکا ہوا دن' کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد افسانے سے پیوستہ مرتب موصوف نے 'الیاس احمد گدی کے بکھرے افسانے' میں ٹام جیفرسن کے پنجرے، آخری حربہ، داشتہ، گھر بہت دور ہے، سناؤں تمھیں بات ایک رات کی، اور شناخت کو شامل کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ وہ قابل ذکر افسانے ہیں جوان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

الیاس احمد گدی کے نشانات میں 'ثبات الیاس' (484-845)، الیاس احمد گدی کے فن کا کلیدی باب ہے۔ یہ باب الیاس احمد گدی کی ناول نگاری کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں ناول نگاری پر 35 مضامین شامل ہیں۔ مضمون نگاروں میں ندیم احمد، عبد المغنی، شمیم حنفی، احمد یوسف، منظر اعجاز، نارنگ ساقی، انیس رفیع، نامی انصاری، مصطفے کریم، مناظر عاشق ہرگانوی، قیصر شمیم، علی احمد فاطمی، منظر حسین، اظہار خضر، مشرف عالم ذوقی، اے خیام، حامد علی خان، آفتاب احمد آفاقی، شہاب ظفر اعظمی، رضی الرحمان، مشتاق احمد وانی، نگینہ جبیں، عمر فاروق، رضوانہ پروین، آصف سلیم، عارفہ بشری، اے آر منظر، شمس الہدی انصاری علیگ، محمد ذاکر حسین رضوی، عابد نور الامین، نعمت شمع، نکہت زماں، زین رامش، حسن نظامی، اور محمد علام الدین کے مضامین شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ناول 'فائر ایریا' کا موضوع اور کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ ناول کوئلے کی کانوں کے ایک بڑے علاقے جھریا، بوکارو، کرن پورہ، گریڈیہہ، رام گڑھ، پلاموں اور سنتھال پرگنہ جیسے علاقوں کا احاطہ کرتا ہے اور ان علاقوں کی زندگی کے تمام نشیب وفراز اور تمام تر پیچیدگیوں کا احاطہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

گوشۂ 'اسفار الیاس' الیاس احمد گدی کے سفرنامے 'لکشمن ریکھا کے اس پار' کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ سفرنامہ 1968 میں ان کے مشرقی پاکستان کے سفر کی روداد ہے جو 1998 میں ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس باب میں پانچ مضمون نگاروں آفتاب احمد آفاقی، سرور حسین، فیروز عالم، محمد علام الدین، اور شمس الہدی انصاری علیگ کے مضامین شامل ہیں۔ مضمون نگاروں نے اس سفرنامے کی لہولہان زندگی، مقام ماحول، تہذیب وتمدن، فضا، اور منظر کے ساتھ فنکار کے مشاہدات وتجربات، ان کی جبلت اور نفسیات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ اور آخر میں 'تراجم الیاس' کے تحت مرتب موصوف نے الیاس احمد گدی کی ترجمہ نگاری 'پھنیشور ناتھ رینو کی منتخب کہانیاں' کے شعور ترجمہ سے قاری کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کی ضخامت اور مشمولات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرتب موصوف نے بڑی تگ ودو اور جانفشانی کے بعد یہ کتاب ترتیب دی ہے۔

تعلیم

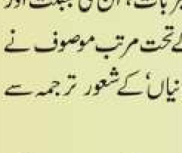

تعلیم و تدریس کے عصری مباحث
ایک جائزہ

منصف: ریاض احمد

صفحات: 312، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: ڈاکٹر ارشاد احمد، 1731 اسلامیہ نگر، سیوان، بہار

ڈاکٹر ریاض احمد کی اب تک کل 9 کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابوں کا تعلق تعلیم وتعلم سے ہے۔ چند کتابوں کے دوسرے وتیسرے ایڈیشن

بھی طبع ہو چکے ہیں۔اس سے ان کتابوں کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے قومی سطح کی متعدد یونیورسٹیوں کے لیے نصابی کتابیں اور اسباق بھی لکھے ہیں جو ایم اے اور بی ایڈ کی درسیات میں شامل ہیں۔ڈاکٹر ریاض احمد کے علمی، معلوماتی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہندوستان کے موقر رسالوں میں تواتر سے شائع ہوتے ہیں، جن سے ہزاروں طلبا فیض حاصل کرتے ہیں۔ ملک گیر سطح پر عصری اور روایتی تعلیم پر منعقد ہونے والے سمیناروں میں بھی ڈاکٹر ریاض احمد کو مقالہ نگار کی حیثیت سے بطور خاص بلایا جاتا ہے اور ان کے علمی مقالے پسند کیے جاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب 'تعلیم وتدریس کے عصری مباحث' ڈاکٹر ریاض احمد کی تازہ تصنیف ہے۔اس کتاب میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی ہدایات کے پس منظر اور پیش منظر پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر ریاض احمد کا اس اہم موضوع سے پیشہ وارانہ تعلق ہے، اس لیے موصوف نے قومی تعلیمی پالیسی کے مضمرات پر گہری نظر ڈالی ہے اور اپنے لمبے تعلیمی و درسیاتی تجربات کی بنا پر مختلف مضامین سپردِ قلم کیے ہیں۔

اس کتاب میں شامل سارے مضامین باہم اس طرح منضبط ہیں کہ کتاب ایک تعلیمی اکائی بن گئی ہے۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 پر ڈاکٹر ریاض احمد نے کل پانچ مضامین کے لیے 55 صفحات سیاہ کیے ہیں۔تعلیم کی نئی راہیں..... نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020، ابتدائی تعلیم، اسکولی تعلیم کی تشکیل نو، ٹیچر ایجوکیشن کا لائحہ عمل اور لسانی تکثیریت، آرٹ اور کلچر کا تحفظ وفروغ جیسے مضامین میں ڈاکٹر ریاض احمد نے تعلیمی سلسلے میں سرکاری پالیسیوں اور منصوبوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

زمانہ اس بات کا گواہ ہے کہ جن اقوام نے تعلیم و تعلم، صنعت وحرفت اور جدید تحقیقات کی جتنی توقیر کی ہے اتنی ہی ترقی کے منازل طے کیے ہیں۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی قوم یا ملت کے افراد اپنی آدھی آبادی کو جدید اور تکنیکی تعلیم سے محروم رکھ کر نہ تو تہذیب وتمدن سے ہم کنار ہو سکتے ہیں اور نہ عہد رواں اور معاصر چیلنجز کا سامنا کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر ریاض احمد نے تعلیم نسواں سے متعلق اپنے مضمون میں عہد بہ عہد سماجی معاشرتی اور تعلیمی حالات کا جائزہ لیا ہے۔انھوں نے بودھ وہاروں، ہندو مٹھوں اور مسلم سلاطین کے عہد میں تعلیمِ نسواں کے متعلق انتظامات، فرمودات اور احکامات کی وضاحت تفصیل سے کی ہے۔ اس ضمن میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے تعلیمی اداروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔انھوں نے آزادی کے بعد سال بہ سال قومی تعلیمی منصوبہ بندی میں خواتین کی صورتحال مختلف کمیشنوں اور کمیٹیوں کی سفارشات کے تحت تعلیم نسواں میں ترقی کے اعداد وشمار سے ان کی حقیقی حالت کا جائزہ لیا ہے جس سے ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ دستاویزی حیثیت کا حامل بھی ہے۔

'قانونِ حق تعلیم اور ہمارا سماجی رویہ' کے تحت ڈاکٹر ریاض احمد نے ان نکات کو زیر بحث لایا ہے جن سے غفلت کی وجہ سے ہمارا سماج سرکاری امداد، انتظامات اور سہولیات سے محروم ہو جاتا ہے۔اس میں سرفہرست تعلیم اطفال ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''بلا شک وشبہ 'قانون حق تعلیم' دنیا کے اس سب سے بڑے جمہوری ملک کے باشعور افراد کو دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم اپنے مستقبل کے تئیں کتنے سنجیدہ ہیں۔ایک طرف انسان مریخ پر حیات اور نباتات کی تلاش کرنے اور رموزِ کائنات جاننے میں کروڑوں ڈالر خرچ کر رہا ہے۔تو دوسری طرف وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مہیا کرانے سے قاصر ہے۔اس تلاش حیات وکائنات میں ہمارے سائنسداں بھی کسی نہ کسی طرح شامل ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جس نے سیکڑوں ایسے سائنس داں پیدا کیے جنھوں نے کائنات کی پیدائش کا راز جاننے کے لیے کامیاب کوششیں کیں اور وہ ملک بھی ہے جہاں ابھی تک تقریباً 20% بچوں نے اسکولوں کا منہ تک نہیں دیکھا ہے۔''

اسی طرح ڈاکٹر ریاض احمد نے تعلیم اور درسیات کے تعلق سے وقتاً فوقتاً جاری ہونے والے سرکاری گائیڈ لائن اور منصوبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔آپ نے معاشرتی اور معاشی طبقہ بندی کے اعتبار سے تعلیمی سہولیات کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح متمول افراد اپنے بچوں کے لیے ملک یا بیرون ملک سے ڈگریاں خرید لیتے ہیں۔ جبکہ متوسط اور نچلے طبقے کے افراد صرف سرکاری امداد یافتہ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔اس طرح ان طبقات کے افراد کو سرکاری سہولیات اور منصوبوں کا کماحقہ علم رکھنا ضروری ہے جو اپنے نونہالوں کے لیے ڈگری خریدنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح ہندوستانی آئین میں اقلیتی حقوق کے تحت ڈاکٹر ریاض احمد نے ذیلی عنوانات قائم کر کے سماجی ومعاشی، لسانی وثقافتی اور تعلیمی حقوق کے سلسلے میں آئینی دفعات پر روشنی ڈالی ہے۔اس مضمون میں تعلیم کے سلسلے میں مختلف سفارشات کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔

دور حاضر میں ہندوستانی مدارس کے مزاج ومعیار، تعلیم وتعلم اور نصاب ودرسیات پر کچھ زیادہ بحث ہو رہی ہے۔اس بحث میں وہ حضرات بھی شامل ہو گئے ہیں جن کو درس نظامی سے واقفیت نہیں ہے۔ایسے میں ڈاکٹر ریاض احمد کا مضمون 'طلباء مدارس اور روزگار کے امکانات' خاص توجہ کا حامل ہے۔اس مضمون میں موصوف نے ہندوستانی مدارس کی درجہ بندی کرتے ہوئے ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں چند دیگر مضامین کو شامل کر کے انھیں مزید روزگار رخی اور پیشہ ورانہ بنایا جا سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب کے دوسرے حصے میں درسیات ونصابات کا باب قائم کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے ذریعے تیار کردہ درسیات کے اولین نسخوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اردو کی تدریس پر متعدد کتابیں طبع ہو چکی ہیں لیکن ڈاکٹر ریاض احمد کو اس میدان میں خصوصی فہم، درک اور تجربہ حاصل ہے۔آپ نے اس موضوع پر الگ سے ایک کتاب بنام 'اردو تدریس: جدید طریقے اور تقاضے' لکھی ہے جس کا تیسرا ایڈیشن 2022 میں شائع ہو چکا ہے۔زیر تبصرہ کتاب میں بھی آپ نے اس عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے۔اس مضمون میں اردو تدریس کے مقاصد اور طریق کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون اردو کے طلبا، اساتذہ، نوآموز و پختہ کار اور متبدی ومنتہی سب کے لیے کارآمد اور مفید ہے۔

دیگر مضامین میں ڈاکٹر ریاض احمد اردو کے فروغ میں اسکولوں اور جامعات کے رول، ادب اطفال کے درسی مسائل، قومی نصاب تعلیم کے حوالے سے افسر میرٹھی کی ادبی بصیرت اور اردو میں فاصلاتی نظام تعلیم کا درسی مواد جیسے اہم اور ضروری عنوانات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان مسائل اور معائب کا تذکرہ کیا ہے جن سے اس فیلڈ میں کام کرنے والے حضرات نبرد آزما ہیں۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنی کتاب کے آخری باب 'علمی وادبی گہوارے' کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ٹیچر ایجوکیشن کالج اور ان سے منسلک سرکردہ اساتذہ کی علمی، ادبی اور انتظامی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ مضمون جتنا معلوماتی ہے اتنا ہی دلچسپ اور کارآمد۔آخر میں رامپور اسٹیٹ کی علمی وتعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔کل ملا کر یہ کتاب نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔اس کتاب سے طلبا، اساتذہ اور عوام وخواص سبھی فیض یاب ہو سکتے ہیں۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے اسے بے حد اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر ریاض احمد کی اس کتاب کی پذیرائی ان کی دوسری کتابوں کی طرح کی جائے گی۔

شاعری

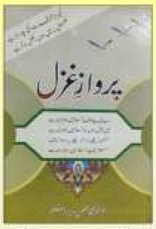

پرواز غزل

مصنف: ڈاکٹر اسلم پرویز اسلم
صفحات: 112، قیمت: 300 روپئے، سنہ اشاعت: 2022
مبصر: زبیر احمد بھاگلپوری، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ-15

21ویں صدی کے اردو شعر و ادب کی نئی نسل میں چند نام ایسے ابھر رہے ہیں جن سے مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ان میں ایک نام، جو سرعت سے ادبی افق پر اپنی شناخت قائم کرتا جارہا ہے، وہ اسلم پرویز اسلم کا ہے۔ 'پرواز' کے عنوان سے ان کی رباعیات کا مجموعہ پہلے ہی شائع ہوکر پذیرائی حاصل کرچکا ہے۔ اب جوان کی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ بعنوان 'پرواز غزل' حال ہی میں زیر زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا ہے، اس سے امید ہے کہ ارباب نقد کے ذریعے اس نوجوان اور جوشیلے شاعر کو کماحقہ، پذیرائی ضرور حاصل ہوگی۔

اسلم کی شاعری میں عہد حاضر کے انسانی رشتوں کی کیفیاتی عکاسی اور سلگتے ہوئے عصری تقاضوں کا برملا اظہار اسے نہ صرف بامعنی اور موزوں بناتا ہے بلکہ یہ عوامل پیچیدہ معاشرتی مسائل اور غیر منصفانہ سماجی رویے سے تخلیق کار کے ذاتی طور پر نبرد آزما ہونے کا اشاریہ بھی ہیں۔ سماجی سروکار کے یہی وہ عناصر ہیں جن سے کوئی بھی تخلیق امتیاز و انفراد حاصل کرتی ہے۔ چند اشعار

یہ ترا شہر بھی تجھ سا ہی فریبی نکلا
راستہ کوئی چلوں، تیری گلی آتی ہے

اسے پتہ ہے میرا جرم کچھ نہیں پھر بھی
مری سزا تو مقرر ہے کیا کیا جائے

جو ہمیں زندگی سے ملتا ہے
وہ سبق کم کسی سے ملتا ہے

وہی جو کل تلک در پر کھڑا تھا باادب میرے
اسی کو آج میری جھونپڑی اچھی نہیں لگتی

اردو شاعری کے منطقۂ حارہ میں اسلم پرویز کی شعری ریاضت نسیم سحر کے سرد جھونکے کی مانند محسوس ہوتی ہے۔ امکانات و توقعات سے روشن اور جذبات و احساسات سے سرشار ان کی شاعری ان تمام فکری، معنوی اور لسانیاتی عناصر سے آراستہ ہے جو ایک بڑے شاعر کی پرداخت کے حوالے سے لازمی اجزا تصور کیے جاتے ہیں۔ جدیدیت کی رمزیت و کنائیت اور ابہام و ایہام سے یکسر پاک سہل ممتنع کی ان کی شاعری بے پناہ ترسیلی قوت اور لسانیاتی سطح پر روایت کی پاسداری سے عبارت ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے

مضطرب دل کو کر نہ جائے کہیں
درد پھر سے ابھر نہ جائے کہیں

اس لیے مسکرا کے دیکھ لیا
اس کا چہرہ اتر نہ جائے کہیں

راز کی بات سدا راز رہے گی دل میں
لاکھ چاہو گے میں اعلان نہیں کر سکتا

چند سکوں کا زیاں مجھ کو گوارا اسلم
میں کبھی وقت کا نقصان نہیں کر سکتا

لہجے اور رجحان کی سطح پر انھوں نے جدیدیت کے اس طرز اظہار سے اپنے بیانیہ کو محفوظ رکھنے کی ضرور سعی کی ہے جو تفہیم کے نقطۂ نظر سے قاری کے لیے ثقالت کی فضا قائم کرتی ہے، لیکن ان کے درجنوں اشعار میں بکھری متذکرہ جدید رجحان کی لفظیاتی تازگی اور اصطلاحاتی طراوت سے واضح ہے کہ وہ جدید عناصر سے بھی عطر کشید کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔

بند کردوں سبھی دروازے، دریچے پھر بھی
ایک خوشبو ہے جو کمرے میں چلی آتی ہے

عجیب شہر ستم گر ہے کیا کیا جائے
لہو لہان کبوتر ہے کیا کیا جائے

معرکہ خوب ہے طوفان مسلسل سے مرا
پھر بھی ثابت ہوں میں دریا میں جزیرے کی طرح

اس کو آزاد پرندے کی طرح چھوڑ دیا
اس کو شیشے میں ابھی میں نے اتارا کم ہے

میں پریشاں ہوں کہ آخر کس طرح
میرا سایہ میرا قاتل ہو گیا

فکری اثباتیت کسی بھی شاعری کا قابل قدر پہلو ہوتا ہے۔ اسلم کی شاعری کے عناصر ترکیبی زندگی کی تمام تر عنائیوں اور مثبت پہلوؤں کا استعارہ ہیں اور شکست و ریخت کے دشوار ماحول میں بھی جینے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شعری کائنات کا محور رجائیت (Optimism) اور ثبوتیت (Positivism) ہے۔ کہیں کہیں معاشرتی دجل و فریب کا شکوہ ضرور ہے لیکن اس سے شکست خوردگی یا پست حوصلگی کی بجائے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے درکار عزائم کو استحکام اور سفر کی آبلہ پائی کی جرأت کے اسباب بہم ہوتے ہیں۔

سنجیدگی، متانت اور عصری حسیت جیسی جزئیات اسلم کے فکر و فن کو مجموعی قدر شناسی کی اساس فراہم کرتی ہیں۔ باعتبار معیار تخلیقی نشیب و فراز کا مسئلہ، خصوصاً ابتدائی دور میں تقریباً ہر فنکار کی تخلیقات میں موجود رہا ہے۔ اسلم کی شاعری بھی اس سے مبرا نہیں۔ تاہم ان کے فن کے حوالے سے مسرت آگیں نقطہ یہ ہے کہ تخلیقی سفر کے آغاز میں ہی ان کی تخلیقات میں پائی جانے والی شعور بالیدگی، فکری صالحیت اور فنی و لسانی سنجیدگی کی علامات مستقبل کے ایک بڑے شاعر کی نوید پیش کرتی ہیں۔

نظمیں قرۃ العین حیدر کے نام

مصنف: ہربنس سنگھ تصور
صفحات: 64، قیمت: 80 روپے
ناشر: جینیس گرافکس چنڈی گڑھ
مبصر: ڈاکٹر محمد عرفان، 3-11، سنگم وہار، دہلی۔ 110080

مذکورہ کتاب 'نظمیں قرۃ العین حیدر کے نام' ہربنس سنگھ تصور کی اہم تخلیق ہے۔ یہ کتاب اپنی طرح کی ایک منفرد کتاب ہے کیونکہ اس میں مصنف نے قرۃ العین حیدر کے کارناموں کو نظموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب صرف 64 صفحات پر مبنی ہے لیکن اس میں قرۃ العین حیدر کی زندگی کے اہم حصوں اور اس میں خاص کر قرۃ العین حیدر کے ناول اور ناولٹ کا ذکر زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ مشہور افسانوں کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں قرۃ العین حیدر کے فکشن کو نظم کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا نام اردو ادب میں بہت ہی احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے ان کا شمار بیسویں صدی کے اہم فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ناول، ناولٹ، افسانے، رپورتاژ سب کچھ ملتا ہے اور ان کا ناول ''آگ کا دریا'' اردو ادب کا شاہکار ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں قدیم ہندوستان سے تقسیم ہند کے بعد تک کے حالات ہیں۔ جس کا ذکر اس کتاب میں بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مصنف نے 'آگ کا دریا' ناول کے کرداروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

اس نظم کا یہ اقتباس دیکھیں۔

''راج کماری چمپک نے دیکھا
اک اک کرکے دیکھنے والے
محروم ہوئی بینائی سے
گوتم نیلمبر نے سنا
اک اک کرکے بولنے والے
چپ کے حق میں بیٹھ گئے

کمال الدین نے جان لیا
اک اک کر کے عالم فاضل
دیواروں کو پڑھ نہ پائے۔''

اسی طرح قرۃ العین حیدر کا ایک اور شاہکار ناول 'آخر شب کے ہمسفر' جس پر ان کو گیان پیٹھ اوارڈ بھی ملا۔ اس ناول کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔لیکن اس میں کرداروں کو موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ ناول کے فلسفے کو موضوع بنایا ہے اور فیض احمد فیض کے شعر کو بھی اس نظم میں شامل کیا گیا گیا۔

اس نظم میں مصنف اس فلسفے کو بیان کرتا ہے جس کو موضوع بنا کر قرۃ العین حیدر نے یہ ناول لکھا۔ناول میں ہندوستان اور بنگلہ دیش کی تاریخ، وہاں کی تہذیب وثقافت کو کچھ کرداروں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

اس نظم کے بارے میں بھی اشارہ کیا گیا ہے جس کو علامہ اقبال نے 'بال جبریل' کے شروعاتی صفحے پر کیا ہے۔

''پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر''

جس کو علامہ اقبال نے بھرتری ہری سے لیا ہے۔

نظم کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

''پھول کی پتی سے
ہیرے کا جگر تراشنے والا
بیوی کی بیوفائی سے
دِل شکستہ ہو کر
راج پاٹ تیاگنے والا
سنیاس کی گود میں جا بیٹھا''

اس کتاب میں ایک نظم 'گردش رنگ چمن' کے نام سے ہے جو کہ قرۃ العین حیدر کا ایک مشہور ناول ہے۔ جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے اس ناول کا عنوان غالب کے ایک شعر سے لیا ہے اور ہربنس سنگھ تصور نے یہیں سے اس نظم کی شروعات کی ہے اور اس چھوٹی سی نظم کے ذریعے اس ناول کے کرداروں اور کہانی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔مصنف نے بہت کم لفظوں میں پوری کہانی کو بیان کر دیا ہے۔اس سے مصنف کی مہارت کا پتا چلتا ہے۔نظم کچھ ایسے شروع ہوتی ہے۔

''سچ ہی کہا ہے
غالب نے
گردش میں ہے رنگِ چمن
فطرت میں
سب کورو پانڈو
لیلا میں سب رام لکھن
جہاں پناہ
ایک غریب الوطن مسافر کا
اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے
اس کی تجہیز وتکفین کے لیے
کچھ امداد فرمائیں۔''

قرۃ العین حیدر نے کل گیارہ رپورتاژ لکھے، جن میں 'لندن لیٹر'، 'شیشے کا گھر'، 'ستمبر کا چاند'، 'جہاں دیگر'، 'دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں'، 'خضر سوچتا ہے'، 'قید خانے میں تلاطم ہے کی ہند آتی ہے' وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے رپورتاژ 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے' کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

نظم افسر کی اس بات سے شروع ہوتی ہے جو جھوٹی تسلی دیتا ہے اور یہ بات کہتا ہے کہ غسل سے پہلے چائے صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔پھر مصنف اس تیرہ منٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ چائے لگانے کو کہہ دیتا ہے۔سب ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوتے ہیں اور دروازہ بند ہو جاتا ہے اور پانی کی ٹونٹیوں سے زہریلی گیس نکلتی ہے پھر وہی بات 13 منٹ،

یہ سب اشارے ہیں جس سے ہم قرۃ العین حیدر کے پورے فکشن کی سیر کرتے ہیں۔

اس کتاب کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے قرۃ العین حیدر کے پورے ادب کو پڑھنا اور سمجھنا ہوگا کیونکہ مصنف نے اس کتاب میں 'قرۃ العین حیدر کے نام' صرف اور صرف اشارے بیان کیے ہیں۔

اس طرح یہ بالکل الگ طرح کی کتاب ہے، جس میں ایک فکشن نگار کو نظم کے کچھ اشاروں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔جن لوگوں نے قرۃ العین حیدر کو پڑھا اور سمجھا ہے۔ان کو اس کتاب کو پڑھ کر کافی لطف آئے گا، کیونکہ اس کتاب میں قرۃ العین حیدر کے جتنے بھی مشہور کارنامے ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا فکشن ایک وسیع دائرے میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے پورے ادب کا احاطہ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔کتاب کم صفحات پر مشتمل ہونے کے باوجود مکمل ہے اور قرۃ العین حیدر کے فکشن کو سمجھنے میں معاون ہے۔

■

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

'مادری زبان کی اہمیت اور ہندوستان کے کثیر لسانی موزیک میں اس کی تنفیذ' کے عنوان سے یک روزہ سمپوزیم

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر کے سٹین ہال میں 'مادری زبان کی اہمیت اور ہندوستان کے کثیر لسانی موزیک میں اس کی تنفیذ' کے عنوان سے آج ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مہرشی والمیکی سنسکرت یونیورسٹی ہریانہ کے وائس چانسلر پروفیسر رمیش چندر بھاردواج نے کی اور اس میں ملک کے منتخب اہل علم و دانش نے اپنے خیالات و تجربات پیش کیے۔ سمپوزیم کے آغاز میں موقر مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد

نے اپنے تعارفی کلمات میں کہا کہ ہندوستان میں بہت سے مذاہب، تہذیبیں اور زبانیں ہیں، یہ ہمارے ملک کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں بولی اور سمجھی جانے والی تمام مادری زبانوں کو اہمیت دی جاتی ہے اور ان کی خصوصیات و محاسن کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ماں، مادرِ وطن اور مادری زبان کے احترام کا تصور ہندوستانی ثقافت کا اٹوٹ حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کا ایک دوسرے سے گہرا ربط اور لین دین کا رشتہ ہے، چنانچہ جہاں اردو میں عربی و فارسی کے علاوہ ہندی، سنسکرت، پنجابی، کشمیری، تمل اور تیلگو وغیرہ کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں، اسی طرح دیگر زبانیں بھی اردو اور دوسری زبانوں سے مستفید ہوتی رہی ہیں۔

پروفیسر عقیل نے کہا کہ موجودہ سرکار کے ذریعے تیار کی گئی نئی تعلیمی پالیسی میں ملک کی تمام مادری زبانوں کے تحفظ اور فروغ کی ضمانت دی گئی ہے اور ابتدائی پانچ درجات تک لازمی، جبکہ آٹھویں کلاس تک اختیاری طور پر مادری زبان میں تعلیم کی سفارش کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرکار تو اچھی تعلیمی پالیسی ہی بناسکتی ہے، مگر زمینی سطح پر اس کے کماحقہ نفاذ کے لیے تعلیمی اداروں اور ماہرین تعلیم کو سنجیدہ کوششیں کرنی ہوں گی تبھی ہم اپنی مادری زبان کو فروغ دے سکتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ لسانیات کے چیئرمین پروفیسر جہانگیر وارثی نے نئی تعلیمی پالیسی میں زبانوں کی تعلیم سے متعلق سفارشات پر خصوصی گفتگو کرتے ہوئے ماضی سے لے کر اب تک کی مختلف تعلیمی پالیسیوں میں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کے حوالے سے پیش کردہ نظریات اور تجاویز پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ابتدائی سطح پر مادری زبان میں تعلیم کے ممکنہ طریق ہائے کار اور اسالیب پر بھی گفتگو کی۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے خطاب میں کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان میں تعلیم کو اہمیت دینا حکومت کا قابل ستائش قدم ہے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی یا کسی بھی زبان سے مرعوب ہوکر ہمیں اپنی مادری زبان کے تئیں احساس

کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اپنی مادری زبان کے تئیں ایک قسم کا احساسِ فخر ہونا چاہیے، تبھی ہم اس کا تحفظ بھی کر سکتے ہیں اور اسے فروغ بھی دے سکتے ہیں۔ شعبہ ہندی دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر چندن کمار نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ ہندوستان میں آزادی سے بہت پہلے سے موضوع بحث رہا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اسی وجہ سے مادری زبان میں تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اپنی مادری زبانوں کو عالمی زبان بنانا ہے تو انھیں محض ادب وشعر کے بجائے سائنسی زبان بنانا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ زبان کا مسئلہ روزگار سے بھی جڑا ہوا ہے، ہمیں اپنی مادری زبانوں میں نئے نئے روزگار پیدا کرنا چاہیے، ایسا ہو تو نئی نسل خود بخود اسے سیکھنے کی طرف متوجہ ہوگی۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ بلاشبہ یہ پالیسی مادری زبان کی تعلیم کے حوالے سے اچھی ہے، مگر اس کا نفاذ ہماری ذمے داری ہے، ہمیں اپنی مادری زبانوں میں تعلیم پر خود توجہ دینی ہوگی تبھی پالیسی اور سرکار کی کوشش کامیاب ہوگی۔

پروفیسر رمیش چندر بھاردواج نے اپنے پرمغز صدارتی خطاب میں کہا کہ پچانوے فیصد ہندوستانی آبادی مادری زبان میں ہی بات کرتے ہوئے اپنی پوری زندگی گزار دیتی ہے، مگر آزادی کے بعد سے اب تک دو سے پانچ فیصد گنے چنے لوگوں نے ہمارے تعلیمی نظریات اور پالیسیاں بنائیں اور اسی وجہ سے ہندوستان آج سب سے پچھڑا ملک ہے اور ہم سائنسی وتحقیقی شعبوں میں کوئی خاص قابل ذکر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان میں تعلیم کی بات تو ہے، مگر اس کے نفاذ کی ذمے داری اساتذہ کمیونٹی اور قومی اردو کونسل جیسے زبانوں کو فروغ دینے والے اداروں کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ضروری ہے کہ ہم اپنی مادری زبانوں میں سائنس، سوشل سائنس اور دیگر عصری موضوعات پر نصابی کتابیں تیار کروائیں اور ان زبانوں میں بچوں کی تعلیم کا اہتمام کریں۔ انھوں نے ایک خاص بات یہ کہی کہ موجودہ دور ہمارے ملک کے لیے لسانی وثقافتی ایمرجنسی کا دور ہے، جس میں ہمیں اپنی مادری زبانوں میں ابتدائی سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا اہتمام کرنا ہر حال میں ضروری ہے، ہندوستان کے لسانی وثقافتی تنوع کے تحفظ کے لیے بھی یہ ضروری ہے، اگر ہم اس میں ناکام رہے تو نہ صرف اپنے گراں قدر متنوع لسانی ورثے سے محروم ہو سکتے ہیں، بلکہ ثقافتی رنگارنگی کا ہمارا قدیم ترین اثاثہ بھی خطرے میں آجائے گا۔ اس سمپوزیم کا اختتام پروفیسر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔ اس موقعے پر اہل علم ودانش کی بڑی تعداد موجود رہی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 مارچ 2023

قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹرز کے کامیاب طلبہ وطالبات کے درمیان تقریبِ تقسیمِ اسناد کا انعقاد

نئی دهلی: موجودہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے جس میں ہر آن نئی ترقیات ہو رہی ہیں اور دنیا برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، ایسے میں نہ صرف ہمیں جدید ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنی ہوگی، بلکہ وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے کے لیے بھی خود کو تیار کرنا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹرز کے فائنل امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے درمیان انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں منعقدہ تقسیم اسناد کی تقریب میں افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کا شروع سے یہ مقصد رہا ہے کہ اردو طلبہ وطالبات کو عصری ٹکنالوجی کی

تعلیم سے بھی آراستہ کیا جائے اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے پورے ہندوستان میں ہم نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرونکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی، چنڈی گڑھ (نائلیٹ) کے اشتراک سے سیکڑوں کمپیوٹر سینٹرز چلاتے ہیں، جہاں اردو سکھانے کے ساتھ کمپیوٹر ایپلی کیشن، ملٹی لنگول ڈی ٹی پی، بزنس اکاؤنٹنگ اور دیگر متعدد اہم کورسز کروائے جاتے ہیں، ہمارے سبھی کورسز سرکار سے منظور شدہ ہیں اور نئے تعلیمی سیشن میں کچھ نئے کورسز بھی متعارف کروائے گئے ہیں، یہ سارے پروفیشنل کورسز ہیں جن کی تکمیل کے بعد سرکاری وغیر سرکاری شعبوں میں نوکری کے علاوہ ہمارے طلبہ اپنے طور پر بھی آئی ٹی سیکٹر میں اپنا کریئر بنانے کے اہل ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جن طلبہ وطالبات نے امتحان میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی میں انھیں، ان کے سینٹر کے ذمے داران اور گارجین کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مستقبل میں اپنی صلاحیتوں کا مفید استعمال کر کے اپنے خاندان اور معاشرہ وملک کی گراں قدر خدمت انجام دیں گے اور جو امتیازی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے، انھیں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، وہ بھی ہمارے اچھے طالب علم ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے سبھی طلبہ وطالبات کا مستقبل روشن وتابناک ہوگا۔

نائلیٹ چنڈی گڑھ کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر جناب سبھانشو تیواری نے بھی کامیاب طلبہ وطالبات کو مبارکباد پیش کی، ساتھ ہی انھوں نے نائلیٹ کے نئے پروگراموں اور کورسز کے بارے میں بھی بتایا اور کہا کہ موجودہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے، جس میں اختصاص اور مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ آپ کو ٹکنالوجی کے کسی ایک شعبے میں مہارت حاصل کرنی چاہیے، تاکہ وقت کی ضروریات پوری کر سکیں اور اپنا کریئر بھی بنا سکیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ وقت میں کلاؤڈ کمپیوٹنگ، سائبر سکیوریٹی وغیرہ پر آپ کی نظر ہونی چاہیے اور اپنی دلچسپی کے مطابق میدان عمل منتخب کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ آئی ٹی سیکٹر میں ملازمت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے اور متعلقہ ادارے کو اپنی صلاحیتوں اور قوت کار سے کیسے مطمئن کر سکتے ہیں۔

اس موقعے پر الامین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی اوکھلا، بچوں کا گھر دریا گنج، ڈاکٹر ذاکر حسین سینئر سکینڈری سکول جعفرآباد، مدرسہ زینت القرآن، صوفیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، گروکل سماج وکاس سنستھا، مائناریٹی ویلفیئر فاؤنڈیشن دریا گنج، نیو مون سوشل ویلفیئر سوسائٹی مصطفیٰ آباد، چاند ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی وزیر آباد، نیشنل لٹرل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بھاگیرتھ وہار، اینجلس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی چاندنی چوک، فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ جعفرآباد، بنیادی وکاس سماج سیوی سنستھان اور زید کمپیوٹر سینٹر شاہین باغ کے اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو پروفیسر شیخ عقیل احمد، نائلیٹ کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر جناب سبھانشو تیواری اور دیگر مہمانوں کے ہاتھوں سرٹیفکٹ دیے گئے۔ ان کے علاوہ الامین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی اوکھلا کی طالبہ مریم منتشا نے پوری دہلی میں اول، اسی ادارے کے طالب علم ساجد عالم نے پوری دہلی میں دوم اور مائناریٹی ویلفیئر

فاؤنڈیشن دریاگنج کی طالبہ فرحین نے پوری دہلی میں سوم پوزیشن حاصل کی، انھیں سرٹیفکٹ کے علاوہ کونسل کی طرف سے خصوصی انعام سے بھی نوازا گیا۔ اس موقعے پر مختلف کمپیوٹر سینٹرز کے ذمے داران، اساتذہ اور کامیاب طلبہ وطالبات نے بھی اظہار خیال کیا اور شرکا سے اپنے تجربات شیئر کیے۔ پروگرام کی نظامت کا فریضہ کونسل کے ریسرچ آفیسر جناب انتخاب احمد نے بحسن وخوبی انجام دیا، انھی کے اظہارِ تشکر کے ساتھ اس تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کونسل کے سٹاف کے علاوہ دہلی کے تمام کمپیوٹر سینٹرز کے طلبہ وطالبات اور ان کے سربراہوں واساتذہ نے بطور خاص شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 مارچ 2023

طبِ یونانی پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی فروغِ اردو کے ساتھ اردو سے جڑے تہذیبی وعلمی ورثے کے فروغ وتحفظ کے لیے بھی سرگرم ہے۔ انسانی بیماریوں کے علاج کے قدیم ومفید ترین طریقوں پر مشتمل طب یونانی کا بیشتر علمی سرمایہ اردو زبان میں ہے اور اس شعبے میں نئی نئی دریافتیں بھی سامنے آرہی ہیں، کونسل اس سرمایے کے تحفظ کے ساتھ طب یونانی کے نئے پہلوؤں پر باقاعدہ ایک پینل کی رہنمائی میں کام کر

رہی ہے، چنانچہ اب تک اس موضوع اور اس کے متعلقات پر درجنوں اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس حوالے سے جاری علمی واشاعتی سرگرمیوں کا جائزہ لینے اور نئے موضوعات پر غور وخوض کے لیے آج کونسل کے طب یونانی پینل کی میٹنگ کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت پینل کے صدر محترم ڈاکٹر خالد صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے طب یونانی کے فروغ میں کونسل کے کردار کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ڈائرکٹر صاحب اور متعلقہ ذمے داران کی توجہ کی بدولت اب تک بہت سی قیمتی کتابیں یہاں سے شائع ہوچکی ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ پینل کے ذریعے کئی اہم علمی واشاعتی منصوبوں پر کام ہورہا ہے جو عنقریب منظر عام پر آجائے گا۔ قبل ازیں کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ نے پینل کے تمام ممبران کا خیر مقدم کیا اور پینل کے زیر نگرانی چل رہے منصوبوں کی صورتِ حال سے انھیں واقف کروایا۔ انھوں نے بتایا کہ تشریح البدن (تین جلدیں) شائع ہوچکی ہے جبکہ جراحت، امراض نسواں وقبالہ، کلیات ادویہ اور امراض اطفال جیسی کتابوں پر کام جاری ہے، ان میں سے بیشتر کتابیں تقریباً آخری مرحلے میں ہیں۔ پینل کے ممبران نے ان کتابوں کی موجودہ اسٹیٹس کا جائزہ لیا اور قابل ترمیم امور کی نشان دہی کے ساتھ ان کی جلد اشاعت پر زور دیا۔ انھوں نے طب یونانی اور میڈیکل سائنس کے شعبے میں ہونے والی نئی تبدیلیوں/ترقیات پر نظر رکھنے اور ان کی روشنی میں نئی علمی وتحقیقی کتابوں کی تیاری پر بھی توجہ دلائی۔ میٹنگ میں پینل کے ممبران ڈاکٹر محمد آفتاب، ڈاکٹر محمد اکرم اور کونسل کی ریسرچ اسسٹنٹ ذیشان فاطمہ وغیرہ بھی شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 مارچ 2023

ڈاکٹر تقی عابدی کی چار کتابوں کی رونمائی

نئی دھلی: تقی عابدی پیشے سے ڈاکٹر ہونے کے باوجود ادب سے بے پناہ دلچسپی رکھتے ہیں اور آئے دن ان کی ادبی وتحقیقی کتابیں ہمیں خوشگوار حیرتوں سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ اس خیال کا اظہار پروفیسر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں معروف دانشور ومحقق ڈاکٹر تقی عابدی کی حال ہی میں شائع ہونے والی چار کتابوں کی رونمائی کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی ادب وتحقیق کے شعبے میں اکیلے جتنا کام کررہے ہیں وہ عام طور پر پورا ایک ادارہ ہی کرسکتا ہے۔ انھوں نے تن تنہا

اتنے موضوعات پر کام کیا ہے کہ اگر صرف ان پر پی ایچ ڈی کی جائے تو اس کے لیے دسیوں لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان وادب سے جنون کی حد تک تعلق رکھنے والے اور اس زبان کے تحریری وتحقیقی سرمایے میں مسلسل اضافہ کرتے رہنے والے حضرات جب تک موجود ہیں اردو زبان ترقی کرتی رہے گی اور اس کی مقبولیت ومحبوبیت کا دائرہ پوری دنیا میں پھیلتا رہے گا۔ حال ہی میں ان کی چار کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سے ایک حالی کی نظمیں کونسل سے طبع ہوئی ہے، اس کے علاوہ غالب کے شاگرد بال مکند بے صبر کی گلستان ہند کو انھوں نے مرتب کیا ہے، ایک ان کے مضامین کا ضخیم مجموعہ منظر عام پر آیا ہے اور اس کے علاوہ دو جلدوں میں 'تقی عابدی: تعارف، تقریبات وتاثرات' کے نام سے ایک مبسوط کتاب شائع ہوئی ہے جس میں ان پر لکھی گئی تحریریں، ان سے متعلق ہونے والے پروگراموں کے اخباری رپورٹس اور تاثرات جمع کیے گئے ہیں، میں ان کتابوں کی اشاعت پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ وہ ایسے ہی اردو ادب وتحقیق کے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہیں۔

ڈاکٹر تقی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور اپنی کتابوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ان چار کتابوں میں سے ایک وہ ہے جس میں سات سو اسی سے زائد فوٹوز، سیکڑوں خبریں، نیوز رپورٹس اور مجھ سے متعلق تحریریں اور تاثرات جمع کیے گئے ہیں۔ دوسری کتاب میرے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں مختلف علمی وادبی موضوعات پر میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین جمع ہیں۔ ایک حالی کی نظموں کا انتخاب ہے، جو کونسل سے طبع ہوئی ہے۔ اور ایک اہم کتاب بلکہ دریافت غالب کے شاگرد بالمکند بے صبر کی اہم کتاب 'گلستان ہند' کی تدوین ہے، ہم نے ان کے اس مخطوطے کو اردو کے نستعلیق رسم الخط کے علاوہ ہندی اور رومن میں منتقل کردیا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔ یہ کتاب گلستان سعدی کے طرز پر لکھی گئی ہے جس میں اسی کی طرح پند وحکایات وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں اردو کے قدیم ذخیروں کی فراہمی کرکے انھیں شائع کرنا اور ڈیجیٹلائز کرنا بہت ضروری ہے تبھی ہم اپنے قدیم ادبی سرمایے کا تحفظ کرسکتے ہیں۔ آخر میں پروفیسر عقیل احمد کے شکریے کے ساتھ تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 اپریل 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

غالب توسیعی خطبہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو فارسی کے معروف محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی نے 'غالب: برصغیر کا پہلا ترقی پسند شاعر' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق

الرحمٰن قدوائی نے کی اور فارسی کے استاد پروفیسر اخلاق احمد آہن نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب کی شخصیت اپنے دور کی بہترین بصیرت کی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو ان آنکھوں سے دیکھا جو ہر کس و ناکس کو میسر نہیں ہوتیں۔ مہمان مقرر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ آج کے خطبے کا موضوع نہایت اہم ہے اور جب ہم جدید عہد کے تقاضوں پر نظر کرتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ غالب ترقی پسندی میں ہم سے بہت آگے ہیں اور جن باتوں کو یہ سوچ کر کہا گیا تھا کہ وہ پہلی بار کہی جا رہی ہیں کلام غالب پر نظر کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ غالب پہلے ہی ان نکات پر غور کر چکے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر اخلاق احمد آہن نے کہا کہ غالب ہماری روایت کا سب سے زیادہ روشن ضمیر شاعر ہے، انھوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، وہاں کچھ نئے نقوش چھوڑے ہیں۔ مثلاً ان کی نثر ہی کو لیجیے تو ان کے زمانے میں جس نثر کا رواج تھا، انھوں نے اس کی پیروی نہیں کی بلکہ ایک نئی طرز ایجاد کر دی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بہت عمدہ موضوع کا انتخاب کیا ہے، غالب کو اس زاویے سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایڈووکیٹ خلیل الرحمٰن نے کہا کہ غالب کو کئی زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن آج ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس زاویے سے پیش کیا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کثیر تعداد میں اس پروگرام میں شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 مارچ 2023

ہندوستان میں نسائی شاعری کی صورت حال

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام اور اردو اکادمی، دہلی کے تعاون سے یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'ہندوستان میں نسائی شاعری کی صورت حال' کا انعقاد آرٹس فیکلٹی کے ہال میں کیا گیا۔ سمینار میں تمام مہمانوں، شرکا اور طلبہ وطالبات کا استقبال کرتے ہوئے

صدر شعبہ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی نے کہا کہ شاعری کے عہد زریں میں خواتین کا بھی حصہ کم نہیں ہے۔ لیکن بوجوہ ان کی شاعری منظر عام پر نہیں آسکی۔ روایت یہ بھی ہے کہ میر کی صاحبزادی شاعری کرتی تھیں، لیکن میر نے ان کی شاعری ضائع کر دی۔ خواتین شاعرات کے تذکرے بھی لکھے گئے، لیکن ان تذکروں کا مقصد مثبت سے زیادہ منفی تھا۔ چٹخارے کے لیے وہ تذکرے لکھے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خواتین کی شاعری میں وہ بات نہیں، جو مردوں کی شاعری میں ہے۔ دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ خواتین کو اظہار مافی الضمیر کے مواقع کہاں ہیں۔ ہندو پاک دونوں ملکوں میں بہت سی خواتین بہت ہی اہم ہیں۔ اکثریت واقلیت کے درمیان کا فرق اکثر اقلیتوں کی خواتین پر زیادہ پڑتا ہے۔ ہمارا سماج بتدریج شناخت کے بحران سے گزر رہا ہے، جس کا اثر سماج اور ادب دونوں پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔ ان چیزوں کا اثر اردو شاعری پر بالخصوص خواتین کی شاعری پر پڑا ہے۔

اپنے کلیدی خطاب میں پروفیسر سید سراج اجملی نے کہا کہ نسائی شاعری کی شناخت اس چیز سے ہوتی ہے، جسے لہجہ اناث کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی تک خواتین شاعرات کے نام بھی مخفف ومخفی ہوتے تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں خواتین شاعری کر رہی تھیں۔ لیکن اظہارات میں آپ خواتین کے لہجے کی شناخت نہیں کر سکتے ہیں۔ نسائی شاعری کا سب سے توانا اسلوب ریختی ہو سکتا تھا۔ لیکن پدری نظام میں اس اسلوب کو خواتین کی تحقیر وتذلیل کا ذریعہ بنالیا گیا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ تحقیری رویہ تبدیل ہوتا گیا۔ اب صورت حال کچھ اور ہے۔

مہمان خصوصی محمد احسن عابد، سکریٹری اردو اکادمی، دہلی نے کہا کہ یہ سوال بہت اہم ہے کہ پاکستان کی طرح ہندوستان میں خواتین شاعرات اپنے جذبات واحساسات کا اس طرح اظہار کیوں نہیں کرتیں یا اس طرح کی نمائندہ شاعرات ہمارے یہاں کیوں نہیں پیدا ہوتیں۔

سمینار کے مہمان ذی وقار آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر امیتابھ چکرورتی نے کہا کہ یہ صداقت پر مبنی ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی خواتین شاعرات وادبا کا ذکر عموماً نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو برائے نام، کئی ہندوستانی زبانیں ایسی ہیں، جن میں خواتین ہمیشہ متحرک وفعال رہی ہیں۔ لیکن تاریخ میں انھیں ان کا حصہ نہیں دیا گیا۔

افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر معین الدین جینابڑے نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ اکثر غیر تانیثی ادب کو تانیثی نظر سے بھی دیکھا جاتا رہا ہے۔ ریختی میں ان امور سے گفتگو کی جاتی ہے، جو خواتین سے مخصوص ہیں۔ اس زمانے میں شاعری کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان قائم ہو چکا ہے، چونکہ اردو جس قوم سے منسوب زبان ہے، اس قوم کی زندگی، عزت اور جائیداد کی کوئی ضمانت

نہیں ہے اور جہاں ان تین چیزوں کی ضمانت نہیں ہوتی۔ وہاں شاعری نہیں ہوتی۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے شعبہ کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کہا کہ معاصر زمانے کی نسائی شاعری کو دنیا کے سامنے ہمیں پیش کرنا چاہیے۔

پہلے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی اور نظامت شعبہ کی استاذ ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر نکہت پروین نے دونسائی لہجے ادا جعفری اور شفیق فاطمہ شعری، ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے ماہ لقا چندابائی اردو کی اولین آواز، ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے نسائی شاعری کا احتجاجی لہجہ غزل کے حوالے سے، ڈاکٹر حنا آفرین نے ہندوستانی شاعرات کی نظموں کا احتجاجی لہجہ اور ڈاکٹر فرحت کمال نے نئی نسائی غزل کے رنگ کے عناوین پر اپنے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت شعبہ اردو کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی اور نظامت ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کی۔ اس اجلاس میں چار مقالات پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر معید الرحمان نے زاہدہ زیدی اردو شاعری کی ایک منفرد آواز، ڈاکٹر شاداب تبسم نے ہندوستان میں نسائی شاعری کا احتجاجی لہجہ، ڈاکٹر سفینہ بیگم نے ہندوستان میں معاصر نسائی نظم میں موضوعاتی تنوع اور ریشیکا ساگر نے مقالات پیش کیے۔

سمینار میں پروفیسر مظہر احمد، پروفیسر ارجمند آرا، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر عارف اشتیاق، ڈاکٹر شاہ فہد نسیم، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن، ڈاکٹر سنیل کمار، شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالرز، طلبہ وطالبات اور دیگر شعبوں کے اساتذہ وطلبا نے بالخصوص شرکت کی۔

بحوالہ https://qindeelonline.com/، 16 مارچ 2023

ہند-عرب تہذیب وثقافت

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات کے تحت شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد آرٹس فیکلٹی میں کیا گیا، سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے بین الاقوامی روابط کے چیئرپرسن پروفیسر چندر شیکھر نے کی۔ پروفیسر خالد بن یوسف البرقاوی کلچرل اتاشی سفارت خانہ مملکت سعودیہ عربیہ نے افتتاحی جلسے میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی، ان کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر امیتابھ چکرورتی اور شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر محمد نعمان خان بطور مہمانان اعزازی شریک رہے۔ پروفیسر ثناء اللہ ندوی صدر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پروگرام میں کلیدی خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ عربوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت کے موضوع پر جتنا لکھا ہے، شاید اتنا کسی دوسری قوم نے نہیں لکھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں بطور خاص ابن الندیم، البیرونی، بزرگ شہریار اور ابن خرداذبہ وغیرہ کا تذکرہ کیا۔ شعبۂ عربی کے سینئر استاذ اور پروگرام کے کنوینر پروفیسر سید حسنین اختر نے جلسے کی نظامت کے دوران موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ چونکہ یہ سال ہماری یونیورسٹی کی صدی تقریبات کا سال ہے، اس لیے یہ مناسب تھا کہ اس سمینار کا موضوع اس نوعیت کا ہو جس میں ہندوستان اور عرب دونوں کے باہمی دیرینہ رشتوں کا تذکرہ ہو اور چونکہ یہ عرب ہی تھے جنھوں نے ہندوستانی تہذیب وثقافت سے دنیا کو روشناس کرایا، اس لیے اس سے بہتر کوئی موضوع نہیں ہوسکتا تھا۔ پروفیسر امیتابھ چکرورتی ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی نے علمی و ثقافتی معاہدات کی ضرورت کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بنگالی زبان پر بھی عربی زبان وثقافت کے نمایاں اثرات ملتے ہیں۔ اس سے قبل شعبہ عربی کے صدر پروفیسر نعیم الحسن نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کا ایک مختصر تعارف پیش کیا۔ اظہار تشکر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے کیا۔ افتتاحی جلسے میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے سینئر اساتذہ نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد دو اکیڈمک اجلاس منعقد کیے گئے جن میں ایک آن لائن اور ایک آف لائن تھا۔ آن لائن کی صدارت پروفیسر نسیم اختر نے کی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر محمد اجمل قاسمی نے انجام دیا۔ اجلاس میں پروفیسر مظفر عالم حیدرآباد، ڈاکٹر ناجی قبیلات اردن، ڈاکٹر شفیع ہاشم کویت، وفا عبدالرزاق لندن اور پروفیسر نسیم اختر نے اپنے مقالات پیش کیے۔ آف لائن سیشن کی صدارت پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی اور پروفیسر عبدالماجد قاضی نے مشترکہ طور پر کی جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر قطب الدین نے انجام دیے۔ اس سیشن میں ڈاکٹر اکرم نواز، ڈاکٹر محمد سلیم، ڈاکٹر جمشید احمد، ڈاکٹر فخر عالم، ڈاکٹر زرنگار، ڈاکٹر مشتاق عالم اور پروفیسر قطب الدین نے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2023

طلوع اسلام پر مذاکرہ

نئی دھلی: فکر وفلسفہ کو شاعری میں ڈھالنا اقبال کا ہی

طرہ امتیاز ہے۔ اقبال کا طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ فکری انتشار کا شکار نہیں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر نئی دہلی میں اقبال اکیڈمی (انڈیا) کے زیر اہتمام علامہ اقبال کی نظم 'طلوع اسلام' کے ایک سو سال مکمل ہونے پر منعقد مذاکرہ میں مقررین نے کیا۔ مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی اور پروگرام کے ناظم پروفیسر توقیر احمد خان نے اقبال کی فکری جہات پر تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقبال کی شاعری ایک پیغام ہے جسے وہ عوام تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسسٹنٹ پروفیسر خالد مبشر نے نظم 'طلوع اسلام' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس نظم کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کے لیے ان کی دیگر نظموں کا بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ان کے فلسفہ کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ فکری انتشار کا شکار نہیں ہیں۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف نقاد حقانی القاسمی نے نظم کے عنوان طلوع اسلام کے حوالے سے کہا کہ نہ صرف اس عنوان پر سوالیہ نشان قائم کیا جاسکتا ہے بلکہ اقبال کی سیاسی بصیرت پر بھی سوال اٹھتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام اقتداری قوت نہیں بلکہ اخلاقی قوت سے عبارت ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے استاد پروفیسر اختر حسین کاظمی نے پنی بصیرت افروز تقریر میں نظم کے عنوان اور اقبال کی سیاسی بصیرت پر سوالیہ نشان کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی شاعری اسلام کا پیغام ہے اس لیے شاعری کی زبان پر لب کشائی بے معنی ہے، انھوں نے مزید کہا کہ آج ملت اسلامیہ کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے اسی طرح کے حالات اقبال کے زمانے میں بھی تھے۔ اقبال اکیڈمی انڈیا کے روح رواں ڈاکٹر سید ظفر محمود نے اقبال کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی شاعری قرآن اور حدیث کی ترجمان ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ ان کے افکار مذہبی نوعیت کے ہیں پھر بھی وہ تمام زبانوں کے ہم عصر شاعروں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ شعبہ اردو جامعہ ملیہ کے استاد پروفیسر شہزاد انجم نے نظم طلوع اسلام کے اشعار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی خطبے میں تسمیہ اور ویلفیئر

سوسائٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ تنقید کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن شاعری میں اپنے احساسات کی ترجمانی کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اقبال ایسے ہی آفاقی شاعر ہیں۔ جن دیگر افراد نے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر شکیل اختر، انیس احمد، ڈاکٹر سرفراز، ڈاکٹر مرتضیٰ وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 مارچ 2023

داراشکوہ: شخصیت اور کارنامے

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سینٹر فار پرشین اور سینٹرل ایشین اسٹڈیز اور داراشکوہ فاؤنڈیشن کے

زیراہتمام ایک روزہ کل ہند کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں اسکول آف لینگویج کی ڈین پروفیسر شوبھا سیواشنکرن نے خطاب کیا۔ استقبالیہ کلمات سینٹر آف پرشین کے چیئرپرسن پروفیسر اخلاق آہن نے پیش کیے جب کہ کلیدی خطبہ پروفیسر چندر شیکھر، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا۔ پروفیسر انوار عالم پاشا اس افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ مہمان اعزازی کے طور پر سوامی شانتا تام نندا، سکریٹری رام کرشن، دہلی نے شرکت کی۔ پروفیسر مہتاب عالم رضوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی بطور مہمان اعزازی زیب اسٹیج پر تھے۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے اسکول آف لینگویج کے سابق ڈین پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ داراشکوہ خداداد صلاحیتوں کا حامل انسان تھا۔ شاہی خاندان کا فرد ہونے کے باوجود اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھیں ایک عام انسان انجام نہیں دے سکتا۔ اس نے تصوف کی جو منزلیں نہایت قلیل مدت میں طے کیں وہ اس بات کی غماز ہیں کہ اس پر خدا کا خاص فضل تھا۔ ڈاکٹر محسن علی، ٹرسٹی داراشکوہ ریسرچ فاؤنڈیشن نے کلمات تشکر ادا کیے جب کہ نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر صدام حسین نے انجام دیے۔ اس ایک روزہ سمینار میں کل بیس مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں پروفیسر عبدالخالق رشید، ڈاکٹر محسن علی، ڈاکٹر ذوالفقار علی انصاری، ڈاکٹر شہباز عامل، بینش اسد، غزالہ، ڈاکٹر ملک سلیم جاوید، ڈاکٹر ارہنت کمار، ڈاکٹر عبدالواسع، ارشد حسین میر، جعفر رضا، رضوان علی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر چندر شیکھر اور پروفیسر اے راشد نے کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت پروفیسر مظہر آصف اور انور خیری نے کی جب کہ آخری سیشن کی صدارت ڈاکٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر ملک سلیم جاوید نے کی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر شہباز عامل، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مارچ 2023

ہندوستانی فارسی شاعری کی روایت اور مرزا غالب کی انفرادیت

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز (آئی آئی پی ایس) کے زیراہتمام ہندوستانی فارسی شاعری کی روایت اور مرزا غالب کی انفرادیت کے عنوان پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں ایک مذاکرہ ہوا۔ پروگرام کا آغاز فخر ہندوستان گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور زمانہ تخلیق گیتانجلی کے نغموں سے ہوا جسے نیتو بھاسکر اور پرتیا شرما نے اپنے مسحور کن آواز سے بالترتیب فارسی اور انگریزی میں پیش کیا۔ اس مذاکرے کا افتتاحی خطبہ نجیب جنگ مترجم دیوان غالب نے بعنوان صریر خامہ پیش کیا۔ اپنے خطبے میں انھوں نے غالب کی طلسماتی دنیا سے سامعین کو محصور کیا۔ پروفیسر سید اختر حسین صدر آئی آئی پی ایس نے ہندوستانی فارسی شاعری کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ یہ روایت ہزاروں سال سے ایران، مشرق وسطیٰ سے ہوتے ہوئے برصغیر ہندوستان میں آئی ہے اور عظیم شعرا مثلاً خسرو، فیضی، بیدل، غالب اور اقبال اسی سنہری روایت کے پروردہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہر زمانے میں غالب کی قدر پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے اور اسے عندلیب گلشن ناآفریدہ تصور کیا جائے گا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے استاذ ڈاکٹر ارشد القادری نے اپنی تقریر میں غالب کے شعری نبوغ پر مدلل بحث کی۔ جلسے کی صدارت جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے مرکزی ایشیا کے پروفیسر سنجے پانڈے نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں افتتاحی خطبے کو سراہتے ہوئے کہا کہ غالب کی مقبولیت بنارس کے برہمنوں اور کایستھوں میں اتنی ہی رہی ہے جتنی دہلی کے اردو حلقوں میں۔ انھوں نے پروفیسر سید اختر حسین کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کی کہ غالب برصغیر میں سمرقند کی ثقافتی اور ادبی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد ارشد القادری کی تقریر پر روشنی ڈالی اور اتفاق کا اظہار کیا کہ غالب کی شاعری نہ صرف فارسی زبان میں انفرادیت رکھتی ہے بلکہ فکر کے ارتفاع اور بلندی تک پہنچتی ہے۔ اشوکا یونیورسٹی کی طالبہ نشٹھا دانی نے اس پروگرام کی نظامت کے فرائض کو بخوبی انجام دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2023

پارسی تھیٹر کے بعد اردو ڈراما

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیراہتمام 'پارسی تھیٹر کے بعد اردو ڈراما' کے عنوان سے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈرامے کے ماہر اور دہلی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ پارسی تھیٹر کے زوال کی وجہ فلمی صنعت کی ترقی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کے بعد ڈرامے کی صنف نے ترقی نہیں کی بلکہ آزادی کے بعد اس صنف کو غیرمعمولی طور پر فروغ حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سنگیت ناٹک اکیڈمی قائم کی اور آگے چل کر نیشنل اسکول آف ڈراما وجود میں آیا۔ خصوصاً ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے ڈرامے کو طبقاتی کشمکش، سماجی مسائل اور سیاسی ناہمواریوں کی پیش کش کے لیے ایک اہم حربے کے طور پر استعمال کیا۔ ڈراما بنیادی طور پر تحریر کرنے کے بجائے کرکے دکھانے کا فن ہے، چنانچہ اسٹیج پر جب ڈراما مختلف تہذیبوں سے وابستہ اداکاروں کو بیک وقت مجتمع کردیتا ہے تو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے استحکام میں ڈراما اسٹیج کا یہ کردار ناقابل فراموش ہوجاتا ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ توسیعی خطبات میں جن مقررین کو مدعو کیا جاتا ہے، کوشش رہتی ہے کہ وہ اس میدان کے ماہر ہوں۔ پروفیسر محمد کاظم بیک وقت ڈراما نگار اور ہدایت کار ہی نہیں بلکہ ڈرامے کے محقق اور ناقد بھی ہیں۔ توسیعی خطبے کے کنوینر پروفیسر عمران احمد عندلیب نے کہا کہ ڈرامے کے حوالے سے پروفیسر محمد کاظم کا علم محکم بھی ہے اور مسلم بھی۔ وہ ڈرامے کا عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 مارچ 2023

ایک شام خالد محمود کے نام

نئی دھلی: پروفیسر خالد محمود کی شخصیت ہمہ جہت ہے اور ان کی ہر جہت نہایت روشن ہے۔ وہ بیک وقت خاکہ

نگار، انشائیہ نگار، شاعر، نقاد اور محقق سبھی کچھ ہیں، لیکن بحیثیت معلم اور بحیثیت انسان بھی وہ غیر معمولی خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کی کتاب 'اردو سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' آج بھی ایک ایسا مستند حوالہ ہے کہ جس کے بغیر اس موضوع پر کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام ممکن نہیں۔ ان خیالات کا اظہار مشہور تعلیمی تنظیم دی ونکس فاؤنڈیشن کے زیراہتمام ڈائنامک انگلش کوچنگ سینٹر، بٹلہ ہاؤس، نئ دہلی میں 'ایک شام خالد محمود کے نام' منعقد کیے گئے اعزازی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر کوثر مظہری نے کیا۔ اس موقعے پر مشہور ادیب اور صحافی شمیم طارق نے کہا کہ خالد محمود ہماری ادبی وتہذیبی زندگی میں شمع محفل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مہمان خصوصی ممتاز نباتاتی سائنس داں اور سابق پرووائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے پروفیسر خالد محمود کی خانگی زندگی پر ایک دلچسپ خاکہ پیش کیا۔ جلسے کے کنویز ڈاکٹر عادل حیات نے صاحب اعزاز پروفیسر خالد محمود کا مفصل تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اردو کی ادبی بستیوں میں گنتی کے چند لوگ ہیں جن کی شخصی اور ادبی زندگی مشعل راہ بن جائے، پروفیسر خالد محمود کا شمار انھیں نایاب شخصیات میں ہوتا ہے۔ محفل کے میزبان دی ونکس فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر انوارالحق نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر خالد محمود نفاست طبع، اعلیٰ حس ظرافت، زبان وتہذیب سے والہانہ وابستگی اور تعلیم وتربیت کے حسین سنگم کا نام ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید حسن نے انجام دیے۔ اس کے بعد ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 مارچ 2023

منشی نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیراہتمام گیارہویں منشی نول کشور یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ موقر خطبہ بزرگ ادیب و دانشور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے شعبۂ تاریخ وثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے

خوبصورت سمینار ہال میں 'غالب اور اقبال کی دو تخلیقات' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے اس خطبے میں اقبال کی مشہور مثنوی 'ساقی نامہ' اور غالب کی غزل میں شامل قطعہ 'اے تازہ واردان بساط ہوائے دل' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب اور اقبال کی ان دونوں تخلیقات کا نقطۂ اتصال 'ساقی' ہے۔ 'ساقی' کے کردار میں جو تضاد واقع ہوا ہے، وہی ان دونوں متون کا مرکز ومحور بھی ہے اور محرک بھی۔ اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تمام تر روایتی حربوں اور شعری وسائل کو اختیار کرتے ہوئے اس کو بالکل ایک نئ جہت عطا کردیتے ہیں۔ اقبال کا متن کلاسیکیت کے آئینے میں مستقبل بینی کے وسیلے سے عبارت ہے۔ اقبال کی مثنوی 'ساقی نامہ' اس امر کی روشن نظیر ہے کہ ایک روایتی قسم کی صنف میں کس طرح عہد حاضر کے انقلابات، فکری، تہذیبی اور سیاسی انفجار اور بحران کو منعکس کیا جاسکتا ہے۔ مثنوی ''ساقی نامہ'' تحرک، فلسفۂ وقت کے حیات افروز تصور اور تمام تر مثبت تبدیلیوں کو قبول کرتے ہوئے روحانی اور مادی اقدار کو خوبصورتی کے ساتھ ہم آمیز کردینے کی ایک شاہکار تخلیقی کاوش ہے۔ خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ آج کے اس غیر معمولی خطبے نے ہمیں متن کی قرأت کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اس سے پہلے ایک بڑے متن کو سامنے رکھ کر ایسی تازہ گفتگو کبھی نہیں کی گئی۔ اس گفتگو سے 'ساقی نامہ' کے تمام ممکنہ ابعاد روشن ہوئے اور غالب کی غزل میں شامل مذکورہ قطعہ کو ایک نیا تناظر ملا۔ خطبے کے کنویز پروفیسر خالد جاوید نے کہا کہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا شمار استاذ الاساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ماسٹر رام چندر کو تحقیقی وتنقیدی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے کئ نسلوں کی ادبی تربیت میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی 10 مارچ 2023

ساہتیہ اکادمی کے نومنتخب عہدہ داران

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی نوتشکیل شدہ جنرل کونسل کی گزشتہ روز منعقدہ میٹنگ کے دوران اکادمی کے نئے صدر اور نائب صدر کا انتخاب عمل میں آیا۔ انتخاب کے دوران باضابطہ پولنگ ہوئی اور اس میں کونسل کے تمام 99 ممبران نے شرکت کی۔ کارگزار صدر پروفیسر چندر شیکھر کمبار نے چناؤ کے نتیجے کا اعلان کیا جس کے مطابق ہندی کے ممتاز ومعروف شاعر وادیب اور اکادمی کے سابق نائب صدر ڈاکٹر مادھوکوشک کو صدر اور نائب صدر کے طور پر ہندی کی ادیبہ پروفیسر کمد شرما کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکادمی کے ایکزیکٹیو بورڈ کے ممبران اور سبھی 24 زبانوں کے کنویز کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ نومنتخب صدر ڈاکٹر مادھوکوشک ہندی زبان کے ممتاز شاعر وادیب ہیں۔ ان کی نظم ونثر کی چالیس سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ حکومت ہند اور ملک کی مختلف ریاستی حکومتوں سے انھیں ادبی خدمات کے اعتراف میں 20 سے زیادہ اعلیٰ ترین ادبی انعامات و اعزازات حاصل ہوچکے ہیں۔ نائب صدر پروفیسر کمد شرما ہندی ادیبہ، میڈیا ایکسپٹ اور فیمنسٹ ہیں۔ اردو مشاورتی بورڈ کے نئے کنویز اردو کے ممتاز شاعر و ادیب چندر بھان خیال بنائے گئے ہیں۔ کئ شعری مجموعوں اور حضرت محمد کی سیرت پر مبنی طویل شاہکار نظم 'لولاک' کے خالق چندر بھان خیال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اقبال سمان، ٹیگور لٹریچر ایوارڈ، ماکھن لال چترویدی راشٹریہ سمان سمیت کئی اہم ترین انعامات واعزازات سے نوازے جاچکے ہیں۔ اعلان کے مطابق ہندی کے کنویز گووند مشرا، انگریزی کے مالاشری لال، کشمیری کے کنویز شاد رمضان، میتھلی کے ادے نارائن سنگھ، راجستھانی کے کنویز ارجن دیوچارن بنائے گئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 مارچ 2022

ہندی غزل اور ہندی کویتا

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی کے زیراہتمام ہندی غزل اور ہندی کویتا کے عنوانات سے خصوصی لکچرز کا انعقاد کیا گیا۔ معروف شاعر نعمان شوق نے ہندی غزل پر اور معروف شاعر، افسانہ نگار اور مترجم خورشید اکرم نے ہندی کویتا پر خطبات پیش کیے۔

ہندی غزل کے عنوان پر خطبہ دیتے ہوئے نعمان شوق نے کہا کہ جب کوئی صنف بنیادی طور پر ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتی ہے تو اس کے روپ رنگ میں فرق آجاتا ہے۔ ہندی غزل کے ساتھ بھی یہی ہوا، ہندی غزلیہ شاعری کے بڑے ناموں میں سے بیشتر نے اردو غزل سے استفادہ کیا مگر زبان کو اپنے انداز سے برتا، ہندی غزل پر ایک بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ اس

میں موزونیت کو ترجیح نہیں دی جاتی یا زبان کا وہ معیار نہیں جو اردو غزل کا ہے۔ ان اعتراضات کو رد کرتے ہوئے نعمان شوق نے کہا کہ ہندی کے شاعر ہندی میں غزل کہہ رہے ہیں جنھیں اردو غزل کے سخت معیارات پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ اپنی سہولت کے حساب سے الفاظ استعمال کرنے کا حق سبھی کو ہے ہندی کے غزل گو شعرا کو بھی یہ آزادی ملنی چاہیے۔

ہندی کویتا کے عنوان پر خطبہ دیتے ہوئے معروف فکشن نگار، ناقد اور صحافی جناب خورشید اکرم نے کہا کہ اردو نظم اور ہندی کویتا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اردو نظم کا تصور غزل سے آیا ہے اور نظم نے غزل سے استفادہ کا یہ سلسلہ برقرار رکھا ہے۔ اسی لیے نثری نظم کو قبول کرنے میں ہمیں اب تک تامل ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو شاعری کا بڑا حصہ احساسات پر منحصر ہے جبکہ ہندی شاعری ان نزاکتوں کے آس پاس نہیں گئی، بلکہ اس نے زندگی کو عام آدمی کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

صدارتی خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر پربھات رنجن نے کہا کہ ہندی میں کویتا اور غزل دونوں کہی گئی، ہندی کویتا میں سیاسی رنگ غالب رہا ہے لیکن اب ہندی کویتا احساس کی طرف لوٹ رہی ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ نئی نسل کے لیے ہندی اور اردو غزل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

مہمان خصوصی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر ایتا بھ چکرورتی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شعبہ اردو کے اس اہم پروگرام میں شرکت کرکے بے حد خوشی ہوئی، بنگالی زبان میں اردو شاعری کے ترجمے بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر نجمہ رحمانی نے مقررین، صدر اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اس موضوع کے انتخاب کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ ہم چاہتے ہیں ہندی کے نامور ادبا اور شعرا کے بارے میں ہمارے طلبا کو بھی معلومات ہو اور وہ مرکزی دھارے کا حصہ بنیں، ہمیں اردو کے ساتھ دوسری علاقائی زبانوں سے بھی استفادہ کی ضرورت ہے جس کی ابتدا ہم ہندی کویتا اور ہندی غزل کے موضوع پر ان خطبات کے انعقاد سے کر رہے ہیں۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر پربھات رنجن (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ ہندی، ذاکر حسین دہلی کالج، شبینہ) اور نظامت ڈاکٹر ارشاد نیازی استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے کی۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبا و طالبات موجود رہے۔

پریس ریلیز: عبدالباری قاسمی، دہلی، 23 مارچ 2023

عشرت ظہیر کے افسانے

نئی دھلی: عشرت ظہیر کا تعلق تپیا اور نروان کی سرزمین گیا سے ہے جس کی علمی و ادبی فضا نے ان کی

شخصیت کی تعمیر کی اور وہ 54 برسوں سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے آڈیٹوریم میں 'عشرت ظہیر کے افسانے' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اردو کے مشہور ناقد و محقق اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شہزاد انجم نے کیا۔ وہ مجدد سینٹر فار آرٹس اینڈ لٹریچر کی مجلس گفتگو کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ عشرت ظہیر کے افسانے اگرچہ ان کے ذاتی تجربات و واردات پر مبنی ہیں لیکن افسانہ نگاری کے فن پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے، علامات و استعارات سے انھوں نے خوب کام لیا ہے اور ان کے بیشتر افسانے آج کی زندگی کے تلخ مسائل کا اساطیری اظہار ہیں جب کہ اس موقعے پر مجدد آئی او ایس سینٹر کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے مشہور صحافی و ادیب ڈاکٹر شاہین نظر نے کہا کہ سینٹر اور اس کے روح رواں انجم نعیم صاحب نے ایک نئی روایت کی طرح ڈالی ہے۔ انھوں نے عشرت ظہیر کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ان کے افسانوں کی فضا خالص ہندوستانی ہے۔ اس سے قبل عشرت ظہیر نے اپنا ایک شاہکار افسانہ 'کپل وستو' پیش کیا جس کو حاضرین نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا جب کہ مشہور ادیب و صحافی اشہر ہاشمی نے ان کے فکر و فن پر ایک بڑا پرمغز مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مثالوں سے بتایا کہ خود کلامی اور سرگوشیاں ان کے افسانوں کا نمایاں وصف ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ عشرت ظہیر کے افسانے حقیقت اور پرچھائیوں کو گرفت میں لاتے ہیں جب کہ سہیل انجم نے گیا، کشی نگر اور کپل وستو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گوتم بننا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ عشرت ظہیر کے افسانہ 'کپل وستو' پر تبصرہ کر رہے تھے جو ایک خوبصورت و فکر انگیز علامتی افسانہ ہے۔ مجلس گفتگو کی نظامت ڈاکٹر خان رضوان کر رہے تھے۔ شرکائے مجلس میں علم و ادب کی کثیر تعداد شامل تھی۔ مجلس کا اختتام مجدد آئی او ایس سنٹر فار آرٹس اینڈ کلچر کے کنوینر انجم نعیم کے اظہار تشکر پر ہوا۔ انھوں نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سینٹر کے قیام کا مقصد ادب اور فنون کے شعبوں میں تعمیری ذہن، مثبت بحث اور سنجیدہ غور و فکر کو فروغ دینا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 17 مارچ 2023

سجاد ظہیر یادگاری خطبہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام سجاد ظہیر یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ موقر خطبہ بزرگ ادیب اور ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے شعبۂ تاریخ و

ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خوبصورت سمینار ہال میں 'اقبال اور نسل نو' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کے وجود نے پورے برصغیر کو تفاخر بخشا ہے۔ انھوں نے اس خطبے میں اقبال اور نسل نو کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اقبال ہی وہ شاعر ہے جو ہماری قومی و ملی زندگی کی ہر رہ گزر کو روشن کرتا ہے۔ اقبال اردو ہی نہیں ہندوستان کی تمام زبانوں میں بڑے انقلابی شاعر ہیں۔ دنیا کے کسی شاعر نے فکر و فلسفہ اور آرٹ کی ایسی ہم آہنگی نہیں پیدا کی جیسی اقبال نے پیش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اقبال کے متن کا مطالعہ آرٹ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ فکر اور فلسفے کی روشنی میں بھی کرنا چاہیے۔ اس جلسے کے مہمان خصوصی ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز،

جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر محمد اسحٰق تھے۔ خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ آج کا یہ خطبہ اقبال کے لیے خراج عقیدت اور مہمان مقرر کے لیے خراج تحسین ہے۔ بلاشبہ اردو دنیا کی اٹھارہویں صدی 'میرؔ'، انیسویں صدی 'غالبؔ' اور بیسویں صدی 'اقبالؔ' کے نام سے منسوب ہے۔ خطبے کے کنوینر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ پروفیسر عبدالحق کی شناخت ماہر اقبالیات کی ہے اور ان کی تقریباً ساٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ پروگرام کا اختتام ڈاکٹر مشیر احمد کے اظہار تشکر پر ہوا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 14 مارچ 2023

بہار

فروغ اردو سمینار

حاجی پور: حاجی پور کے دیوچند کالج میں شعبۂ اردو کی جانب سے 'بہار میں فروغ اردو کے لیے کیا کیا جائے'

کے عنوان سے سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مشہور و معروف ادیب، قلمکار جناب انوارالحسن وسطوی نے فرمائی۔ جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر حسن رضا استاد سکھ دیو لکھ لال نے انجام دیے۔ جناب انوارالحسن وسطوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے اس لیے تمام ہندوستانیوں کو اردو کے فروغ کے لیے آگے آنا چاہیے۔ جناب صدر نے بہار میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے غیر اردو دانوں کے لیے چلائے جارہے آن لائن اردو کلاس کی جانب بھی توجہ دلائی اور کہا کہ اس کورس سے بہت سارے ہندی دالوں نے فائدہ اٹھایا۔ جناب وسطوی نے دیوچند کالج کے صدر شعبہ اردو پروفیسر جناب سلطان اکبر خان اور وہاں کے پرنسپل پروفیسر تارکیشور پنڈت کو کالج کی جانب سے پہلی بار اتنے بہترین سمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب شاہد محمود پوری نے اپنے خطاب میں کہا کہ صوبہ بہار میں اردو زبان کی بقا کے لیے تمام سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں اردو کا جائزہ لیا جائے اور اس کے حساب سے لائحہ عمل تیار کیا جائے جب کہ مہمان اعزازی بدر محمدی نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ اردو انقلاب کی چنگاری روشن کرنے والی اور غریبوں کو جگانے والی زبان ہے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اس لیے اردو کو اپنائیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر منظور حسن نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اردو میں بول چال کو رواج دیں اور بچوں کو ابتدائی تعلیم بھی اردو میں دلوائیں۔ اس موقعے پر سمینار کے کنوینر ڈاکٹر سلطان اکبر خان صدر شعبۂ اردو دیوچند کالج نے اپنے خطبے میں کہا کہ اردو والے احساس کمتری کے شکار ہیں ہمیں اس سے اوپر اٹھنا چاہیے۔ آپ اردو پڑھ کر اساتذہ کی نوکری لے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اردو اکادمی، اردو ڈائرکٹوریٹ میں کسی عہدے اور بلاک میں اردو مترجم کی ملازمت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اردو سے سول سروسز کے امتحان میں شامل ہو کر بڑے عہدے پر بھی فائز ہو سکتے ہیں۔ نظامت کر رہے جناب حسن رضا نے اپنے خطبے میں کہا کہ اردو ہندی دو سگی بہنیں ہیں۔ عظیم الدین انصاری صدر ضلع اردو ایکشن کمیٹی ویشالی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے اسکول کالج کے طلبا کو اردو کے پروگراموں میں حصہ لینے کا موقع دیا جانا چاہیے۔

روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 22 مارچ 2023

موجودہ عہد میں داراشکوہ کی معنویت

پٹنہ: خدابخش لائبریری میں شہزادہ داراشکوہ کے یوم پیدائش پر داراشکوہ اور آج اس کی معنویت کے موضوع پر لکچرز کرائے گئے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد (سابق ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری)، ڈاکٹر زاہدی (شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج) اور ڈاکٹر رتیشور ناتھ تیواری (شعبۂ تاریخ، جے پی یونیورسٹی) کے لکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شائستہ بیدار، ڈائرکٹر خدابخش لائبریری نے کہا کہ خدابخش لائبریری نے ہمیشہ اپنے بڑوں کو یاد کیا ہے اور ان کی خدمات کو لکچرز اور نمائش کتب کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا ہے۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے آج داراشکوہ پر مخطوطات اور کتابوں کی نمائش لگائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی داراشکوہ اور اس کی معنویت کے موضوع پر لکچرز کا انعقاد کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شائستہ بیدار نے افتتاحی کلمات میں کہا کہ خدا بخش لائبریری اور داراشکوہ کا ایک گہرا تعلق ہے۔ دونوں نے زمانے سے، دلوں کو قریب لانے کا کام کیا ہے اور 'سرودھرم سمان' کی Policy کو Promote کیا ہے۔ ڈاکٹر رتیشور ناتھ تیواری نے کہا کہ داراشکوہ کا یہ ماننا تھا کہ انسانیت سب سے بڑی چیز ہے۔ تمام مذاہب کے مارگ الگ الگ ہیں مگر ان کی منزل ایک ہے۔ داراشکوہ نے ہندو مذہب اور دیگر مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان کے پیغامات کو فارسی زبان میں پیش کیا۔ داراشکوہ کی ادبی خدمات قابل قدر ہیں۔ وہ انسانیت پسند تھے۔ ڈاکٹر زاہدی نے داراشکوہ کے حالات زندگی اور ان کی کتابوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ داراشکوہ قادری فرقہ سے منسلک ہوئے اور ملا شاہ بدخشی سے مستفید ہوئے۔ ڈاکٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر داراشکوہ ہندوستان کا بادشاہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔ داراشکوہ نے اپنشد کے تراجم کر کے انھیں عام کیا۔ ہمیں داراشکوہ کو یاد کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد نے کہا کہ داراشکوہ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ اس کی فارسی ادب میں بہت خدمات ہیں۔ داراشکوہ نے فارسی زبان کا استعمال ایک پل کے طور پر کیا ہے۔ سکینۃ الاولیا اور سفینۃ الاولیا اس کی گراں قدر کتابیں ہیں۔ سفینۃ الاولیا کا خدابخش لائبریری میں ایسا نسخہ موجود ہے جس پر داراشکوہ کے دستخط ہیں۔ سر اکبر کے ذریعے داراشکوہ نے ڈائیلاگ کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ داراشکوہ اکبر کا Spritual successor تھا۔ داراشکوہ کے خیالات کو سمجھنے کی آج کے حالات میں سخت ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فضیل احمد قادری نے بھی اس موقعے پر داراشکوہ کے سلسلے میں اپنے خیالات رکھے۔ انھوں نے کہا کہ Interfaith understanding کے نمونے تیرہویں صدی عیسوی میں ملتے تھے۔ پروگرام کے آخر میں شری وملیندو نے داراشکوہ پر اپنی خوبصورت نظم پیش کی اور سامعین نے سوالات کیے جن کا مقررنے تشفی بخش جواب دیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 2023

تلنگانہ

اردو اور عربی زبان کے فروغ میں جنوبی ہند کا حصہ

حیدرآباد: صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی، بہادر پورہ، حیدرآباد کے زیراہتمام ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو و عربی زبان و ادب کے فروغ میں جنوبی ہند کا حصہ' کا

انعقاد عمل میں آیا۔ اس سمینار کی صدارت مولانا خلیل احمد ندوی نظامی، صدر صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے کی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں سوسائٹی کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ کلیدی خطبہ مولانا ڈاکٹر محمد عماد الدین، اسسٹنٹ پروفیسر، اے کے ایم کالج، ملحقہ عثمانیہ یونیورسٹی نے دیا۔ انھوں نے کہا کہ نظام حکومت میں بھاری قیمت پر صلاحیت مند افراد کو بیرون ملک سے طلب کیا گیا، عثمانیہ یونیورسٹی میں دارالترجمہ قائم کیا گیا، کئی عربی و فارسی کتابیں اردو میں نقل کی گئیں، دائرۃ المعارف جنوبی ہند کی ایک نایاب اکیڈمی ہے جس نے سیکڑوں کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح جنوبی ہند میں اردو و عربی کے فروغ پر بہت کام ہوا ہے۔ مولانا انوار اللہ خاں، ٹرسٹی فانوس ٹرسٹ، مولانا پروفیسر بشیر محی الدین صاحب موظف نظامیہ طبیہ کالج، مفتی ضیاء الدین نقشبندی، صدر مفتی و شیخ الفقہ، جامعہ نظامیہ، نے اس موقعے پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مفتی شرف عالم قاسمی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے مقالے میں اردو اور عربی ادب کے جنوبی ہند میں فروغ پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شمیم نظامی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، بردوان یونیورسٹی، بنگال، مولانا الیاس بن علی بن عثمان، مولانا کلیم قاسمی، سید سراج پاشاہ قادری، ڈاکٹر سعید بن مخاشم اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی، لکھنؤ، حافظ سید واحد علی۔ مولانا سید احمد غوری، استاذ جامعہ نظامیہ، حافظ محمد رفیق احمد لکچرار، شعبہ عربی' محمد عبدالمقتدر حسان، ڈاکٹر محمد عرفان محی الدین، اسسٹنٹ پروفیسر، سینٹ جوزف ڈگری کالج، محمد وسیم لکچرار صمدانی کالج، وغیرہ دیگر مقالہ نگارں میں شامل تھے۔ سمینار کے پہلے سیشن کی صدارت مولانا خلیل احمد ندوی نے کی۔ جبکہ دوسرے سیشن کی صدارت مولانا ڈاکٹر مفتی محمد ضیاء الدین نقشبندی صدر مفتی جامعہ نظامیہ نے کی۔ اس موقعے پر سمینار کے مقالوں پر مشتمل کتاب 'سمینار پروسیڈنگ' کا اجرا عمل میں آیا۔ جس میں تقریباً 37 مقالہ نگاروں کے مقالے شائع کیے گئے ہیں۔ سمینار کنوینر مولانا انور الدین صدیقی، صدر شعبہ اردو، ایم ایس کالج و نائب صدر صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی، ڈائرکٹر صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے کی۔ اظہار تشکر جناب تصدیق احمد صدیقی پرنسپل براعم ہائی اسکول نے کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی، ڈائرکٹر صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی،

حیدرآباد، تلنگانہ 25 مارچ 2023

عصر حاضر میں اردو ترجمہ نگاری: مسائل اور امکانات

حیدرآباد: یونیورسٹی آف حیدرآباد کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار بہ عنوان 'عصر حاضر میں اردو ترجمہ نگاری: مسائل اور امکانات' یونیورسٹی کیمپس کے ڈاکٹر ذاکر حسین آڈیٹوریم میں 6 اور 7 مارچ کو منعقد ہوا۔ پروفیسر حبیب نثار صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے شرکا کا استقبال کرتے ہوئے دکنی مثنویوں کی تاریخ اور ترجمے پر روشنی ڈالی اور واجد علی شاہ کی مثنویوں کا بھی ذکر کیا۔ پروفیسر فضل اللہ مکرم سرپرست سمینار و پروفیسر شعبہ اردو نے سمینار کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ترجمہ اہم شعبہ ہے جس سے اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر محمد کاشف نے سمینار کے مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ سمینار مقصدی ہے اس سے اساتذہ و اسکالرز اور اردو ادب کے طلبا کو بیش قیمت معلومات حاصل ہوں گی۔ افتتاحی خطبہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر آر ایس راجو نے دیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ ایک کثیر لسانی ملک ہے۔ قومی اور علاقائی بھاشاؤں کی وجہ سے یہاں کی تہذیب و ثقافت بھی توانا اور مضبوط ہے۔ مختلف ریاستوں کی زبانوں میں تال میل ہونا ضروری ہے اور ان میں ترجمہ کا عمل ہوتا رہا تو بہت سے انکشافات اور معلومات سامنے آسکتی ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ ہندوستان کے مختلف اداروں میں سنسکرت فارسی ہندی سے اردو میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ وہ دونوں زبانوں پر عبور حاصل کرے۔ دور قدیم میں اصطلاحات سازی پر کام ہوا تھا اب زبانیں نئی اصطلاحات سے معمور ہیں ان کے قابل قبول تراجم دوسری زبانوں میں ہونے چاہئیں۔ ثقیل اور ثقہ الفاظ کی تمیز ہونی چاہیے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک ڈین انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس جموں یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو میں ترجمے کی صورتحال پہلے جیسی نہیں ملتی۔ پھر بھی شعوری کوشش ہو رہی ہے۔ کشمیر میں رنبیر سنگھ کا قائم کردہ دارالترجمہ موجود ہے۔ جس میں ڈوگری اور دیگر کشمیری زبانوں سے اردو تراجم ہو رہے ہیں۔ پروفیسر ارجمند آرا شعبہ اردو یونیورسٹی آف دہلی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے کے لیے شوق و جذبہ ہونا چاہیے۔ ترجمے سے علم کی ترسیل ہوتی ہے۔ مترجم کو مصنف کے قالب میں اتر جانا چاہیے۔

پروفیسر رحمت یوسف زئی سابق صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ترجمہ دو دلوں کے درمیان رشتہ بھی ہے اس افتتاحی اجلاس کی نظامت ریسرچ اسکالر محمد خوشتر نے کی اور کلمات تشکر ڈاکٹر نشاط احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو نے ادا کیے۔

دو روزہ قومی سمینار کے پہلے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر امان اللہ شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی نے تمل سے اردو میں ترجمہ شدہ کتب پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے مضمون ہندوستان میں مشینی ترجمہ ایک جائزہ پیش کیا۔ صدارتی کلمات پروفیسر اشرف رفیع اور پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے ادا کیے۔ اس اجلاس کی نظامت شعبہ کی اسکالر اسما امروز نے انجام دی اور اظہار تشکر بھی پیش کیا۔

دو روزہ قومی سمینار کا تیسرا اجلاس پروفیسر عبدالحمید اکبر صدر شعبہ اردو خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی گلبرگہ اور پروفیسر سید جمال محمد سابق پرنسپل یوٹی آرسی آئی ایل سوسلن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمد فہیم الدین احمد مانو نے علمی ترجمہ: بنیادی ماخذ، ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے وضع اصطلاحات: مسائل اور امکانات، ڈاکٹر ابو شہیم خان مانو نے کلام نظیر کے انگریزی تراجم، ڈاکٹر ارشاد احمد خان صدر شعبہ اردو این ایس بی کالج ناندیڑ ڈاکٹر نور الامین صدر شعبہ اردو شارا مہاودیالیہ پربھنی نے گوگل ترجمہ اور احتیاط، محمد مصطفیٰ علی سروری مانو نے صحافتی تراجم مسائل اور امکانات، ڈاکٹر رونق عبدالرحمٰن رئیس صدر شعبہ بی این این کالج یونیورسٹی آف بمبئی نے ترجمہ اور روزگار کے مواقع پر پر مغز مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت محمد کفیل نے کی اور شکریہ بھی ادا کیا۔ چوتھا اجلاس ڈاکٹر معید جاوید سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور پروفیسر عبدالرب استاد صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کی صدرات میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شکیلہ گوری خان دھارواڑ کرناٹک نے ڈاکٹر ماہر منصور کی ترجمہ نگاری، ڈاکٹر طیب خرادی نے حضرت سلمان فارسی کے تراجم قرآنی، سورہ فاتحہ ایک جائزہ، ڈاکٹر انوپ پول صدر شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی نے فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس میں ترجمے کے کام، ڈاکٹر عظمت اللہ ایم وی ایس گورنمنٹ کالج محبوب نگر نے تلگو ناول کا

ترجمہ ایک جائزہ، ڈاکٹر حمیرہ تسلیم نے منظوم اردو تراجم ایک جائزہ، ڈاکٹر شمس الدین نے ترجمہ کی اہمیت، اے شبیر پاشانے شائستہ فاخری کے اردو تراجم، ڈاکٹر محمد سمیع الدین بیجا پور نے ترجمہ نگاری کی اہمیت کے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت نیہا نورین نے انجام دی۔

سمینار کا پانچواں اجلاس پروفیسر قاسم علی اور پروفیسر سید سجاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے پہلے مقالہ نگار ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز تھے۔ انھوں نے طبی تراجم اور وضع اصطلاحات پر معلوماتی مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کے دیگر مقالہ نگار ڈاکٹر امتیاز احمد ڈاکٹر موسیٰ اقبال (اردو ترجمہ کی اقسام) ڈاکٹر محمد عبدالقوی (عصر حاضر میں اردو ترجمہ کی تہذیبی اہمیت عالمی تناظر میں)، ڈاکٹر مصباح انظر (ٹی وی ترجمہ نگاری اور صحافتی تراجم) موضوعات پر مقالے پیش کیے۔

سمینار کا چھٹا اجلاس پروفیسر سجاد حسین یونیورسٹی آف مدراس اور پروفیسر ارجمند آرا دہلی یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمود کاظمی مانو نے شعری ترجموں میں ہئیت کے مسائل' کہکشاں لطیف نے 'ترجمے کے اصول و نظریات'، ڈاکٹر گل رعنا نے تراجم کے حوالے سے 'ترجمہ نگاروں کی خدمات' پروفیسر نکولس نے 'کیرالا میں اردو تراجم'، پروفیسر لطیف نے 'مذہبی تراجم کے موضوعات' پر مقالے پیش کیے۔

سمینار کا ساتواں اجلاس پروفیسر نسیم الدین فریس اور پروفیسر کے وی نکولن سابق صدر شعبہ اردو کیرالا یونیورسٹی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر قاری نصیر الدین منشاوی نے 'ترجمہ کا فن'، عبدالرحمٰن داؤدی نے 'اردو اور تلگو کا ادبی رشتہ ترجمے کے حوالے سے' ڈاکٹر محمد یاسر نے 'تمل ناڈو فورٹ سینٹ جارج کالج کی خدمات تراجم کے حوالے سے'، محمد سیفی عمری نے 'جامعہ دارالسلام عمر آباد کی ترجمہ نگاری'، ڈاکٹر اسلم پرویز مانو نے 'اردو میں ترجمہ کی روایت اور موجودہ صورتحال مانو کے حوالے سے'، ڈاکٹر محمد سعید الدین وانم باڑی نے 'اردو ترجمے کے فروغ میں انیسویں صدی کے اداروں کی خدمات کا ایک تاریخی جائزہ'، ڈاکٹر سید سیف اللہ اسسٹنٹ پروفیسر اردو گورنمنٹ ڈگری کالج برائے اناث نلگنڈہ نے 'اردو میں علمی و سائنسی ترجمے کی روایات اور امکانات'، سردار ساحل کڈپہ نے 'اردو ترجمہ نگاری میں دارالترجمہ کا مقام'، ڈاکٹر میمونہ بیگم اسسٹنٹ پروفیسر اردو گورنمنٹ ڈگری کالج چینچل گوڑہ حیدر آباد نے 'ترجمے کے مسائل'، ڈاکٹر رضوانہ بیگم صدر شعبہ اردو گورنمنٹ سٹی کالج حیدر آباد نے 'ترجمے کی اہمیت اور ضرورت کے موضوعات' پر مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض قمر احمد نے انجام دیے۔

سمینار میں ریسرچ اسکالرز کے لیے متوازی سیشن کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ڈاکٹر شوکت حیات سابق پروفیسر ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدر آباد اور ڈاکٹر محمد ناظم علی سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نے انجام دی۔ ڈاکٹر عرشیہ جبین شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدر آباد نے بھی اس اجلاس کی نگرانی کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عتیق اجمل نے 'فن ترجمہ نگاری'، محمد شاکر نے 'ڈاکٹر رؤف خیر کی ترجمہ نگاری'، شبلی آزاد مانو نے 'قدیم داستانیں ترجمہ یا ماخوذ'، جاوید رسول نے 'عصر حاضر میں اردو ترجمہ نگاری اہمیت مسائل اور امکانات'، اعجاز احمد مانو نے 'فورٹ سینٹ جارج کالج اور ترجمہ نگاری'، نیہا نورین نے 'مشینی ترجمہ فوائد اور حل'، شرمین گھامڑ نلگنڈوی کا 'اردو ترجمہ لوکا گیتا لو'، قاسم بدر نے 'تراجم کے میدان میں سر سید احمد خان کی خدمات'، گلنار خاتون نے 'امجد حیدر آبادی کی ترجمہ نگاری گلستان امجد کے حوالے سے' شاہ میر عرفات سرکاری و نجی اداروں میں اردو تراجم کے موضوعات پر مقالے پیش کیے اس اجلاس کی نظامت عرفات نے کی۔

اختتامی اجلاس میں ڈاکٹر محمد ناظم علی، ڈاکٹر محمد شوکت حیات، ارجمند آرا، پروفیسر جمالی، پروفیسر ایس اے شکور، ڈاکٹر محمد کاشف، پروفیسر فضل اللہ مکرم نے دوروزہ قومی سمینار کے مباحث اور نتائج اور امکانات کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے کہا کہ اس سمینار میں سو مقالے پیش کیے گئے جو کسی اور سمینار میں نہیں پیش ہوئے۔ سمینار میں جیسا ماحول نظر آیا۔ ہر اعتبار سے یہ ایک کامیاب سمینار رہا۔ اس سمینار کی کامیابی کے لیے شعبہ اردو کا تدریسی و غیر تدریسی عملہ قابل مبارکباد ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب منظر نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: محمد ناظم علی، حیدر آباد، 11 مارچ 2023

تمل ناڈو

این سی پی یو ایل اور سی عبدالحکیم کالج میل وشارم کے زیر اہتمام ڈپلوما کورس کا جلسہ تقسیم اسناد

میل وشارم: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی کے اسٹڈی سنٹر سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم کا جلسہ تقسیم اسناد، گیارہ بجے شروع ہوا۔ اسٹڈی سنٹر کے سینئر استاذ

جے اشہد نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ شعبہ اردو کے صدر اور ان کورس کے کوآرڈینٹر ڈاکٹر ایس محمد یاسر نے پیش کیے۔ افتتاحی کلمات میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس اے ساجد نے سند حاصل کرنے والے طلبا کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے، طلبا کو نصیحت کی کہ زبانوں کا سیکھنا اور ان میں مہارت حاصل کرنا طلبا کے لیے کافی مفید ثابت ہوتا ہے اور یہ ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے، ملازمتوں میں ترجیح یا ترقی میں ان کا اہم کردار ہوا کرتا ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ (ریجنل ڈائرکٹر، مانو یونیورسٹی، ریجنل سنٹر، بنگلور) نے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر یاسر اور کالج کے مینجمنٹ کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ، این سی پی یو ایل کے ان کورس میں طلبا کی اتنی بڑی تعداد قابل تعریف اور قابل قدر ہے اور اتنی بڑی تعداد بہت کم جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مزید کہا کہ زبان کا تعلق کسی مذہب یا علاقہ سے نہیں ہے، اردو کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کا سیکھنا، عربی اور فارسی ممالک میں تعلیم اور ملازمتوں کے میدان میں بہت سارے مواقع کے دروازے کھولتا ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ طلبا صرف کسی ایک ڈگری پر اکتفا نہ کریں، وہ فاصلاتی نظام اور ڈپلوما کورس میں داخلہ لے کر اپنے اندر صلاحیتیں اور مہارتیں پیدا کرتے ہوئے ملک و ملت اور قوم و سماج کے لیے مفید ثابت ہوں۔ NSSO کی اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر، چینئی امیلیا بلسی نے سرکاری شعبوں اور مختلف محکموں میں ملازمتوں کے لیے زبانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آج کے مسابقتی دور میں ہر ایک سے مختلف نظر آنا اور اپنے اندر مختلف صلاحیتوں اور مہارتوں کا پیدا کرنا ضروری اور لازم ہے۔ طلبا میں مختلف صلاحیتیں ہوتی ہیں، ضرورت ہے کہ اس کی شناخت کریں، پھر اس کے مطابق مقاصد متعین کرلیں، اس کے حصول کے لیے جدوجہد اور کوشش کریں، یقین کریں کہ منزل آپ کے روبرو ہوگی اور کامیاب ہوں گے۔ اس کے بعد مہمانوں کے ہاتھوں طلبا میں اسناد تقسیم کی گئیں۔ یاد رہے کہ این سی پی یو یل کے ان کورس میں تقریباً 584 طلبا و طالبات کے مابین اسناد تقسیم کیے گئے۔ قبل ازیں پرنسپل کے ہاتھوں اس کورس میں خدمت

انجام دینے والے اردو، فارسی اور عربی اساتذہ کی بھی شال پوشی کی گئی، جن کی محنتوں سے یہ اجلاس کامیابی کو پہنچا، اجلاس کی صدارت جناب ایس زیڈ ابرار احمد صاحب سکریٹری وکرسپانڈنٹ، سی عبدالحکیم کالج (خود مختار)، میل وشارم نے کی۔ نظامت کے فرائض محمد سیفی عمری اور احتشام الحق نے انجام دیے۔ اجلاس کا اختتام ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری کے ہدیہ تشکر پر ہوا۔ بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبا، عمائدین شہر اور مہمانان اس اجلاس میں شریک رہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، میل وشارم، 12 مارچ 2023

جموں و کشمیر

قومی غالب سمینار

کشمیر: 20 اور 21 مارچ کو کشمیر یونیورسٹی میں دو روزہ قومی غالب سمینار کا انعقاد ہوا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی

دہلی کے زیر اہتمام، وزارتِ ثقافت، حکومت ہند کے تعاون اور نظامت فاصلاتی تعلیم جامعہ کشمیر کے اشتراک سے دوروزہ قومی غالب سمینار بعنوان 'غالب اور جشنِ زندگی' کا افتتاح کشمیر یونیورسٹی کے معروف گاندھی بھون آڈیٹوریم میں ہوا تھا۔ افتتاحی اجلاس میں پروفیسر فاروق احمد مسعودی (ڈین، علمی امور، جامعہ کشمیر)، پروفیسر محمد زماں آزردہ (معروف اردو ادیب اور استاد)، پروفیسر طارق احمد چشتی (ناظم، نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر)، ڈاکٹر ادریس احمد (ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی) کے علاوہ یونیورسٹی اور بیرون یونیورسٹی کے معروف اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پروفیسر طارق احمد چشتی نے سب سے پہلے اپنا خطبہ استقبالیہ پیش کرکے تمام مہمانان اور دوسرے شرکا کا استقبال کیا۔ استقبالیہ کے بعد نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر سے شائع ہونے والے (یوجی سی کیرلسٹ میں شامل) سالانہ تحقیقی و تنقیدی مجلّے 'ترسیل' اور شعبۂ تعلیم و تربیت، نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر سے شائع ہونے والے سالانہ تحقیقی وتنقیدی مجلّے 'کمیونیکیشن' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور اپنے عالمانہ خیالات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس افتتاحی نشست کی صدارت کے فرائض پروفیسر فاروق احمد مسعودی نے انجام دیے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں اس سمینار کی اہمیت اور ضرورت سے متعلق اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا اور منتظمین سمینار کو مبارک باد پیش کی۔ آخر میں ڈاکٹر ادریس احمد نے غالب انسٹی ٹیوٹ اور نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے تمام مقتدر شخصیات، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز، طلبہ وطالبات اور دوسرے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست کی نظامت ڈاکٹر الطاف انجم نے انجام دی تھی۔

افتتاحی نشست کے اختتام کے فوراً بعد مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مشاعرے میں ریاست سے تعلق رہنے والے صفِ اول کے شعرا کے ساتھ ساتھ کئی ایک نو آموز شعرا نے بھی شرکت کرکے سامعین کو اپنے تازہ کلام سے بہرہ مند فرمایا۔ سمینار کے پہلے دن کا اختتام مجلس شامِ غزل سے ہوا۔ شامِ غزل کی اس مجلس میں وادی کے معروف گلوکار جناب کفایت فہیم نے مرزا اسداللہ غالب کی متعدد غزلیں اپنے منفرد انداز میں گا کر حاضرین و ناظرین کو مسحور کیا۔

21 مارچ 'غالب اور جشنِ زندگی' کے عنوان سے پہلا تکنیکی اجلاس نظامت فاصلاتی تعلیم کے سمینار ہال میں ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر الطاف انجم نے کی۔ ڈاکٹر الطاف انجم کے علاوہ ایوان صدارت میں ڈاکٹر ادریس احمد اور پروفیسر طارق احمد چشتی بھی شامل رہے۔ پہلے اجلاس میں کل پانچ تحقیقی مقالے پیش کیے گئے جن میں غالب اور اقبال کا شعور حیات: اشتراک و افتراق (ڈاکٹر محمد یونس ٹھوکر)، غالب اور میر کا تصورِ غم (ڈاکٹر محمد اقبال افروز)، غالب کا معشوق: انفرادیت اور مماثلت (ڈاکٹر نصرت جبین)، غالب کا فلسفہ حیات، خدا، کائنات اور انسان کے حوالے سے (ڈاکٹر کوثر رسول)، غالب کا وطیرہ زندگی (ڈاکٹر محی الدین زور) شامل ہیں۔

دوسری تکنیکی نشست میں پروفیسر نذیر احمد ملک بحیثیت صدر موجود رہے۔ اس نشست میں ڈاکٹر توصیف احمد نے 'غالب اور غمِ روزگار'، ڈاکٹر مسرت گیلانی نے 'غالب اور غم روزگار'، ڈاکٹر امتیاز احمد تانترے نے 'غالب: اظہارِ ذات میں تجرید کی تجسیم' اور ڈاکٹر محمد یوسف وانی نے 'غالب کی شاعری میں رقیب: تصور، استعمال اور تعلق' کے عناوین سے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ اختتامِ نشست پر پہلے ڈاکٹر شفیع سنبلی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور آخر میں پروفیسر نذیر احمد ملک نے اپنا صدارتی خطاب پیش کیا، جس میں آپ نے غالب کی حیات وشخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی مقالہ نگاروں کی بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔

ظہرانے کے بعد سمینار کی تیسری تکنیکی نشست کا آغاز پروفیسر شفیقہ پروین کی زیرِ صدارت ہوا۔ اس نشست میں جناب سہیل سالم، محترمہ مصروفہ قادر اور ڈاکٹر ریاض احمد کمار نے غالب اور جشن زندگی کے موضوع کی مناسبت سے اپنے مقالات پیش کیے۔ مقالات کی پیشکش کے اختتام پر پروفیسر شفیقہ پروین نے اپنا صدارتی خطبہ پیش کیا۔

سمینار کی چوتھی اور آخری تکنیکی نشست میں بھی دو تحقیقی مقالات سامعین کی نذر کیے گئے۔ ڈاکٹر اسما بدر نے 'غالب کی آشفتہ بیانی: چند بنیادی پہلو' اور ڈاکٹر الطاف انجم نے 'ہوا ہے شہ کا مصاحب (کلام غالب کا نو تاریخی جائزہ)' جیسے موضوعات پر اپنے مقالات پیش کیے۔ اس آخری نشست کی صدارت پروفیسر جوہر قدوسی نے انجام دی۔ قدوسی صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں موضوع سمینار کی اہمیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقالہ نگاروں اور منتظمین سمینار کو مبارک بادی پیش کی۔

دوسرے روز کے آخر میں مقالہ نگاروں اور شرکا میں اسناد کی تقسیم کی گئیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ڈاکٹر مضطر رضا نے تمام سامعین و ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، 22 مارچ 2023

شعر کی تفہیم و تحسین

جموں: شعبۂ اردو، جموں یونی ورسٹی کے زیر اہتمام توسیعی خطبہ بعنوان 'شعر کی تفہیم و تحسین' 20 مارچ کو بمقام پروفیسر گیان چند جین سمینار ہال میں منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی پروفیسر شہاب ظفر اعظمی صدر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، نے اپنے پر مغز لیکچر میں شعر کی تفہیم و تحسین کے متعلق طلبا کو روشناس کرایا۔ ایک اچھا شعر کیسے وجود میں آتا ہے، شاعری میں شعری Tools کا استعمال کس طریقے سے کیا جاتا ہے اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے

کہا کہ دو چیزوں کو پیش نظر رکھ کر آپ شعر کا تعین قدر کرسکتے ہیں۔قوتِ متخیلہ (Power of imagination)، قوتِ متمیزہ (Power of Choice)۔ پروفیسر موصوف نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شعر اگر صرف ایک معنی بیان کرتا ہے تو وہ اچھا شعر نہیں ہے۔ بلکہ شعر میں معنی کی تہہ داری ہونی چاہیے۔شارح جب بھی کسی شعر کی شرح کرتے ہیں تو وہ اپنے ذہن وفکر کے مطابق شعر کی تفہیم کرتے ہیں اور اس کے معنی کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس حوالے سے انھوں نے غالب، میر، انیس، دبیر، آتش، چکبست، ممنون، شہریار وغیرہ کے اشعار بطورِ حوالہ پیش کیے۔ ریسرچ اسکالرس اور طلبا نے سوالات بھی کیے جن کے پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے اطمینان بخش جوابات دیے۔

اجلاس کی شروعات میں پروفیسر محمد ریاض احمد صدر شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی نے پٹنہ سے آئے ہوئے مہمان کا استقبال کیا اور موضوع سے متعلق چند تعارفی کلمات بھی پیش کیے، آخر میں ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ اس موقعے پر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ اور طلبا وطالبات، ریسرچ اسکالرس ودیگر سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز: شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، 20 مارچ 2023

چھتیس گڑھ

شام اردو

سکما: چھتیس گڑھ اردو اکادمی کی جانب سے سکما میں شام اردو پروگرام منعقد کیا گیا۔ اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے کیے جارہے اقدامات میں سے یہ اکادمی کا بہترین پروگرام تھا۔ پروگرام کی صدارت چھتیس گڑھ اردو اکادمی کے صدر ادریس گاندھی صاحب نے کی۔ نظامت کے فرائض جناب نصیب خان چھندگڑھ نے انجام دیے۔ جناب مرزا شاد بلاسپوری درگ، آشیش تنہا، جناب عرفان الدین رائے پور، پرینکا مشر، سریتا سروج اور ہرش راج ہرش نے سامعین کو اپنا خوب صورت کلام سنا کر اردو زبان کی شیرینی کا سکہ جما دیا۔ ساتھ ہی ساتھ شام اردو پروگرام میں چھتیس گڑھ اردو اکادمی کے صدر نے اپنا نہایت سلجھا ہوا خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر خوشی کا اظہار بھی کیا کہ چھتیس گڑھ کے اس دور دراز پچھڑے علاقے تک اردو کو پہنچانے کا موقع ملا۔ پسماندہ ہونے کے باوجود یہاں کے لوگوں میں اردو کے لیے شوق وجذبہ دکھائی دیتا ہے۔ انشاء اللہ آنے والے وقت میں سکما میں لائبریری کمپیوٹر سنٹر کے قیام کی کوشش

کی جائے گی۔ اس موقعے پر اردو کو فروغ دینے والی کتابوں کی تقسیم اور اجرا کرتے ہوئے وزیر اعظم کے 15 نکاتی منصوبے اور ریاستی حکومت کی اسکیموں سے متعلق کتابیں تقسیم کی گئیں۔ روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 16 مارچ 2023

مہاراشٹر

اردو ادب میں نئے رجحانات

پربھنی: ادارہ ادب اسلامی ہند مہاراشٹر کی دو روزہ سالانہ کانفرنس 'اردو ادب میں نئے رجحانات: آزادی کے بعد' کے عنوان سے 18 تا 19 مارچ 2023 کو روبی فنکشن ہال

پربھنی میں منعقد ہوئی۔ مدیر پیش رفت ڈاکٹر حسن رضا صدر ادارہ ادب اسلامی ہند دہلی نے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ عبدالجلیل نمائندہ حلقہ مہاراشٹر جماعت اسلامی، مشہور شاعر تابش مہدی دہلی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز ممبئی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک رہے۔ پروفیسر مقبول احمد مقبول صدر ادارہ ادبِ اسلامی مہاراشٹر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور ادارے کی خدمات اور سمینار کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ اس سال کا 'حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شعری خدمات' جاوید ندیم ممبئی کو اور 'عصمت جاوید ایوارڈ برائے نثری خدمات' پروفیسر یحیٰ جمیل امراوتی کو دیا گیا۔ ایوارڈ تیس ہزار روپے نقد مومنٹو، شال اور سپاس نامے پر مشتمل تھا۔ سکریٹری ادارہ غلام فرید نے ایوارڈ یافتگان کا تعارف پیش کیا۔ ادارے کی جانب سے مطبوعہ بشیر احمد راہی، جالنہ کے شعری مجموعے 'رہگزر' کا اجرا بھی مہمانوں کے ہاتھوں ہوا۔

پروفیسر یحیٰ جمیل نے ایوارڈ حاصل ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ جاوید ندیم نے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حفیظ میرٹھی ایوارڈ ان کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بشیر احمد راہی نے ادارے کی جانب سے ان کے مجموعے کی اشاعت پر ادارے کا شکریہ ادا کیا۔ صدر اجلاس ڈاکٹر حسن رضا نے ادارہ ادب اسلامی کے قیام کے اغراض ومقاصد اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ پہلے اجلاس کی نظامت غلام فرید نے کی اور ابراہیم خان شوق نے شکریہ ادا کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر حمید اللہ خان سابق صدر شعبہ اردو گیان اپاسک کالج پربھنی نے کی۔ اس اجلاس میں اردو غزل میں سیاسی عناصر، اردو ناول میں تقسیم ہند کا درد، اردو ادب میں تجریدی افسانے کا رجحان، مختلف ناموں سے لکھی جانے والی صنف افسانچہ کے عناوین سے بالترتیب ڈاکٹر پٹھان ناظمہ پربھنی، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز ممبئی، پروفیسر یحیٰ جمیل امراوتی، ڈاکٹر عظیم راہی اورنگ آباد نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر حمید اللہ خان صدر اجلاس نے اپنے صدارتی خطاب میں تمام مقالوں کا جائزہ لیا اور کہا کہ ہر مقالہ نگار نے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے اور سب نے بہترین مقالے لکھے ہیں۔ اس اجلاس کی نظامت ارشاد ضیا نے کی۔ تیسرا اجلاس معتبر شاعر جناب رؤف خیر حیدر آباد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر گنیش گائکواڑ، ڈاکٹر احرار اعظمی ممبئی نے بالترتیب اردو غزل کا بدلتا منظرنامہ، اردو شاعری میں ہندی الفاظ کے استعمال کا رجحان، اردو ادب میں نئی اور تجرباتی اصناف کا رجحان کے عناوین سے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر دانش غنی کی عدم موجودگی میں ان کا مقالہ 'جدید شعری روایت تسلسل اور انحراف' غلام فرید نے پڑھا۔ صدر اجلاس نے تمام مقالوں پر دلچسپ انداز میں سیر حاصل تبصرہ کیا اور کچھ مشورے بھی دیے۔ اس اجلاس کی نظامت عبدالمنان عظیم نے کی۔

19 مارچ کانفرنس کے دوسرے دن چوتھا اجلاس ایم آئی شیخ ریٹائرڈ ڈی وائی ایس پی لاتور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس مراٹھی اور ہندی ادب کے حوالے سے تھا۔ جس میں پروفیسر بلی رام بھکترے اودگیر، پروفیسر ظہر الدین پٹھان عمری ناندیڑ، پروفیسر کیرتی کمار مورے گنگا کھیڑ، پروفیسر پربھاکر ہرکڑ پربھنی نے ہندی فکشن میں نئے رجحانات آزادی کے بعد، ہندی شاعری میں نئے رجحانات آزادی کے بعد، مراٹھی شاعری میں نئے رجحانات آزادی کے بعد، مراٹھی فکشن میں نئے رجحانات آزادی کے بعد کے عنوانات سے مقالے پیش

کیے۔ مراٹھی مقالوں کو بھی شرکائے اجلاس نے بڑی دل جمعی کے ساتھ سماعت فرمایا۔ صدر اجلاس نے بہترین تبصرہ کیا۔ اجلاس کی نظامت غلام فرید نے کی۔

پانچواں اجلاس ڈاکٹر سلیم محی الدین پربھنی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں معین الدین عثمانی جلگاؤں، پروفیسر مقبول سلیم نیکنور، ڈاکٹر ابواسامہ مالیگاؤں نے اردو افسانہ اور بیانیہ کی روایت کا بدلتا منظر نامہ، اردو شاعری پر تقسیم ہند کے اثرات اور 'اردو فکشن اور ادب اسلامی' کے عنوانات سے اپنے مقالے پیش کیے۔ صدر اجلاس نے صدارتی خطاب میں مقالوں پر تبصرہ کیا۔ نظامت شاکر خان نے کی۔

چھٹے اجلاس کے صدور ڈاکٹر حسن رضا اور پروفیسر مقبول احمد مقبول تھے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے 'اردو شاعری اور ادب اسلامی' ڈاکٹر حمید اللہ خاں نے 'اردو افسانے پر تقسیم ہند کے اثرات' ڈاکٹر رؤف خیر نے 'آزاد غزل: کامیاب تجربہ یا ناکام تجربہ' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر مقبول احمد مقبول نے مقالوں کا بھرپور جائزہ لیا۔ ڈاکٹر حسن رضا نے پوری کانفرنس پر مجموعی طور پر تبصرہ کیا اور ادارہ ادب اسلامی مہاراشٹر کی ستائش میں کہا کہ انھیں ادارے کی سرگرمیوں پر فخر ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ادارے کو کچھ مفید مشورے بھی دیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نہ صرف خواتین قلمکاروں کو بھرپور نمائندگی دینی چاہیے بلکہ انھیں بھی ایوارڈ دیا جانا چاہیے۔ اس اجلاس کی نظامت محمد اکبر نے کی اور پروفیسر عظیم الدین نے تمام مہمانوں، مقالہ نگاروں، شرکا اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ ہر اجلاس کے اختتام پر سوال جواب کا وقفہ بھی رکھا گیا تھا جن میں شرکا نے ہر مقالہ نگار سے سوالات کیے اور مقالہ نگاروں نے ان کے جوابات دیے۔ اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بڑی تعداد میں خواتین و اساتذہ نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز: غلام فرید سیکریٹری ادارہ ادب اسلامی ہند حلقہ مہاراشٹر، 22 مارچ 2023

اعزاز و اکرام

صولت پبلک لائبریری میں قلمکاروں کا اعزاز

رامپور: آج تک یہی سنتے آئے تھے کہ گھر کی مرغی دال برابر لیکن صولت پبلک لائبریری کے صدر ڈاکٹر محمود علی خاں، سکریٹری عدنان ضیائی اور مجلس مشاورت کے ممبران نے اس روایت کو توڑ دیا اور اتر پردیش اردو اکیڈمی سے رامپور کے آٹھ مصنفوں کو انعامات سے نوازے

جانے پر اعزاز و ورق نمائی کا جلسہ منعقد کر کے ان کی پذیرائی کی۔ مقررین نے امید ظاہر کی کہ صولت پبلک لائبریری آئندہ بھی اردو کی ترقی اور اردو کی خدمت کرنے والوں کی اسی طرح حوصلہ افزائی کرتی رہے گی۔ ڈھائی گھنٹہ تک چلے جلسہ اعزاز میں مقبول شاعر و انجینئر شکیل غوث نے انتہائی خوبصورت انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جلسے کے آغاز میں انڈیا ریڈیو کی کمپیئر ڈاکٹر رباب انجم نے رامپور کے ادب اور تہذیب کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اردو اکیڈمی سے انعام حاصل کرنے والے قلمکاروں پر ڈاکٹر ظہیر رحمتی، ڈاکٹر شعیب رضا اور شہپر شریف نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس مرتبہ اتر پردیش اردو اکیڈمی نے رامپور کے آٹھ قلمکاروں کو ان کی تصانیف اور تالیف پر انعامات سے نوازا ہے جو فخر کی بات ہے۔ ان میں طالب رامپوری، ڈاکٹر یوسف رامپوری، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، پروفیسر ممتاز عرشی، ڈاکٹر ارشاد ندوی، اختر حمید، شہپر شریف اور محترمہ نصرت شمسی کے نام شامل ہیں۔ طالب رامپوری اپنی مصروفیت کے سبب جلسے میں شامل نہیں ہو سکے۔ ان کی غیر موجودگی میں نشان امتیاز اور شال نعیم نجمی کو دی گئی۔ باقی سات قلمکار موجود تھے جن کو شال اوڑھا کر اور صولت پبلک لائبریری کا نشان امتیاز دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔ آٹھ انعام یافتہ قلمکاروں کے اعزاز میں جلسہ اعزاز و ورق نمائی میں کلیدی خطبہ پروفیسر شریف احمد قریشی نے پیش کرتے ہوئے کہا کہ صولت پبلک لائبریری کے صدر ڈاکٹر محمود علی خاں، سکریٹری، عدنان ضیائی اور مجلس مشاورت کے اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اجتماعی جلسہ دستار بندی اور اجتماعی شادیوں کی طرح اجتماعی اعزازات کا اہتمام کیا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے بتایا کہ ڈاکٹر ممتاز عرشی ان خوش نصیب قلمکاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک باوقار، علمی گھرانے میں اپنی آنکھیں کھولیں، ممتاز عرشی کی 'عطیہ شبلی' نامی کتاب کو اردو اکیڈمی نے انعامات کے لیے منتخب کیا ہے، اکبر علی خاں عرشی زادہ نے علامہ شبلی نعمانی کی فارسی غزلیات کا منظوم ترجمہ نہایت خوبی سے کیا تھا جسے ڈاکٹر ممتاز عرشی نے محنت سے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر یوسف رامپوری عہد حاضر کے ایک بے لاگ، دیانت دار، محتاط، غیر جانبدار، محقق و نقاد، مبصر اور تجزیہ نگار ہیں۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ کتاب 'اردو عربی کے اہم قصیدہ گو شعرا' کا شمار ان کی اعلیٰ درجہ کی تحقیقی کتب میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی کے بارے میں بتایا کہ وہ شاعر کے علاوہ محقق، نقاد، مبصر، مضمون نویس اور مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں قلم بند کی گئی 'خودنوشت سوانح عمری شیخ علی حزیں لاہجی' کو ترجمہ کر کے نہایت چابک دستی سے اردو میں منتقل کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے جسے اردو اکیڈمی نے انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ نصرت شمسی نے ناولوں، ناولٹوں، افسانوں، افسانچوں کے علاوہ مضامین و مقالات اور سنجیدہ و مزاحیہ انشائیے بھی قلم بند کیے ہیں وہ دینی و ادبی تقریبات اور سمیناروں میں اپنے خیالات کا اظہار بخوبی کرتی ہیں۔ وہ بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھ چکی ہیں، اس بار اردو اکادمی نے ان کی تصنیف 'پناہ گاہ' کو انعام کے لیے منتخب کیا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی اپنی کتاب 'احتساب فن' کو بھی اتر پردیش اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا ہے۔ آخر میں صولت پبلک لائبریری کے صدر ڈاکٹر محمود علی خاں نے مہمان خصوصی ڈاکٹر حسن احمد نظامی، ریٹائرڈ ڈسرکٹ جج تنویر وصفی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2023

پروفیسر اسلم جمشید پوری

میرٹھ: ''قومی ایوارڈ کے لیے پروفیسر اسلم جمشید پوری کا

انتخاب ادب کا انتخاب ہے۔انھوں نے اردو ادب کے فروغ کے لیے بڑی جدو جہد کی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ٹاٹا اسٹیل فاؤنڈیشن نے ایوارڈ دینے کے لیے بہترین نام کا انتخاب کیا ہے۔یہ الفاظ تھے عالمی شہرت یافتہ شاعر اور منفرد ادیب پروفیسر وسیم بریلوی کے جو 14 مارچ 2023 کو ٹاٹا اسٹیل جمشید پور کے نیشنل مشاعرہ کی اپنی صدارتی تقریر میں ادا کر رہے تھے۔

ٹاٹا اسٹیل جمشید پور کا یہ تاریخی مشاعرہ کئی اعتبار سے نہایت اہمت کا حامل ہے۔اس مشاعرے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے شعرا و ادبا بھی حصہ لیتے ہیں۔مشاعرے میں مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر انجلی گپتا (شیخ الجامعہ جھارکھنڈ ویمنس یونیورسٹی) نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض معروف ناظم معین شاداب نے ادا کیے۔

مشاعرے کے دوران پروفیسر اسلم جمشید پوری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر انجلی گپتا اور ٹاٹا اسٹیل کمپنی کے کارکنان کے ذریعے ایوارڈ پیش کیا گیا۔

اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر انجلی گپتا نے کہا کہ جمشید پور کی سرزمین سے دیا جانے والا یہ ایوارڈ حقیقت میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کی نمایاں ادبی خدمات کو واضح کرتا ہے اور ہمیں یہ ایوارڈ دیتے فخر کا احساس ہو رہا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی آپ اسی جانفشانی سے ادبی خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

واضح ہو کہ پروفیسر اسلم جمشید پوری شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے صدر شعبہ بہترین ناقد، محقق اور ممتاز فکشن نگار ہیں اور آپ بہت سی ادبی انجمنوں، تنظیموں کے رکن اور سرپرست کے طور پر سماجی و تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔مختلف اکادمیوں کے علاوہ بہت سی تنظیمیں اور ادارے آپ کو ایوارڈ سے نواز چکے ہیں۔آپ کے ناول، افسانوں اور تنقیدی و تحقیقی کاموں کا اعتراف کرتے ہوئے ٹاٹا اسٹیل کمیٹی، جمشید پور نے نیشنل ایوارڈ 2023 کے لیے منتخب کیا اور انہیں اس ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ 14 مارچ 2023

رضیہ پروین

رامپور: گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور کی صدر شعبہ اردو رضیہ پروین کو سردار ولبھ بھائی پٹیل میموریل فاؤنڈیشن کی جانب سے ان کی سماج، تعلیم اور ادب کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں پیس انوائے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

مالا روڈ واقع سینٹ جارٹ پبلک اسکول کے وسیع و عریض ہال میں AURA کے تعاون سے منعقدہ ایک خصوصی تقریب کے دوران رضیہ پروین کو سردار ولبھ بھائی پٹیل میموریل فاؤنڈیشن کی جانب سے سال 2023 کے لیے پیس انوائے ایوارڈ دیا گیا۔ رامپور کے ادبی حلقوں نے سردار ولبھ بھائی پٹیل میموریل فاؤنڈیشن کے ذریعے رضیہ پروین کی خدمات کے اعتراف کا خیر مقدم کیا ہے۔ واضح رہے کہ رضیہ پروین ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ وہ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں، ساتھ ہی این ایس ایس کی انچارج کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مسلسل مصروف ہیں۔ان کے مضامین و مقالات ملک کے بیشتر رسائل و اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ بنیادی طور پر مئوناتھ بھنجن سے تعلق رکھنے والی رضیہ پروین نے ملازمت کے سبب رامپور کو اپنا مسکن بنایا اور یہاں کے ادبی ماحول میں رچ بس گئیں۔ انھوں نے اپنے حسن اخلاق، مزاج کی شائستگی اور شیریں انداز گفتگو کی وجہ سے رامپور کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ رضیہ پروین نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس بے حد اہم اعزاز کو حاصل کر کے میں فخر محسوس کر رہی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کو عزم و استقلال اور استقامت کے ساتھ اپنے حقوق اور مقام پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے، تبھی کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہیں۔ روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 23 مارچ 2023

رسم اجرا

اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت

بھیونڈی: بھیونڈی کے فعال و متحرک علمی و ادبی ادارہ 'اردو قبیلہ فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام اردو کے معروف صحافی اختر کاظمی کی 45 سالہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں

عابد عثمان مومن کی مرتب کردہ کتاب 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' کی تقریب اجرا اور جلسۂ تہنیت کا انعقاد ہوا۔ بھیونڈی کے غلام محمد مومن ویمنس کالج آڈیٹوریم میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت محترم مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری نے کی اور اختر کاظمی کی صحافتی کارکردگی سے سامعین کو روشناس کیا۔ اس تقریبِ اجرا اور جلسۂ تہنیت کا آغاز معروف گلوکار سہیل اختر انصاری نے اپنی پرکیف آواز میں حمدِ باریٔ تعالیٰ پیش کر کے کیا۔ ناظمِ تنظیم جمیعۃ علماء مہاراشٹر محترم مفتی سید محمد حذیفہ قاسمی نے انتہائی پُر مغز افتتاحی تقریر فرمائی۔

دہلی یونیورسٹی سے تشریف لائے پروفیسر محمد کاظم نے اختر کاظمی کی پوری صحافتی زندگی کو حادثاتی واقعات قرار دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ شہر بھیونڈی میں رہتے ہوئے انھوں نے یہاں کی علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، تعلیمی، فلاحی و صنعتی مسائل و معاملات پر بطور خاص توجہ دی اور کبھی بھی اپنی ذمے داریوں سے دامن نہیں بچایا۔

دہلی سے تشریف لائے ایک اور مہمان اردو کے معروف ادیب، صحافی، شاعر، ناقد و مبصر جناب حقانی القاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اختر کاظمی مزاحمتی صحافت کی ایک معتبر آواز ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اختر کاظمی میدانِ صحافت کے قلندر ہیں اور قلندرانہ شان، جذبۂ جنون اور بے نیازی کے ساتھ صحافتی زندگی اور مزاحمتی صحافت سے اپنا رشتہ قائم رکھا کہ دراصل حقیقی صحافت مزاحمت سے ہی عبارت ہے۔ جب تک جبر و استحصال کی قوتوں کے خلاف مزاحمت نہ ہو تو وہ صحافت اعتبار اور استناد کا درجہ حاصل نہیں کرسکتی۔ان کی صحافت میں مزاحمتی اور مقاومتی ردِ عمل موجود ہے۔اسی لیے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر صحافت کرتے رہے اور عوامی مسائل و موضوعات کو بے خطر ہو کر اٹھاتے رہے۔انھوں نے قلم کی حرمت کا ہمیشہ پاس رکھا۔ ایک باضمیر مسئول اور ذمہ دار صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔

ڈرامہ تھیٹر ٹی وی اور فلموں کے معروف آرٹسٹ جناب محمد سلیم عارف نے صحافت کے تعلق سے اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اختر کاظمی کی صحافتی زندگی سے متعلق بھرپور گفتگو کی اور ان کے حوالے سے بتایا کہ صحافت اور بطور خاص اردو صحافت سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کو اختر کاظمی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔

انگریزی روزنامہ ٹائمز آف انڈیا، ممبئی کے سینئر جرنلسٹ محمد وجیہ الدین نے اپنی تقریر کے دوران اردو اخبارات کی زبوں حالی، مالکان کی مفاد پرستی، اردو کے صحافیوں کی زبوں حالی اور مالی تنگ دستی پر اپنے گہرے رنج اور فکر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کے اس عہد میں جہاں قدم قدم پر پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، اردو کے صحافیوں کو اگر اٹھارہ اٹھارہ ماہ تک تنخواہ نہ ملے تو اس کی اور اس صحافی کے اہلِ خانہ کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔

ممبئی سے شائع ہونے والے ہندی روزنامہ 'دبنگ دنیا' کے سینئر جرنلسٹ ٹھاکر کرشن گوپال سنگھ نے اختر کاظمی سے اپنے دیرینہ تعلقات اور ان کی طویل صحافتی زندگی کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ حالات کیسے بھی رہے ہوں، اختر کاظمی کو کبھی حوصلہ کھوتے نہیں دیکھا۔ انھوں نے ہمیشہ مثبت صحافت کی اور قومی یکجہتی کے فروغ کو اپنے قلم کا پُرزور سہارا دیا۔

اس موقعے پر شمیم اقبال نے اپنا تحریر کردہ تہنیت نامہ اردو قبیلہ فاؤنڈیشن کے حوالے سے پڑھ کر پیش کیا۔ جناب عامر صدیقی نے بحسن وخوبی نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ جناب مخلص مدعو نے تمام مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: سہیل انصاری، بھیونڈی، 18 مارچ 2023

رہنمائے تعلیم جدید

نئی دھلی: معروف ہفت روزہ 'اخبار نو' کے دفتر میں ابو نعمان کی ادارت میں چھپنے والے قدیم ماہانہ مجلّہ 'رہنمائے تعلیم جدید' کے مارچ 2023 کے شمارے کی رسم اجرا منعقد ہوئی جس میں شاعر وصحافی جناب اشہر ہاشمی پر 20 صفحات کا ایک گوشہ بھی شامل ہے۔ گوشہ میں اشہر ہاشمی کی شاعری پر پانچ ملکی وغیر ملکی لکھنے والوں کے مضامین کے علاوہ شاعر کا تازہ غیر مطبوعہ کلام بھی شریک اشاعت کیا گیا ہے۔ ان مضامین 'عصری حسیت اور تہذیبی شناختوں کا شاعر (خیر زمان راشد، مظفر آباد)، اشہر ہاشمی کی کھری کھری (انٹرویو، ظفر انور، دہلی)، حرف کی تنظیموں کو رقص سکھاتا شاعر (عثمان منور، اٹلی)، اشہر ہاشمی کی غزلیہ شاعری: نشان میل میں شامل کی روشنی میں (ایس ایم آرزو، کلکتہ)، غزلوں کے حوالے سے (اصغر شمیم، کلکتہ) اور بدلتے موسم سے نشان میل تک (فیروز اختر، ہوڑہ) کے ذریعے اشہر ہاشمی کی شعری شخصیت ان کے فن اور تخلیقی رویہ کو سمجھا اور سمجھایا گیا ہے۔ اشہر ہاشمی کی دس تازہ اور غیر مطبوعہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ تقریب کی صدارت بزرگ صحافی مودود صدیقی نے کی۔ ایڈیٹر ابونعمان تقریب میں شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ اشہر ہاشمی سے ان کی پہچان پرانی ہے، وہ قومی آواز میں سب ایڈیٹر تھے اور میں بھی وہاں کام کرتا تھا۔ اشہر صاحب ہمارے پرانے رفیق ہیں۔ اس شمارے میں ان پر گوشہ شامل کر کے مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ دیگر شرکا میں شہر کی صحافتی برادری کے مزید تین اہم نام سہیل انجم، جاوید قمر اور ظفر انور صاحبان شریک تھے۔ سبھوں نے گوشے کا خیر مقدم کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 14 مارچ 2023

آٹھ پہر

نئی دھلی: شاعری کو روح کی غذا قرار دیتے ہوئے معروف نقاد اور صاحب طرز ادیب حقانی القاسمی نے کہا

کہ میڈیکل سائنس میں جسمانی بیماریوں کا علاج ہے تو شاعری جذباتی اور ذہنی بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ بات انہوں نے ڈاکٹر زرین حلیم کے شعری مجموعہ 'آٹھ پہر' کی رسم اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ شاعری اور میڈیسن کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ میڈیکل سائنس میں بہت ساری بیماریوں کا علاج ہے مگر تنہائی جیسی خوفناک بیماری کا اس کے پاس بھی کوئی علاج نہیں، جبکہ شاعری تنہائی کا بہت ہی موثر علاج کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر زرین حلیم نے 'کوی دھرم' نبھایا ہے، ان کی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کا رنگ نمایاں ہے۔

مشہور کہانی کار شوبھا سنگھ نے کہا کہ شاعری اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کا بڑا ذریعہ ہے۔ زرین حلیم نے بھی اپنی شاعری میں بہت سے موضوعات کو پروتے ہوئے عصر حاضر کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر زرین حلیم نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

سینئر صحافی بھاشا سنگھ نے ڈاکٹر زرین حلیم کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک عام خاتون کی زندگی میں 'آٹھ پہر' کی بڑی اہمیت ہے اور خواتین کے جو جذبات ہیں انھیں ڈاکٹر زرین نے اپنی شاعری کے ذریعہ آشکار کیا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر خالد مبشر نے شاعری کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح ڈاکٹر جسم کا علاج کرتا ہے اسی طرح شاعری روحانی علاج کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی ڈاکٹر شاعری کے میدان میں آجائے تو کیا خوبصورت شاعری وجود میں آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ عورت کو خانے میں تقسیم نہ کریں کیونکہ کائنات میں خالق کا سرچشمہ عورت کی ذات ہے۔

پروفیسر عابد حلیم نے 'آٹھ پہر' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر زرین حلیم نے سماجی اور معاشرتی استحصال کو اپنی نظموں کے ذریعہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ شروع سے ہی تخلیقی ذہن کی مالک رہی ہیں۔ ڈاکٹر زرین حلیم کے شعری مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر فیضان شاہد نے پرمغز مقالہ پیش کیا، انھوں نے زرین کی شاعری کے تمام رنگوں پر بہت عمدہ گفتگو کی۔ 'آٹھ پہر' کے اجرا کی تقریب میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر نعمان قیصر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

'آٹھ پہر' کی مصنفہ ڈاکٹر زرین حلیم نے تمام ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ 'آٹھ پہر' میں میرے داخلی جذبات واحساسات ہیں، میں نے اپنے اطراف میں جو کچھ بھی دیکھا ہے اسے شاعری کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ میرے دل پہ جو گزری ہے میں نے وہی رقم کیا ہے۔ اجرا کی اس تقریب میں مشہور شاعر اور ناظم مشاعرہ معین شاداب، معروف صحافی اور کالم نگار عابد انور، معروف ادیب عبد الباری قاسمی، شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر فوزان، نیوز ون کی اینکر اور بے باک صحافی نیہا حبیب خان اور عبارت پبلی کیشن کے سربراہ سلام خان کے علاوہ دیگر معززین بھی شامل رہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' 22 مارچ 2023

کلیات قیصر الجعفری

ممبئی: اردو سویرا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام کلیات قیصر الجعفری کی تقریب اجرا کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت کے فرائض نور محمد عنبر نے انجام دیے۔ آپ نے اپنے صدارتی

خطاب میں قیصر الجعفری کی شاعرانہ عظمت اور ان کے اہل خانہ کی اردو دوستی کو خراج پیش کرتے ہوئے اردو کے فروغ کے لیے اپنی جانب سے ہر ممکن تعاون کا نہ صرف یقین دلایا بلکہ عملی اقدام اٹھاتے ہوئے اس پروگرام کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تقریب کے خصوصی مہمان معروف شاعر و انشائیہ نگار محمد رفیع انصاری نے 'قیصر الجعفری کی شاعرانہ جادوگری' پر ایک دلچسپ مضمون پیش کیا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا۔ ممبرا میں سکونت پذیر معروف شاعر اعجاز ہندی نے کلیات قیصر کا اجرا کیا اور آپ نے قیصر صاحب کی شخصیت اور ان کے اوصاف حمیدہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ عرفان جعفری نے اس موقعے پر اپنے والد بزرگوار کی باتوں اور یادوں کو تازہ کیا۔ مشہور شاعر عبید اعظم اعظمی نے کلام قیصر کے انتخاب کے ساتھ عرفان جعفری کی پدر نوازی کی خوب ستائش کی۔ محفل میں کلام قیصر سے نغمگی بھی بکھیری گئی۔ حنیف شیخ اور ناصر یوسف نے اپنی مترنم آواز میں قیصر کی مشہور غزلیں پیش کیں۔ اردو سویرا اور ڈی زیڈسٹی نے مشترکہ طور پر یہ شاندار پروگرام پیش کیا۔ سویرا فاؤنڈیشن کے صدر انوار الحق خان، نائب صدر سید زاہد علی اور خلیل خان گڑکر نے پروگرام کی کامیابی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اردو سویرا فاؤنڈیشن کے فعال رکن نصیر خان نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ سید زاہد علی نے اپنی برجستہ نظامت سے محفل کی رونق بڑھائی۔ بھیونڈی سے اس تقریب میں رئیس ہائی اسکول کے سابق وائس پرنسپل عبدالعزیز انصاری کے علاوہ ظفر عالم جامعی بھی بطور خاص شریک ہوئے۔ پروگرام کا اختتام سید زاہد علی کے شکریہ پر ہوا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 17 مارچ 2023

آثار شیراز ہند

جونپور: شیراز ہند باذوق حکمرانوں کی ادب دوستی اور مذہبی احترام کے باوجود اپنی سابقہ شان و شوکت برقرار نہیں رکھ سکا، لیکن شیراز ہند کے بکھرے ہوئے سلسلوں کو عام فہم زبانوں میں مجموعہ کی شکل میں لاکر ایک اہم کارنامہ انجام دیا گیا ہے، یہ باتیں پوروانچل یونیورسٹی کی وائس چانسلر نرملا ایس موریہ نے محمد حسن پی جی کالج جونپور میں 'آثار شیراز ہند' کی رسم اجرا کے دوران کہیں۔ یہ کتاب حاجی ضیاء الدین نے مرتب کی ہے۔ تقریب سے آن لائن خطاب کرتے ہوئے روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر عبدالودود ساجد نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے نمائندہ 'انقلاب' نے جونپور کی کھوئی ہوئی تاریخ و اس کی شناخت کو زندہ کر دیا ہے جو نئی نسلوں کے لیے یقیناً کارآمد ثابت ہوگی۔ سپریم کورٹ کے سینئر وکیل زیڈ کے فیضان نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ حاجی ضیاء الدین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جونپور کے کھوئے ہوئے تاریخی قصبات و اثاثوں کو زندہ کر دیا ہے۔ شبلی کالج کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر علاء الدین خان نے شیراز ہند کی تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میں تاریخ کا طالب علم رہا ہوں اور جونپور کی تاریخ کو چند منٹوں میں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ یہاں کی در و دیوار تغلق، سلاطین شرقی اور مغل حکمرانوں کی گواہ ہیں۔ علماء کرام کی جہاں طویل فہرست ہے وہیں ادب نواز شخصیات کا دور کافی سنہرا رہا ہے جس کو چند منٹوں میں یا ساعتوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً مصنف نے تاریخی عمارتوں اور دیگر شخصیات کو قلمبند کر کے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ 'انقلاب' لکھنؤ کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جیلانی خان علیگ نے اپنے خطاب میں حاجی ضیاء الدین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ واقعی ہمارے نمائندے نے ایمانداری اور محنت سے جو مقام حاصل کیا ہے وہ بہت ہی کم لوگوں کو ملتا ہے۔ آخر میں محمد حسن پی جی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالقادر خان نے وائس چانسلر کے ذریعے آثار شیراز ہند جونپور کو ہندی میں منظر عام پر لائے جانے کا اعلان کیے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً یہ کتاب اسکالرس و طلبہ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی اور ہم بہت جلد کتاب کے ہندی ورژن کا جشن منائیں گے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اشفاق احمد اناؤٹی وی، عبداللہ فاروق، ڈاکٹر فخر الدین قاسمی، ڈاکٹر عبدالوحید قاسمی، عرفان جونپوری، ابرار احمد ندوی وغیرہ نے بھی پروگرام سے خطاب کیا ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' کے نیوز ایڈیٹر شاہ عالم اصلاحی نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت عارف صدیقی ایڈووکیٹ نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2023

گولڈن انگلش

نئی دہلی: سبجیکٹ ایسوسی ایشن، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام گولڈن انگلش نامی کتاب کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ یہ کتاب مدارس کے طلبہ و طالبات اور ابتدائی انگلش سیکھنے والوں کو ذہن میں رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ عمدہ مواد کے ساتھ یہ کتاب طلبہ کے لیے ایک نایاب تحفہ ہے۔ تقریب اجرا کی صدارت شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر عبدالماجد قاضی نے انجام دی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں گوگل کے بجائے کتابوں سے علم حاصل کرنا چاہیے۔ نئی نسل کے طلبہ کو مشینی ترجمے سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔

پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر مولانا محمد رحمانی مدنی شریک ہوئے۔ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تعلیمی میدان میں محنت کرنا اشد ضروری ہے۔ جد و جہد ہمیشہ کامیابی کی جانب لے جاتی ہے۔ کتاب کے مؤلف حبیب ریاض سنابلی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ عربی میں ایم اے سال اول کے طالب علم ہیں۔ شعبۂ عربی کے صدر عبدالماجد قاضی اور مہمان خصوصی نے صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی۔ پروگرام میں شعبۂ عربی کے اساتذہ پروفیسر فوزان احمد، ڈاکٹر حیفا شاکری، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، ڈاکٹر عظمت اللہ، جامعہ اسلامیہ کے استاد عبدالبر سنابلی مدنی، سمیع اللہ خان اور شعبے سے وابستہ طلبہ، ریسرچ اسکالر اور دیگر مہمانان نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 مارچ 2023

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے سیاسی خطوط

لکھنؤ: ڈاکٹر مہدی حسن خان ندوی کی کتاب 'حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے سیاسی خطوط' کا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور ندوۃ العلما کے ناظم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی اور ندوۃ العلما کے مہتمم اور البعث الاسلامی کے چیف ایڈیٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے ہاتھوں اجرا ہوا۔ حضرت نے اس موقعے پر کہا کہ جناب ڈاکٹر مہدی حسن خان صاحب ندوی نے یہ اچھا کام کیا، مولانا کے وہ خطوط جمع کر دیے جو انھوں نے سربراہوں کو عام طور پر لکھا۔ یہ خطوط جو مولانا نے جمع کیے ہیں وہ قابل استفادہ ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ذمے دار سے بات کرنے کے لیے آدمی کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے کہا کہ یہ ضرورت تھی کہ حضرت مولانا نے سربراہان قوم اور حکمرانوں کو جس نظر سے دیکھا اور جس سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا اس کو منظر عام پر لایا جائے اور حتی الوسع اس انداز فکر اور منہج دعوت سے فائدہ اٹھایا جائے، مقام مسرت ہے کہ ہمارے عزیز مولوی ڈاکٹر مہدی حسن خان ندوی استاد معہد الفردوس الرحمانی دوبگا لکھنؤ نے حضرت مولانا کے سیاسی خطوط کو جمع کیا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 26 مارچ 2023

اے ایم یو میں کتابوں اور جرائد کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے ایڈمنسٹریٹیو بلاک کے سلیکشن کمیٹی روم میں تقریباً ایک درجن کتابوں اور جرائد کا اجرا کیا۔

جن کتابوں کا اجرا کیا گیا ان میں شامل ہیں علی گڑھ جرنل آف لنگوسٹکس (شعبۂ لسانیات)، دکما اور بھامتی (ترجمہ از پروفیسر محمد جہانگیر وارثی)، امور طبیعیہ پریکٹیکل بی یو ایم ایس (پروفیسر اشہر قدیر، شعبہ کلیات)، ہندی غزل کا سوندریہ شاستر (ڈاکٹر صائمہ بانو، شعبہ ہندی)، ٹرانسفارمیشن ان دی کارپیٹ انڈسٹری آف بھدوہی: فینومینا آف سوشل ایکسکلوزن (ڈاکٹر اصفیہ کریمی، سچی کیمی/ برج کورس)، تفسیر الصید لہ (یونانی فارمیسی: ڈاکٹر محمد بلال تفسیر، علم الادویہ)، ورثہ، سہ ماہی اردو بین الاقوامی جریدہ (رئیس وارثی کا ایڈٹ کردہ اور پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، شعبہ اردو کا پیش کردہ) اور آفتاب ہال میمنٹو (پرووسٹ مسٹر سلمان خلیل اور آفتاب ہال کے وارڈنز کی طرف سے پیش کردہ)۔ اس موقعے پر پروفیسر منصور نے کہا کہ نئی شائع شدہ کتابیں اور رسائل ہمارے اساتذہ اور طلبا کی علمی صلاحیتوں اور یونیورسٹی کی فکری قدر میں اضافہ کریں گی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 مارچ 2023

امرتا پریتم

وارانسی: شعبہ اردو ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام ممتاز پنجابی ادیبہ و شاعرہ امرتا پریتم پر اردو مونوگراف کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ یہ رسم اجرا صدر شعبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پروفیسر محمد علی جوہر اور صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کے ہاتھوں ہوا۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی سے شائع اس اردو کتاب کے مترجم شعبہ اردو بی ایچ یو کے استاد ڈاکٹر محمد قاسم انصاری ہیں۔ اس موقعے پر ماہرین ادب نے نہ صرف مترجم کو مبارکباد پیش کی بلکہ ترجمہ کی اہمیت و افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ صدر شعبہ اردو بی ایچ یو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ اردو زبان و ادب کو ثرت مند بنانے اور اسے فروغ دینے میں تراجم کا اہم ترین کردار ہے۔ امرتا پریتم ہندوستانی ادب کا ایک اہم ترین نام ہے۔ ان کے تخلیق کردہ ادب کا رشتہ اردو سے بہت گہرا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اس رشتے کو مستحکم کرتی ہے بلکہ نئی نسل کو اردو اور پنجابی کے رشتوں کی مزید تلاش کی دعوت دیتی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ملٹی لنگول ہونا وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس پر خاطر خواہ توجہ دینا ہوگا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ ہندی، پنجابی و دیگر ملکی زبانوں میں بہترین ادب تخلیق ہوا ہے اور اردو کا رشتہ ملک کی مختلف زبانوں سے بہت گہرا رہا ہے۔ اس سرمایہ کی تلاش ترجمہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ امرتا پریتم کی تخلیقات صرف پنجابی ادب کا ہی گرانقدر سرمایہ نہیں بلکہ ان کی تخلیقات میں اردو کی گہری آمیزش ہے۔ یہ مونوگراف اس خصوصیت کا بہترین عکاس ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے اس ترجمہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کے فروغ میں ساہتیہ اکادمی کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔ اس سے قبل وہ ممتاز ہندی ادیب موہن راکیش پر ایک ہندی مونوگراف کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں جس کی اشاعت ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ہی کی ہے۔ علاوہ ازیں کئی اردو ترجمے ان سے منسوب ہیں۔ اس موقعے پر ایم ایم وی کالج بی ایچ یو کی سابق پروفیسر رفعت جمال، شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر مشرف علی، ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر احسان حسن اور ایم ایم وی کالج کے استاد ڈاکٹر افضل مصباحی کے علاوہ ریسرچ اسکالرز، طلبا و طالبات موجود رہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، گورکھپور، 17 مارچ 2023

ارج ادب

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگل پور کے زیر اہتمام محمد شاداب عالم کی رہائش گاہ پر 15 مارچ کو شاعر جوثر ایاغ کی صدارت میں ڈاکٹر محمد پرویز کی کتاب 'ارج ادب' کا اجراء ڈاکٹر محمد پرویز، محمد شاداب عالم، شہزور اختر، جوثر ایاغ، ڈاکٹر ارشد رضا، ڈاکٹر سید نیر حسن، مظہر مجاہدی، محمد تاج الدین، محمد بلال الدین وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر شاعر جوثر ایاغ نے کہا کہ ڈاکٹر محمد پرویز بیک وقت افسانہ، افسانچہ، تحقیق، تنقید، تبصرہ وغیرہ پر طبع آزمائی کر رہے ہیں اور بہت کامیاب نظر آ رہے ہیں۔ ارج ادب ڈاکٹر محمد پرویز کی دسویں کتاب ہے اور یہ ان کے پہلے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں 18 مضامین شامل ہیں جو تحقیق و تنقید

ڈاکٹر محمد پرویز کی کتاب 'ارج ادب' کا اجرا

پر مشتمل ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین بڑی محنت، ریاضت اور تحقیقی ذمہ داریوں کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ شہزور اختر نے کہا کہ ڈاکٹر محمد پرویز ایک نوجوان محقق ہیں انھوں اردو ادب کو کچھ کتابیں بہت ہی نایاب دی ہیں جو اردو ادب میں دیکھنے کو نہیں ملتی، جس میں ان کی شہرت یافتہ کتاب 'اردو کے 25 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ' اور 'اردو کے 23 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ' شامل ہیں جس کی خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر ارشد رضا نے کہا کہ ڈاکٹر محمد پرویز ایک متحرک سرگرم اور باصلاحیت ادیب ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو قابل توجہ بھی ہے۔ محمد شاداب عالم نے کہا کہ ڈاکٹر محمد پرویز کی کتاب ارج ادب معلوماتی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مظہر مجاہدی نے کہا کہ ڈاکٹر محمد پرویز انجمن باغ و بہار کے جنرل سکریٹری ہیں، ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نیر حسن، محمد بلال الدین، محمد تاج الدین، محمد سہیم الدین، محمد نایاب عالم نے ڈاکٹر محمد پرویز اور ان کی نئی کتاب ارج ادب کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: محمد پرویز، بھاگلپور، 17 مارچ 2023

وفیات

اختر یونس قدوائی

لکھنؤ: اردو کے سب سے بزرگ صحافی اختر یونس قدوائی لکھنؤ میں 23 مارچ کو انتقال کر گئے۔ وہ ستمبر 1927 میں بارہ بنکی

میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ کے امیر الدولہ اسلامیہ انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ 1947 میں لکھنو یونیورسٹی سے گریجویشن اور 1950 میں ایم اے کیا۔ وہ قاضی رفیع الدین سندیلوی کی کوششوں سے صحافت میں آئے۔ انھوں نے فرنگی محل سے شائع ہونے والے روزنامہ 'ہمدم' میں ملازمت کی۔ کچھ عرصہ 'تنویر' میں بھی کام کیا۔ بعد کو

1951 میں روزنامہ سیاست کانپور سے وابستہ ہوگئے۔ انھیں اپریل 1970 میں روزنامہ 'قومی آواز' لکھنو میں کام کرنے کا موقع ملا جو ریٹائرمنٹ تک کم وبیش بیس سال تک جاری رہا۔ وہ 'قومی آواز' میں نیوز ایڈیٹر تھے۔

اختر یونس قدوائی گزشتہ پچیس برس سے روزنامہ 'صحافت' لکھنو سے وابستہ تھے۔ آخری دم تک اخبار نویسی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی۔ ان کی تدفین صبح دس بجے مسولی بارہ بنکی میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 24 مارچ 2023

منظر اعجاز

پٹنہ: مشہور ومعروف ناقد، شاعر اور ادیب پروفیسر ڈاکٹر منظر اعجاز کا طویل علالت کے بعد 19 مارچ بروز اتوار کی صبح پٹنہ کے جگدیش میمورل اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 71 سال تھی۔ وہ طویل عرصے تک اے این کالج پٹنہ میں صدر شعبہ اردو رہے اور بعد میں پاٹلی پترا یونیورسٹی میں بھی انھوں نے اپنی خدمات انجام دی۔ پروفیسر ڈاکٹر منظر اعجاز کے انتقال سے بہار کا ادبی حلقہ سوگوار ہوگیا ہے۔ ان کی نماز جنازہ کنکڑ باغ مسجد کے نزدیک 19 مارچ کو ہی بعد نماز عصر ادا کی گئی اور بعد نماز مغرب شاہ گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ واضح ہو کہ پروفیسر منظر اعجاز کافی دنوں سے بیمار تھے لیکن ادب کا شوق اور مطالعے کا ذوق اس قدر گہرا تھا کہ علالت کے باوجود ہمیشہ ادبی پروگراموں میں شرکت کرتے رہے اور کبھی اس سے پرہیز نہیں کیا۔ کچھ دن قبل بھی وہ شریک محفل ہوئے تھے۔ ان کا آبائی وطن ویشالی ضلع کے بھگوان پور بلاک کے اسوئی گاؤں میں تھا جب کہ ان کی تعلیم وتربیت مظفر پور میں ہوئی اور درس وتدریس کی خدمات راجدھانی پٹنہ میں انجام دیتے رہے۔ وہ اقبالیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور اقبال کے سلسلے میں ان کی کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی تھیں جو قارئین میں بہت مقبول ہوئی تھیں۔

روزنامہ 'پندار'، 20 مارچ 2023

نثار احمد زکی

نئی دھلی: سینئر اردو صحافی اور مترجم نثار احمد زکی کا 24 مارچ کو ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 75 برس تھی، وہ عرصے سے شوگر کے موذی مرض کا شکار تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ نثار احمد زکی کا وطنی تعلق بہار شریف سے تھا، لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ رانچی یونیورسٹی سے سائنس میں گریجویشن کیا۔ بچپن سے ہی اخبارات و رسائل میں کام کرنے اور مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ یہی شوق انھیں دہلی لے آیا۔ 1980 میں جب روزنامہ 'قومی آواز' کا دہلی ایڈیشن شروع ہوا تو وہ اس کے ادارتی عملہ میں شامل ہوگئے اور بہت دل جمعی کے ساتھ کام کیا۔ انھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ وہ کچھ عرصے روزنامہ 'قومی آواز' پٹنہ ایڈیشن کے انچارج بھی رہے۔ انھوں نے سابق مرکزی وزیر سی کے جعفر شریف، مولانا اسعد مدنی اور مولانا سید احمد ہاشمی کے معاون کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ انھیں سی کے جعفر شریف کا خاص اعتماد حاصل تھا۔ آخری وقت تک ان کے معاون رہے اور ان کی سوانح عمری بھی ترتیب دے کر شائع کی۔ انھوں نے روزنامہ 'قومی آواز' کے علاوہ روزنامہ مشرقی آواز اور بعض دیگر اخبارات میں بھی کام کیا۔ ان کی تدفین گزشتہ 24 مارچ کو مشرقی دہلی کے نور الٰہی قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 28 مارچ 2023

وید پرتاپ ویدک

نئی دھلی: معروف صحافی اور مصنف وید پرتاپ ویدک کا 14 مارچ بروز منگل کو دارالحکومت سے متصل گروگرام میں واقع ان کی رہائش گاہ پر دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 78 برس تھی۔ مسٹر ویدک پوری طرح صحت مند تھے۔ ان کے پرسنل اسسٹنٹ کے مطابق وہ صبح نو بجے کے قریب ممکنہ طور پر دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے باتھ روم میں گرے۔ بعد میں انھیں باتھ روم کا دروازہ توڑ کر باہر نکالا گیا اور اس کے فوراً بعد انھیں گھر کے قریب واقع ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔ وید پرتاپ ویدک 30 دسمبر 1944 کو اندور، مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی سے بین الاقوامی سیاست میں پی ایچ ڈی کی۔ انھوں نے تقریباً چار سال دہلی میں پولیٹکل سائنس بھی پڑھائی۔ وہ فلسفہ اور سیاسیات میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ راجندر ماتھر، پربھاش جوشی کی نسل کی آخری شخصیت تھے۔ ویدک نے افغانستان پر تحقیق کی اور 50 سے زیادہ ممالک کا سفر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مارچ 2023

فدا راجوروی

تھنہ منڈی: خطہ پیر پنجال کی معروف شخصیت، پہاڑی، کشمیری، گوجری اور اردو کی کئی کتابوں کے مصنف، کہنہ مشق شاعر اور ادیب الحاج عبدالرشید فدا المعروف فدا راجوروی بروز بدھ صبح چار بجے 80 سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ ماہر لسانیات اور علاقائی زبان پر مکمل دسترس رکھنے والے فدا راجوروی کو دن کے 2 بجے سپرد خاک کیا گیا اور نماز جنازہ بہروٹ (تھنہ منڈی) کے مقام پر ادا ہوئی۔ مرحوم محکمہ تعلیم سے بطور پرنسپل سبکدوش ہوئے تھے اور انھیں ان کے آبائی سرنکوٹ کے پوشانہ گاؤں سے بطور سرپنچ نامزد کیا گیا۔ اس دوران انھوں نے غریب غربا کی بہترین طور پر خدمت کی۔ ان کی پیدائش مغل شاہراہ پر واقع گاؤں پوشانہ میں ہوئی جو کافی زرخیز مانا جاتا ہے۔ مرحوم نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں مغل روڈ قابل ذکر ہے جس میں مغلیہ سلطنت سے دریافت ہوئے راستے کو بیان کیا گیا ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں چنگس قلعہ، مغلوں کے ہمراہ ہاتھیوں کے قافلے، علی آباد سرائے، نوری چھم، جہانگیر کی دوران شکار موت کی وجوہات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کشمیری، پہاڑی اور اردو زبان میں درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ عمر خیام کی

رباعیات کا پہاڑی میں ترجمہ کرنے والے بھی فدا راجوروی ہی ہیں۔ انھوں نے حج اور پاکستان سے واپسی پر دو کتابیں 'مسافر حرمین' اور 'روداد' لکھی ہیں۔ پونچھ اور راجوری کے علمی حلقے میں ان کا ایک بڑا نام تھا اور انھوں نے زندگی کے ہر ایک پہلو پر شاعری کی ہے۔ ان کی وفات خطے پیر پنچال کی سیاسی، سماجی و ادبی تنظیموں کی طرف سے دکھ کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ طارق شال، جموں وکشمیر

آزاد ضمیر انصاری

لکھنؤ: لکھنؤ کے کہنہ مشق شاعر اور دبستان خسرو وکبیر کے بانی صدر آزاد ضمیر انصاری کے اچانک انتقال کی خبر نے لکھنؤ کی ادبی فضا کو مغموم کر دیا۔ آزاد ضمیر کے صاحب زادے عبدالرحمٰن سے ملی اطلاع کے مطابق 25 مارچ بروز سنیچر کو وہ اسکول گئے اور رات میں نماز تراویح پڑھنے کے بعد بستر پر سونے کے لیے چلے گئے اس وقت تک وہ پوری طرح سے ٹھیک تھے، اچانک گیارہ بجے رات میں طبیعت بگڑی آناً فاناً میں بستی کے سول ہاسپٹل لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے لکھنؤ کے لیے ریفر کر دیا راستے میں ہی انتقال ہو گیا۔ معلوم ہو کہ آزاد ضمیر صاحب بستی کے بازنگر کے پرائمری اسکول میں استاد تھے۔ ان کی تدفین 3 بجے دن میں قبرستان چاند والی مسجد، تال کٹورہ میں عمل میں آئی جس میں بڑی تعداد میں عزیز و اقربا کے علاوہ بڑی تعداد میں علمی و ادبی شخصیات شریک تھیں۔ اس ضمن میں ایک تعزیتی میٹنگ ادبی نشیمن گروپ کے دفتر واقع الماس باغ میں ہنگامی طور پر منعقد ہوئی جس میں آزاد ضمیر انصاری کو تعزیت پیش کرتے ہوئے ان کی مغفرت اور پسماندگان کے صبر جمیل کے لیے دعا کی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سلیم احمد نے کہا کہ ان کے قطعات کا مجموعہ آخری مرحلہ میں ہے جسے عید کے بعد حتمی شکل دینے کی بات آزاد صاحب سے ہوئی تھی مگر افسوس کہ کتاب کی اشاعت سے قبل ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ادبی نشیمن گروپ خراج عقیدت کے طور پر بہت جلد مجموعہ کی اشاعت کروا کے ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 مارچ 2003

علی حسن ساگر

دیوبند: 'تاریخ دیوبند' لکھنے والے مشہور ادیب علی حسن ساگر علالت کے باعث 4 اپریل بروز صبح تین بجے 71 برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے انتقال کی خبر عام ہونے پر بڑی تعداد میں شعرا، ادبا، وکلا، تعلیمی اداروں کے اساتذہ سمیت سیاسی و سماجی شخصیات نے ان کی رہائش گاہ محلہ موری تیلیان میں پہنچ کر اظہار تعزیت کیا۔ 22 مئی 1954 کو شہر کے محلہ موری تیلیان میں پیدا ہونے والے علی حسن ساگر نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی وہ 1972 سے تحریری میدان میں بحسن و خوبی اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے تمام قومی اور مقامی اردو ہندی اخبارات میں لکھا۔ روزنامہ پرتاپ، ملاپ، ویر ارجن، ترون ملاپ، روبی، تحریک انصاف، گورو ٹائمز، کرنٹ میل، شاہ ٹائمز، دینک جاگرن اور خلافت بلیٹن سمیت ملک کے مختلف ہندی اردو اخبارات اور رسائل میں فلم، تاریخ اور سیاست پر ان کے ہزاروں مضامین شائع ہوئے۔ کافی عرصے تک وہ 'مانو جگت' اخبار کے چیف بیورو بھی رہے۔ پبلشر اور ایڈیٹر کے طور پر 'دیوبند راجنیتی' اور 'عوام کی ضرورت' نام سے کافی عرصہ تک اخبار شائع کرتے رہے۔ انھوں نے تاریخ دیوبند کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بہت شہرت حاصل کی، ان کی زندگی میں ان کے بھائی ارشاد علی ساگر عرف ساگر دیوبندی کا بڑا کردار تھا۔ گزشتہ کئی سالوں میں علی حسن ساگر نے غزلیں، نظمیں، گیت بھی لکھے جس سے انھیں مزید شہرت ملی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اپریل 2023

خراج عقیدت

ساحر لدھیانوی

پانی پت / چنڈی گڑھ: شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں یوم نوروز منایا گیا اور ساحر لدھیانوی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروگرام کے آغاز میں شعبۂ اردو سے ڈاکٹر زریں فاطمہ اور ان کے ہم نواؤں نے ساحر کا منظوم کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اشوک کمار نے کہا کہ یہ اردو کی تہذیب اور خوبصورتی ہے جو ہر کلچر اور ہر تہذیب وتمدن کا جشن مناتی ہے، ہر زبان کے بولنے والو ں کو اردو سے سیکھنا چاہیے کہ سب کو کیسے ساتھ لے کر چلا جا سکتا ہے۔ پروفیسر اشوک نے طلبہ کو مزید محنت کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے پاس بہترین کیمپس و بہترین لائبریری کی سہولتیں موجود ہیں، ان کی قدر کریں اور عمر کے ہر پڑاؤ پر کچھ نہ کچھ سیکھتے رہیں، آپ اپنے اندر کچھ حاصل کرنے کا اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونے کا جذبہ پیدا کریں، سب سے بہتر طریقہ سیکھنے کا یہ ہے کہ آپ خود کے اندر جھانکیں اور جو کمیاں ہیں ان کو دور کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے رہیں۔ شعبۂ فارسی سے ڈاکٹر ذوالفقار نے نوروز کی اہمیت و معنویت پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ عید آج ہر اس جگہ منائی جاتی ہے جہاں فارسی زبان کے بولنے والے پائے جاتے ہیں یعنی اس عید کا دائرہ قوم سے نکل کر زبان اور فطرت تک پہنچ چکا ہے۔ اس عید میں سب سے اہم حصہ سفری ہفت سین ہے جس میں سین سے 7 کھانے والی چیزیں دسترخوان پر رکھی جاتی ہیں، طبی اعتبار سے سب کی ایک خاص وجہ ہوتی ہے، جو انسانی زندگی کے لیے ہر صورت میں مفید ہے۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر علی عباس نے کلمات تشکر ادا کیے۔ نظامت راشد امین ندوی نے کی۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں شمیم چودھری، امن دیپ کور، ہرویر کور، جسپریت کور و دیگر طلبہ و طالبات نے اہم کردار ادا کیا جب کہ سندیپ سنگھ، اروندر کور، اوشا، ہرمندر کور، رام کمار، جے پی سنگھ و ہرویر کور وغیرہ نے ساحر کے گیت و نظموں کے ذریعے محفل کے حسن کو دوبالا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مارچ 2023

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ممتاز محل

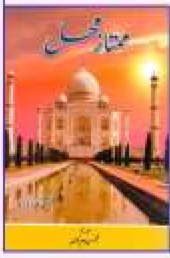

مترجم: فہیم احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 442

قیمت: 210 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

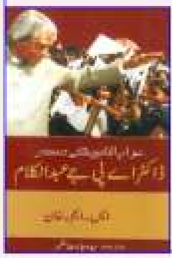

مصنف: ایس ایم خان، مترجم: سید وجاہت مظہر

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 95 روپے

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

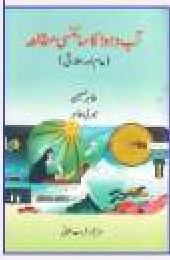

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

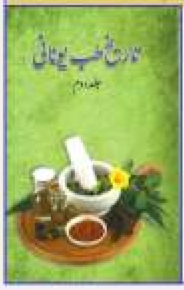

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

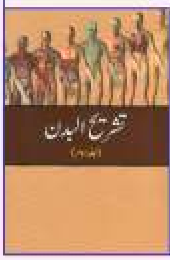

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

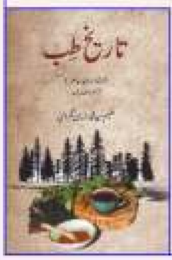

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

دنیا کی بہترین کہانیاں

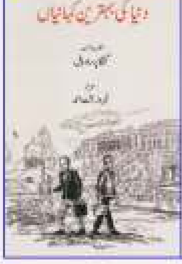

انتخاب وترتیب: گنگا پرساد ول

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

انسانی حقوق

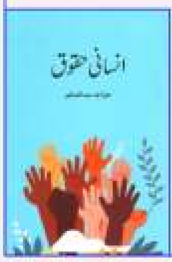

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मई-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०५

URDU DUNIYA Monthly, May-2023, Vol.25, Issue:05

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2023-25

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:24/04/2023

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6